Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ھمارا ادب

Digitized by eGangotri and Kashmir Treasures

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ناشر: سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔ سرینگر

مطبع: فوٹو لیتھو ورکس دہلی

کتابت: غلام نبی کول

تعداد: ۵۰۰

قیمت:

سرورق

عمل: مسعود حسین

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ترتیب

پیشِ لفظ	محمد احمد اندرابی	
سر مارک ارل سٹائن	موتی لال ساقی	۵
بخشی غلام محمد	رشید تاثیر	۲۵
مولوی محمد انور شوپیانی	غلام محمد شاد	۵۹
پنڈت گوپی کرشن	موتی لال ساقی	۸۹
مولانا سید میرک شاہ اندرابی	سید وجیہہ احمد اندرابی	۱۰۹
محمد عبداللہ تبت بقال	سید قیصر قلندر	۱۱۸
حکیم حبیب اللہ	نشاط انصاری	۱۴۶
جسٹس جیا لال کلم	ایس۔این زاڈو وسمن	۱۶۰
حبیب کیفوی	برج پریمی	۱۸۱
عبدالسلام رفیقی	رشید تاثیر	۱۹۲
صاحبزادہ محمد عمر	ظہور الدین	۲۰۱
غلام احمد کشفی	نشاط انصاری	۲۲۴
پنڈت گنگا ناتھ شرما	بلدیو پرشاد شرما	۲۳۴
سوم ناتھ بٹ	پی۔این۔ کاچرو	۲۴۴
مولوی حشمت اللہ خان	بلدیو پرشاد شرما	۲۵۱
غلطیہائے مضامین	سعید احمد ڈار	۲۶۱

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پیشِ لفظ

لیجیے شخصیات نمبر کی چوتھی جلد پیش خدمت ہے ۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ اس جلد میں بھی ایسی شخصیات کو ہی شامل اشاعت کیا گیا ہے جنہوں نے اس ریاست، یہاں کے عوام، ادب، علوم و فنون اور ثقافت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا ہے۔ کچھ شخصیات ایسی بھی ہیں جن کا ہماری تحریکِ آزادی کے دوران ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی بہت اہم رول رہا ہے ۔

مضامین کے حصول کے سلسلے میں ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ بھرپور کوششوں کے باوجود ہمیں ریاست کی تینوں اکائیوں سے بہت کم شخصیات پر مضامین موصول ہوئے اور اپنے قلم کاروں سے خاطر خواہ تعاون نہیں ملا۔ چنانچہ چند دوستوں نے اگرچہ مضامین لکھنے کی حامی بھی بھری تھی اور کچھ نے تو قبولیت نامے تک ارسال کئے تھے لیکن مسلسل تقاضوں کے باوجود انہوں نے، جبکہ یہ جلد کتابت کے آخری مراحل سے گذر رہی تھی، چپ سادھ لی۔ مجبوراً ہمیں کچھ حضرات سے ایک سے زائد مضامین لکھوانے پڑے تاکہ یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آپ تک پہنچ سکے۔ یہی حال تصاویر کی فراہمی کے سلسلے میں بھی رہا۔ بہر حال ہم جناب بی پی شرما، ڈاکٹر برج پریمی، جناب رشید تاثیر، جناب موتی لال ساقی، وجیہہ احمد اندرابی اور شری سمن کے اس بات کے لئے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمیں چند ایک شخصیات کی تصاویر فراہم کیں۔

امید ہے کہ اس جلد کے بارے میں بھی ہمیں قارئین اپنی قیمتی آراء سے مستفید فرمائیں گے۔

محمد احمد اندرابی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

موتی لال ساقی

سر مارک ارل سٹائن

مارک ارل سٹین کا جنم ۲۶ نومبر ۱۸۶۲ء کو ہنگری کی راجدھانی بڈاپیسٹ میں ہوا تھا۔ ان کے والد نکولس ایک کاروباری آدمی تھے۔ اُن کے کاروبار کا دائرہ بڈاپیسٹ سے زمبار تک پھیلا ہوا تھا۔ سٹین کی ماں کا نام اناس سٹین تھا۔ اپنی ابتدائی تعلیم سٹین نے بڈاپیسٹ اور ڈریسڈن کے پبلک سکولوں میں حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے کرنے کے بعد اُس نے وی آنا، لیپ زگ اور ٹیوبنگن کی یونیورسٹیوں میں باری باری داخلہ لیا۔ ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان سٹین نے ان دانش گاہوں میں ہندوستان اور ایران کی کلاسیکل زبانوں اور نوادرات کا علم حاصل کیا۔ سٹین کو یہ سعادت اسی دوران نصیب ہوئی جب اُس نے مشرقیات کے مشہورِ عالم ڈاکٹر جارج بہلر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر بہلر کی رفاقت میں اُس نے اپنے علم کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ سٹین نے ۱۸۸۲ء کے دوران فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں انگلستان کا رخ کیا۔ وہاں اُس نے آکسفورڈ میں ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۶ء کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

درمیان ایران کے قدیم فلسفے اور ہندوستان کی قدیم تاریخ کے بارے میں اپنی تحقیقی کاوشوں کو شد و مد کے ساتھ جاری رکھا۔ ۱۸۸۵ء میں سٹین کا تقرر بیک وقت لاہور کے علوم مشرق کے کالج کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے ہوا۔ یہ دونوں ذمہ داریاں اس نے ۱۸۹۹ء تک بدرجۂ احسن انجام دیں۔ لاہور میں تقرری کے دوران اس نے ۱۱۴۸-۴۹ء کے درمیان لکھی گئی پنڈت کلہن کی راج ترنگنی کا مستند نسخہ حاصل کرنے کے لئے کشمیر کا دورہ کیا۔ آخرکار سٹین سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں نقل شدہ راج ترنگنی کا ایک مستند نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سٹین کو جو نسخہ حاصل ہوا اس کے حاشیوں پر کشمیر کی TOPOGRAPHY کے بارے میں تفصیلات کا اندراج موجود تھا۔ اس کے علاوہ چار مختلف اشخاص کے ہاتھوں متن کے بارے میں تصحیحات موجود ہیں سٹین صاحب راج ترنگنی کے پہلے معتبر ایڈیشن کی اشاعت سے مطمئن نہیں تھا۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اُس نے بعد میں راج ترنگنی کا مکمل انگریزی ترجمہ شائع کیا جس میں متنوں کا ایک تنقیدی مطالعہ بھی شامل ہے اور ساتھ ہی وادی کشمیر کی TOPOGRAPHY کے بارے میں تفصیلی حاشیے بھی شامل ہیں۔ اس ضمن میں سٹین نے معتبر نسخے کے کاتب رام کنٹھ کے حاشیوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ ذاتی مشاہدوں اور تحقیقی دوروں کو مشعل راہ بنادیا۔ راج ترنگنی کے ترجمے اور ترتیب کو وقار اور اعتبار عطا کرنے کے لئے اُس نے اپنے رفیقوں کے ہمراہ اُن تاریخی مقامات کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا جن کا ذکر متن میں موجود تھا۔ راج ترنگنی کے ترجمے اور تشریح کی بدولت سٹین نے تحقیق کا جو معیار قائم کیا اس تک رسائی حاصل کرنا اب ایک خواب سا لگتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کئی معاملات میں سٹین کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تحقیقی لگن، نظر کی کشادگی، مطالعے کی وسعت اور موضوع پر دسترس کے معاملات میں تاریخ کا کوئی بھی سچا طالب علم سٹین سے فیضان حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تاریخ پرواز تخیل کی دنیا نہیں بلکہ حقائق کی آماجگاہ ہے۔ اس آماجگاہ سے جس طرح سرخرو ہو کر سٹین باہر آگیا وہ بہت کم لوگوں کا حصّہ ہے۔ راج ترنگنی کی تالیف کے دوران ہی اُس نے رگھوناتھ پاٹھشالہ جموں میں محفوظ پانچ ہزار سنسکرت مخطوطات کی ایک توضیحی فہرست مرتب کی جو ایک تاریخ ساز کارنامہ گردانا جا سکتا ہے۔ لاہور میں اپنے تقرر کے دوران سٹین نے پیدل فوج کے ساتھ بُنر (BUNAR) میں بکھرے ہوئے آثار قدیمہ کی کھوج کے سلسلے میں قدیم اُدیان میں شامل اس علاقے کا دورہ کیا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں سٹین کا تقرر انڈین ایجوکیشنل سروس میں ہوا اور اس کو کلکتہ مدرسے کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ سرکاری نوکری قبول کرنے کے کچھ دیر بعد وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں چینی ترکستان کے ایک سالہ دورے پر روانہ ہوا۔ چینی ترکستان وسطِ ایشیا کا مردم خیز اور تاریخی طور پر وہ اہم علاقہ ہے جس پر پہلے سے ہی ساری دنیا کی نظریں مرکوز تھیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کو یہ علاقہ دیر سے اپنی اور بُلا رہا تھا۔ کُچھ کے گرد نواح میں بھوج پتر پر لکھے گئے مخطوطات پانے والا شخص بوور تھا۔ ان مخطوطات نے دُنیا بھر میں بوور مخطوطات کے نام سے شہرت پائی۔ یہ مخطوطات کسی طرح ہندوستان پہنچ گئے اور ہندیات کے ماہرین میں ایک سنسنی پیدا کی کیونکہ بوور مخطوطات اس وقت ہندوستانی خط اور زبان میں لکھے گئے اپنی نوعیت کے اولین مخطوطات تھے۔ مخطوطات کی تحریر کا زمانہ چوتھی صدی عیسوی باور کیا جاتا ہے۔ بوور مخطوطات سے پہلے کھجور کے پتوں پر لکھا گیا ایک مخطوطہ بھی حاصل کیا گیا تھا جو چین کے راستے جاپان پہنچا اور اب جاپان کی ہوریوجی خانقاہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں رکھا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اُس فرانسیسی مشن نے بھی ایک بھوج پیتر پر لکھا ہوا ایک مخطوطہ ختن سے حاصل کیا تھا جس مشن کو تبت بھیجا گیا تھا۔ فرانسیسیوں کا مخطوطہ کھروشتی میں لکھا ہوا ہے مگر اس کی زبان ہندوستانی ہے۔ وسط ایشیا سے مخطوطات کی دریافت نے سٹین کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچ لیا اور وہ مشکلات کی پرواہ کئے بغیر مہم پر روانہ ہو گیا۔

وسط ایشیا کے پہلے تحقیقی دورے کو سٹین نے چینی ترکستان کے جنوبی حصے تک ہی محدود رکھا۔ اس دورے میں اُس نے اپنی زیادہ تر توجہ ختن کی طرف مبذول کی۔ اس دورے کی تفاعیل کو اس نے اپنی کتاب "قدیم ختن" میں شامل کیا۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۰۷ء میں چھپ کر بازار میں آ گئی۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اپنے اوّلین دورے کے دوران اس نے قدیم نوادرات اور ہندوستانی تبتی اور چینی میں لکھے گئے سینکڑوں دستاویزات حاصل کیں جن کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلمہ ہے۔ ان دستاویزات اور نوادرات کی بدولت قدیم ترکستان کے نئے اور نا معلوم گوشے ہماری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ چوتھی اور نویں صدی عیسوی کے درمیان اس علاقے کی تہذیب اور یہاں کے تمدن پر ہندوستانی رنگ چڑھا ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں آرکیالوجیکل کانفرنس کا انعقاد پیرس میں ہوا۔ اس کانفرنس میں سٹین کی مہم کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔ نتیجے کے طور پر جرمنی، فرانس اور روس کے علماء اس علاقے کی کھوج کرنے کے لئے کمر بستہ ہو کر چل پڑے۔ سنہ ۱۹۰۱-۲ء میں رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے لوب نور کے مشرقی حصے اور کوین لُن کی جغرافیائی کھوج کے لئے سٹین کو Back grant سے نوازا۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں اُسے پنجاب کے مدارس کا انسپکٹر مقرر کیا گیا اور بعد میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اُسے جیوگرافیکل سوسائٹی کی ایما پر کئے گئے دورے کے سائنسی تجربے کیلئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس دورے کی ذاتی روئیداد ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی۔ انگلستان سے لوٹنے پر ۱۹۰۴ء میں سٹین کو شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے مدارس اور آرکیالاجیکل سروے کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس عہدے پر فائز رہنے کے دوران اُس نے تاریخی اہمیت کی حامل بہت ساری جگہوں کو دریافت کیا۔ یہ جگہیں سرحد پار دُور دراز علاقوں میں واقع تھیں۔ جو جگہیں اس نے اس دوران دریافت کیں اُن میں مہابن کی نشاندہی کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔

حکومت ہند کے احکامات کے تحت سٹین ۱۹۰۶ء میں وسط ایشیا کی دوسری مہم پر روانہ ہوگیا۔ اس بار وہ مشرق میں ختن اور وہاں سے شمال میں تکلہ مکان ریگستان کے سرے تک جا پہنچا۔ اس دورے میں اُس نے خصوصیت کے ساتھ اُن قدیم راستوں کے محل وقوع کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا جو ہندوستان، مغربی ایشیا اور دور مشرق کے درمیان رابطے کے راستے تھے۔ اپنی دوسری مہم کے دوران سٹین نے تُن ہانگ میں ایک اہم دریافت کی۔ یہاں پر اُس نے دیوارِ چین کے مغربی حصے کی نشاندہی کی، جو دیوار ہُن حملوں سے بچاؤ کے لئے زمانہ قدیم میں تعمیر کی گئی ہے۔ مگر سب سے حیران کن دریافت اُن مصنوعی غاروں کی نشاندہی کرنا تھی جن میں چھوٹے بڑے پانچ سو کمرے ہیں۔ یہ گپھائیں اب بھی ہزار بودھوں کی گپھاؤں کے نام سے مشہور ہیں۔ گپھاؤں میں ایک ایسی گپھا بھی شامل تھی جس کا دہانہ دیوار تعمیر کرکے بند کر دیا گیا تھا۔ یہ گپھا سنہ ۱۹۰۰ء میں اتفاقاً کھل گئی اور اس کے اندر سے کثیر تعداد میں مخطوطات اور ریشم پر بنائے گئے مصوری کے سینکڑوں نمونے برآمد ہوئے۔ دشمنوں سے بچانے کے لئے ان نوادرات کو گیارھویں صدی کے دوران گپھا میں چھپا کے رکھ دیا گیا تھا مگر گپھا کے اچانک کھل جانے سے یہ سبھی چیزیں بکھر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے منظرِ عام پر آ گئیں۔ برآمد شدہ مخطوطات میں سے کچھ مخطوطات کا تجزیہ سٹین نے کیا اور کچھ مخطوطات چینیات کے ماہر پیلیٹ کی توجہ کا مرکز بن گئے جس نے سنہ ۱۹۰۶ء کے درمیان ترکستان کا دورہ کیا۔ برآمد شدہ مخطوطات میں سے حکومت چین کے احکامات کے مطابق ایک حصہ چین لے جایا گیا۔

وسط ایشیا کے دوسرے دورے کی رُوداد کا بیان سرانڈیا (ser India) کی صورت میں سنہ ۱۹۲۱ء کے دوران منظرِ عام پر آ گیا۔

اپنے دو دوروں کے دوران اگرچہ سٹین نے وسط ایشیا میں قابلِ تحسین کام کیا تھا پھر بھی اُسے تشنگی کا احساس ستا رہا تھا کیوں کہ وہ اُن مقامات کا تفصیلی جائزہ نہیں لے سکا تھا جہاں سے اُس نے نئی چیزیں دریافت کی تھیں۔

مزید کھوج اور مشرق اور شمال کی جانب تلاش کی حدود کو وسعت دینے کے مقصد کے پیشِ نظر وہ سنہ ۱۹۱۳ء کے موسمِ گرما میں تیسری بار وسط ایشیا کی جانب رختِ سفر باندھ کر چل پڑا۔ اس بار اُس نے کھوج کا آغاز جنوب سے کیا اور کان چو تک جا پہنچا۔ مہم کے دوران اس نے ختن کی ہمسائیگی میں نوادرات کے اعتبار سے اہم مقامات کا بھی دورہ کیا۔ ایسے مقامات کے ضمن میں نیا اور تن ہوانگ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد اُس نے لی۔شان کے ریگستان کو جنوب مشرق سے شمال مغرب کی طرف جاتے ہوئے پار کیا۔ کاشغر جاتے ہوئے اُس نے ایدی کوٹ شاہری کے آثار کا بھی تجزیہ کیا۔ ایدی کوٹ ساتویں اور آٹھویں صدی کے دوران ترفان کی راجدھانی تھا۔ اس نے لو۔ لان، کیچ اور الکھشو کا بھی دورہ کیا۔ ان مقامات کا دورہ اگرچہ پہلے جرمن عالموں نے بھی کیا تھا مگر اس بار احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں اپنے سفر کے دوران وہ روسی پامیر اور آمو دریا کے شمال میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

واقع پہاڑوں کے اس پار جا پہنچا۔ ہندوستان واپس آتے وقت سٹین نے سمرقند، خراسان اور سیستان کے کچھ حصّوں کا بھی دورہ کیا۔ سیستان وہی علاقہ ہے جو پُرانے زمانے میں شاکھستان کہلاتا تھا اور قدیم شاکھیوں کا وطن مالوف تھا۔ سیستان میں اس نے ایک پہاڑ پر بودھ خانقاہ کے آثار پائے جو کہ ایران میں اپنی نوعیت کے اولین آثار تھے۔ یہاں پر اُس نے نئے سرے سے تعمیر کی گئی دیواروں کے پیچھے دورِ متوسط کی دیواری تصاویر کا مشاہدہ کیا جو طرز اور اسلوب کے اعتبار سے یونانی تھیں۔ اپنی تیسری مہم کی تفصیل، مشاہدے اور تجزئے سٹین نے INNER MOST ASIA کے نام سے چار جلدوں میں ۱۹۲۸ء میں شائع کیے۔ یہ کتاب سٹین کی آخری یادگار کتاب ہے جو کہ وسط ایشیا کے دورے کا احاطہ کرتی ہے۔

۱۹۱۰ء میں سٹین کی خدمات کو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کو منتقل کیا گیا۔ خدمات کی منتقلی کے بعد اور ۱۹۲۹ء میں ریٹائر ہونے کے وقت تک وہ تحقیق اور تفتیش کی سرگرمیوں میں دل و جان سے جٹا رہا۔ اس دوران اُس کی سرگرمیوں کا دائرہ وسط ایشیا اور ایران تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ان ہمسایہ ممالک تک بھی جا پہنچا جو کسی زمانے میں ہندوستانی تہذیب کے مراکز رہے تھے۔ ریٹائر ہونے پر بھی اس کا جذبۂ تلاش کم نہیں ہوا۔ وہ اپنا فاضل وقت تحقیق اور تلاش میں صرف کرتا رہا۔ وہ نئے نئے علاقوں کا دورہ کرتا اور ان دوروں پر جو خرچہ آتا تھا وہ اپنے آپ برداشت کرتا تھا۔ ملازمت کے دوران ۱۹۲۸-۲۹ء میں اس نے سوات، بالا بلوچستان اور مکران کا دورہ کیا۔ ۱۹۳۲-۳۳ء اور ۱۹۳۵-۳۶ء میں وہ بالترتیب جنوبی اور مغربی ایران کا دورہ کرنے میں مصروف رہا اور کچھ اہم دریافتیں کیں۔

سٹین کی قابلِ داد خدمات کے عوض اُسے بے شمار انعامات اور اعزازات

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے نوازا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں اُسے رائل جغرافیکل سوسائٹی کی طرف سے سونے کا تمغہ ملا۔ ۱۹۲۸ء میں سٹین کو سرتی میڈل ملا۔ ۱۹۳۲ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے اسے سونے کا تمغہ عطا کیا۔ ۱۹۳۴ء میں سٹین کو ہکسلے ایوارڈ اور ۱۹۳۵ء میں نوادرات سوسائٹی کا میڈل دیا گیا۔ ۱۹۱۰ء میں اُسے برطانوی سرکار نے C.I.E کے خطاب سے نوازا اور دو سال بعد اسے K.C.I.E کا اعزاز نصیب ہوا۔

زندگی کے آخری ایام تک سٹین بدستور تحقیقی دورے کرتا رہا۔ موت سے کچھ سال قبل اُس نے عرب ساگر سے مکران کے شمال مشرقی حصے کا دورہ کیا۔ ۱۹۴۱-۴۲ء کے دوران، جب وہ زندگی کے ۷۹ سال بتا چکا تھا، اس نے گھگھر کے سوکھے طاس (بیکانیر اور بہاولپور کے ریگستانوں) کا دورہ کیا۔ یہی گھگھر ویدک دور کی سرسوتی ہے۔ اپنی اس مہم کے دوران اس نے ۲۰۰ میل کی مسافت طے کی اور کچھ ایسے مقامات کی نشاندہی کی جو قدامت کے اعتبار سے کوٹلہ دور اور کشان دور کے درمیان آتے ہیں۔ جغرافیائی مشاہدات کے سہارے سٹین نے ایک اور سوکھے دریا کے طاس کا پتہ لگایا۔ یہ دریا کسی زمانے میں ستلج کی ایک شاخ کے روپ میں بہتا تھا اور بہاولپور ریاست کے پاس گھگھر یا قدیم سرسوتی میں جا گرتا تھا۔ گوپتہ دور کے آثار اسی سنگم کے نچلے علاقے میں پائے گئے تھے۔ سٹین کا خیال تھا کہ تاریخ سے قبل کی بستیاں اُجڑنے کی وجہ ستلج کی شاخ کا خشک ہو جانا ہے۔ اس کی تحقیق کے نتائج آج بھی محققین کی توجہ کا مرکز ہیں۔

سٹین نے گلگت کا بھی دورہ کیا تھا اور ایسی کئی جگہوں کا پتہ لگایا تھا جہاں پر بدھ اور بودھ ستوپوں کی شبیہیں چٹانوں پر کندہ ہیں اور ساتھ ہی کتبہ جات بھی موجود ہیں۔ اسی تحقیق اور تلاش کے نتیجے میں پہلی بار انکشاف ہوا کہ گلگت کا علاقہ کابل کے حکمران کدار کشانوں کی ایک شاخ کے زیر نگین رہا ہے۔ سٹین کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آخری دورے کے تحقیقی کام کی تفصیل Memoir of Archaeological survey میں شائع کی جاتی تھی۔ اس کا کچھ حصہ شائع کرنے کے لئے حکام کے حوالے بھی کیا گیا تھا مگر چند ناگزیر حالات کی بنا پر ان چیزوں کو وقت پر شائع نہیں کیا جا سکا۔ وسط ایشیا کی دیواری تصاویر کا مرقع بھی سٹین کا ناقابل فراموش کارنامہ اور یادگار ہے۔

سٹین کو لڑکپن کے زمانے سے ہی افغانستان میں کام کرنے کی تمنا تھی مگر موقع اُس وقت اُس کے ہاتھ آیا جب کہ اس کی عمر کا سورج ڈھل چکا تھا۔ اولڈہم کے نام ایک خط میں اُس نے لکھا ہے۔

"میں کابل کا ابتدائی دورہ کرنے والا ہوں، اس اُمید کے ساتھ کہ وہ موقع ہاتھ آئے کہ قدیم آریانہ میں کام کرنے کی اپنے بچپن کی خواہش کو عملی روپ دے سکوں۔ تازہ کوشش کے لیے نئی دہلی سے منظوری حاصل ہوئی ہے، جس کا محرک میرا ایک ہارورڈ دوست ہے اور اس وقت کابل میں سفیر ہے۔ یہ کس طرح کامیاب ہوگا اس کا علم صرف کپیا کے دیوتاؤں کو ہے"۔

وہ بظاہر اس عالم سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتا جس عالم کی خواہش کو اس نے سالہا سال سے اپنے سینے کے ساتھ لگائے رکھا تھا۔

مارک ارل سٹین ۲۶ ، اکتوبر ۱۹۴۳ء کو مسٹر کارن لوئس وان ایچ انگرٹ کے مکان میں اطمینان کے ساتھ ابدی نیند سو گیا اور کابل کے عیسائی قبرستان میں اس کے جسد خاکی کو ۲۹ ، اکتوبر ۱۹۴۳ء کے دن سپردِ خاک کیا گیا۔ سٹین نے چونکہ شادی نہیں کی تھی اس لئے اولاد اور وارثوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سٹین نے کبھی بھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھا حالانکہ اسے یہ اعزاز جوانی میں قدم رکھتے ہی حاصل

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوگیا تھا۔ یہ جہاں اس کی انکساری کا مظہر ہے وہیں اس کے بڑے پن کی بھی دلیل ہے۔

سٹین صاحب سنسکرت، فارسی، پشتو، کشمیری اور انگریزی پر بھرپور دسترس رکھتے تھے اور ہندوستانی زبان بھی کسی رکاوٹ یا لکنت کے بغیر بول سکتے تھے۔

سر مارک آرل سٹین — یہ نام زبان پر آتے ہی میرا سر احترام سے جھک جاتا ہے۔ مشرقیات کے شعبے میں اس قاموسی شخصیت کی ٹکر کا عالم شاید کسی زمانے میں پیدا ہو تو ہو مگر کشمیریات کی دنیا میں سٹین کی قد و قامت کے دوسرے کشمیر شناس کا پیدا ہونا اگرچہ ناممکن نہیں پھر بھی کٹھن ضرور لگتا ہے، کیوں کہ مادہ پرستی کے آج کے دور میں کسی خاص مقصد کے لئے پوری زندگی وقف کر دینا سعئی لاحاصل سے کم نہیں۔ کشمیر اور کشمیریوں کے تہذیبی، تمدنی، تاریخی اور لوک ورثے کو بازیاب کرنے میں سٹین کا رول ایک مسیحا کے رول سے کم نہیں جو اپنے آپ ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اگر سٹین نہ ہوتا تو آر سی۔ کاک اور ڈاکٹر صوفی کے کارنامے بھی ادھورے رہ جاتے ہوتے اس لئے کہ دونوں نے مانگے کے اُجالے سے فانوس روشن کر کے اپنی بات کو آگے بڑھایا ہے۔ اگر سٹین نے راج ترنگنی ترجمے کے ساتھ مرتب کر کے شائع نہیں کی ہوتی اس صورت میں کشمیر کی تاریخ کا بیشتر حصہ اب تک بھی دھندلکے میں گھرا ہوا ہوتا۔ عبور و مرور کی کٹھنائیوں کے باوجود جس طرح سٹین نے نگر نگر اور گاؤں گاؤں کی خاک چھان کر راج ترنگنی میں درج واقعات، حوالہ جات اور تاریخی اہمیت کے قدیم باقیات کو جانچا اور پرکھا اور نتائج اخذ کر کے انہیں دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ہمارے محققین کے لئے مشعل راہ ہے۔ راج ترنگنی کے شلوکوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ جس طرح حاشیوں سے اُس نے تاریخ کشمیر کی گتھیوں کو سلجھایا ہمارے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آج کے مورخ اتنا بھاری بوجھ اٹھانے سے نہ صرف کتراتے نظر آتے ہیں بلکہ دُور ہی دُور چلے جارہے ہیں۔ سٹین کم ازکم ایسی غلطی کا کبھی بھی مرتکب نہیں ہوا کہ ایک صفحے پر وتستا کا ماخذ ویری ناگ کو قرار دے اور اگلے صفحے پر کوثر ناگ کو۔ نہ ہی اس نے کچھ مورخوں کی طرح دوسروں کی تحقیق اور تفتیش کو حوالہ دئے بغیر اپنے کھاتے میں ڈال دیا اور چُپ سادھ لی۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں پروفیسر محب الحسن نے "کشمیر سلطانوں کے عہد میں"[1] یہی برتاؤ محمد یوسف ٹینگ کے ساتھ روا رکھا اور پروفیسر مقبول نے حسن کھویہامی کے ساتھ۔ ایک سچے اور باوقار محقق کی طرح سٹین نے ہر اس شخص اور ہر اس ماخذ کی دین کا اعتراف تحریری طور پر کیا جس نے تحقیق اور تفتیش کی سرگرمیوں میں اس کی راہ کو روشن کرنے میں ذرہ بھر مدد کی۔ چاہے وہ گووند کول ہو یا حاتم تیلی، ہیون سوانگ ہو یا اوکانگ، بلنی ہو یا ہیروڈٹس، یہاں تک کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے سٹینوگرافر اور سروے کرنے والوں کی مدد کا اعتراف کرنا بھی بھول نہیں پایا ہے۔ آج جب ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے اور ہر طرف ادبی اور تحقیقی ڈاکہ زنی کا دور دورہ ہے۔ ڈاکہ زنی کا یہ عالم ہے کہ انسان افسوس کئے بنا کچھ اور نہیں کر سکتا اور بے تحاشا زبان پر آتا ہے کہ

دُزدے کہ دلاور است کہ بکف چراغ دارد

مغرب کے لوگ چاہے کتنے ہی بُرے رہے ہوں مگر ایسے معاملات میں اُن کی دیانتداری پر حرف نہیں آتا۔ اُن کا طرزِ عمل آج کے اندھیاروں میں بھی ہمارا راہ نما ہو سکتا ہے۔

تحقیق اور تفتیش کی ذیل میں کشمیر سٹین کے لئے پہلا زینہ تھا۔ شاید اسی

---

[1] "Kashmir under Sultans"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے کشمیر اُس کے لیے پہلی محبت کا سا درجہ رکھتا تھا۔ کشمیر کے ساتھ لگاؤ کا اعتراف اس نے تحریری طور پر کیا ہے:۔

"وسط ایشیا کی یکے بعد دیگرے سیاحتوں کے بعد مجھے ہندوستان میں اپنے پہاڑی مسکن کشمیر جا کر اُس تحقیق اور تفتیش پر غور کر کے کام کرنے کا موقع ملا جو تحقیق اور تفتیش میں نے دور دراز علاقوں میں کی تھی۔ اُن علاقوں میں جو ہر لحاظ سے قطعی مختلف ہیں مگر کشمیر سے میری محبت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اسی طرح میں اس نعمت کا بھی برابر شکر گزار رہا جو گووند کول کی دوستی اور مدد کی صورت میں میرے شامل حال رہی۔"

کشمیر کے لوک ورثے اور زبان کے ساتھ سٹین کی دل چسپی کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی سے ہی ہوا تھا۔ اپنی اس دل چسپی کا اظہار اُس نے اس طرح کیا ہے:۔

"کشمیری زبان اور کشمیر کے لوک ورثے کے ساتھ میری دل چسپی کی ابتدا اُسی وقت ہوئی جب ۱۸۸۸ء-۸۹ء کے دوران میں کلہن کی راج ترنگنی کا انتقادی ایڈیشن تیار کرنے اور اُس کا مشرح ترجمہ کرنے کے لیے وادی میں قیام پذیر رہا۔ ماضی سے متعلق متعدد سوالات، جن کا اس نوع کے کام کے ساتھ گہرا ربط ہے اور جن کو سلجھانا میرے لیے خاص کشش رکھتا تھا، کی گرہ کشائی کشمیری ودوانوں کے ساتھ قریبی واسطہ رکھنے سے ہی ممکن تھی۔ ساتھ ہی اس مقصد کے لئے اس پہاڑی خطے کے روایتی ورثے کے ساتھ رشتہ بنائے رکھنے کی بھی ضرورت تھی۔ موقع پر قدیم آثار کی چھان بین کرنا بھی ایک لازمی امر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تھا۔ لاہور میں اپنی گوناگوں اور مشکل سرکاری ذمہ داریوں سے جو فرصت مجھے ملتی تھی وہ اتنی محدود تھی کہ ان شعبوں کے صوتیاتی حصّے پر غور کرنا اور سنجیدگی کے ساتھ کشمیری کا مطالعہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ مگر موسم گرما کی آٹھ چھٹیاں جو میں نے کشمیر میں اپنے من چاہے منصوبے پر صرف کیں، جب اس ملک کی تاریخی حد بندیوں کی نشاندہی کے لئے میں نے آثارِ قدیمہ کی کھوج میں سیاحت کرنا اپنا معمول بنایا، میرے لئے نہ صرف بار آور ثابت ہوئیں، خاص کر ۹۳-۱۸۹۱ء کا درمیانی زمانہ۔ اس دوران مجھے روزمرہ کی زبان کے ساتھ مانوسیت پیدا کرنے کے مواقع فراہم ہوئے"۔

کشمیری، جس کو دبانے کیلئے مدتوں سے کوششیں جاری ہیں، کی نسبت سٹین کے تاثرات اپنی جگہ پر آج بھی اہم ہیں اور ایک رہنمایانہ رول ادا کر سکتے ہیں:۔

"کشمیر کی سیاحت کے دوران میں ایک سے زیادہ بار ذہین دیہاتیوں کی بول چال کی شستگی سے متاثر ہوا۔ یہ زبان سرینگر کے چرب زبان برہمنوں اور مسلمانوں سے قطعی مختلف ہے"۔

سٹین نے جو کچھ آج سے کم و بیش ایک سو سال پہلے محسوس کیا اس کی صداقت میں آج بھی ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ شہر اور قصبوں میں بولی جانے والی کشمیری مصنوعی اور بناوٹی کشمیری ہے کیوں کہ اکثر چیزوں کے لئے وہاں کے لوگ دوسری زبان سے مستعار الفاظ اور ترکیبوں سے کام لیتے ہیں جبکہ ایک عام دیہاتی کی زبان میں اس قدر وسعت ہے کہ اُسے ہر چیز کے لئے دوسروں کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔ سچ پوچھئے تو کشمیری کی وسعتوں کا اندازہ کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب دیہات میں بولی جانے والی زبان کا پوری طرح احاطہ کر کے ذخیرۂ الفاظ کو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ضابطہ بند طریقے سے مرتب کیا جائے۔ یہ کام نہ تو گریرسن کر پایا اور نہ دوسرا کوئی کیوں کہ ڈکشنری کے شعبے سے اکثر وہی لوگ وابستہ رہے ہیں جن کا کھیت اور کھلیان جنگل اور ریوڑ، دستکاری اور کاریگری کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

سٹین پر کشمیر کا جادو کچھ ایسا چل گیا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتا کشمیر کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا تھا۔ کشمیر میں اپنا مشن پورا کرنے کے بعد اس نے وسط ایشیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ جس وقت وہ ختن میں تحقیق کر رہا تھا اسی دوران اس نے وہاں کے آثار قدیمہ میں کشمیر کے ساتھ مماثلت محسوس کی اور بعد میں تحقیق کر کے دلائل دے کر ثابت کر دیا کہ ختن تک گاندھارا طرز تعمیر کشمیر کے راستے جا پہنچا ہے جو اپنے آپ میں ایک تحقیقی کرشمے سے کم نہیں۔ چنانچہ اس کا واضح حوالہ اس نے اپنی مشہور کتاب "قدیم ختن" میں دیا ہے۔ اسی طرح جب وہ کوہستان نمک کے علاقے کی سیاحت میں مصروف تھا اسی دوران اُس نے پتہ لگایا کہ اس علاقے میں قدیم مندروں کے کھنڈر جو نظر آتے ہیں وہ سب کشمیری طرز تعمیر کی نمائندگی کرتے ہیں اور مہاراجہ للتادت (۶۹۵ء - ۷۳۱ء) کی یادگار ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار کر کے سٹین نے کشمیر کے سیاسی جغرافیہ کے ایک نامعلوم گوشے کو روشن کر دیا اور ہرمن گوئیٹز جیسے عالموں کے لئے مزید تحقیق کے راستوں کو وا کر دیا۔

اسی طرح جب وہ وسط ایشیا کے تحقیقی سفر میں مصروف کار تھا اُسے پتہ چلا کہ زمین کو کرید کر جو تمثیل کلہن نے راج ترنگنی میں مہاراجہ للتادت سے منسوب کی ہے ایسی ہی ایک تمثیل اس علاقے میں ایک چینی جنرل سے منسوب ہے اور راج ترنگنی میں درج تمثیل سے صدیوں پرانی ہے۔ تمثیل میں مماثلت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ چین اور کشمیر کے درمیان تعلقات قدیم زمانے سے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

چلے آرہے ہیں جن کی تصدیق چینی تاریخ میں درج اندراجات سے بھی ہوتی ہے۔ تحقیق کی سرحدوں کو سمیٹنا اور محدود کرنا ایک باوقار محقق کے شایانِ شان نہیں۔ محقق کو ہمیشہ اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہیئے تاکہ تازہ ہوا اس کے دماغ کو جلا بخشتی رہے۔ ایک باوقار اور منجھے ہوئے محقق کی طرح جب بھی سٹین کو کسی نئی بات کا پتہ چلتا تو وہ کھلے بندوں اپنی کوتاہی اور کمی کا اعتراف کرنے سے ہچکچاتا نہیں تھا۔ راج ترنگنی کی اولین اشاعت کے وقت اُسے شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ وِتستا اور چناب کا ذکر رگ وید کی ندی استوتی میں ہوا ہے، مگر بعد میں جب اُسے اس حقیقت کا علم ہوا تو اس نے اس موضوع پر الگ سے ایک طویل مضمون "Some river names in the Rig veda" ۱۹۱۷ء میں لکھا جو "The Journal of the Royal Asiatic Society" میں شائع ہونے کے علاوہ کتابچے کی صورت میں الگ سے چھپ چکا ہے۔

نئے انکشافات اور تحقیق کی روشنی میں سٹین راج ترنگنی کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کرنا چاہتا تھا جس کے لئے وہ مواد اکٹھا کرنے میں مصروف کار تھا۔ اس کا پتہ ہمیں رام چند بالی کے نام ۱۳ نومبر ۱۹۴۰ء کے ایک خط سے چلتا ہے:۔

"پیارے رام چند

میں وادئ کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں۔ میرا مقصد قدیم مقامات (sites) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا تھا تاکہ انہیں راج ترنگنی کے نئے ایڈیشن کے ترجمے میں شامل کر سکوں۔ اس لئے ان تمام مقامات کی دوبارہ سیاحت کی جہاں گھومنے کی سعادت مجھے ۵۲ سال پہلے نصیب ہوئی تھی۔ یہ سیاحت میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ضابطہ بند طریقے سے مرتب کیا جائے۔ یہ کام نہ تو گریرسن کر پایا اور نہ دوسرا کوئی کیوں کہ ڈکشنری کے شعبے سے اکثر وہی لوگ وابستہ رہے ہیں جن کا کھیت اور کھلیان جنگل اور ریوڑ، دستکاری اور کاریگری کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

سٹین پر کشمیر کا جادو کچھ ایسا چل گیا تھا کہ وہ جہاں بھی جاتا کشمیر کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا تھا۔ کشمیر میں اپنا مشن پورا کرنے کے بعد اس نے وسط ایشیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنا دیا۔ جس وقت وہ ختن میں تحقیق کر رہا تھا اسی دوران اس نے وہاں کے آثار قدیمہ میں کشمیر کے ساتھ مماثلت محسوس کی اور بعد میں تحقیق کر کے دلائل دے کر ثابت کر دیا کہ ختن تک گاندھارا طرز تعمیر کشمیر کے راستے جا پہنچا ہے جو اپنے آپ میں ایک تحقیقی کرشمے سے کم نہیں۔ چنانچہ اس کا واضح حوالہ اس نے اپنی مشہور کتاب "قدیم ختن" میں دیا ہے۔ اسی طرح جب وہ کوہستان نمک کے علاقے کی سیاحت میں مصروف تھا اسی دوران اُس نے پتہ لگایا کہ اس علاقے میں قدیم مندروں کے کھنڈر جو نظر آتے ہیں وہ سب کشمیری طرز تعمیر کی نمایندگی کرتے ہیں اور مہاراجہ للتادت (۶۹۵ء - ۷۳۱ء) کی یادگار ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار کر کے سٹین نے کشمیر کے سیاسی جغرافیہ کے ایک نامعلوم گوشے کو روشن کر دیا اور ہرمن گوئیتز جیسے عالموں کے لئے مزید تحقیق کے راستوں کو وا کر دیا۔

اسی طرح جب وہ وسط ایشیا کے تحقیقی سفر میں مصروف کار تھا اُسے پتہ چلا کہ زمین کو کرید کر جو تمثیل کلہن نے راج ترنگنی میں مہاراجہ للتادت سے منسوب کی ہے ایسی ہی ایک تمثیل اس علاقے میں ایک چینی جنرل سے منسوب ہے اور راج ترنگنی میں درج تمثیل سے صدیوں پرانی ہے۔ تمثیل میں مماثلت کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ چین اور کشمیر کے درمیان تعلقات قدیم زمانے سے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

چلے آرہے ہیں جن کی تصدیق چینی تاریخ میں درج اندراجات سے بھی ہوتی ہے۔

تحقیق کی سرحدوں کو سمیٹنا اور محدود کرنا ایک باوقار محقق کے شایاں شان نہیں۔ محقق کو ہمیشہ اپنے ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھنا چاہیئے تاکہ تازہ ہوا اس کے دماغ کو جلا بخشتی رہے۔ ایک باوقار اور منجھے ہوئے محقق کی طرح جب بھی سٹین کو کسی نئی بات کا پتہ چلتا تو وہ کھلے بندوں اپنی کوتاہی اور کمی کا اعتراف کرنے سے ہچکچاتا نہیں تھا۔ راج ترنگنی کی اولین اشاعت کے وقت اُسے شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ وِتستا اور چناب کا ذکر رگ وید کی ندی استوتی میں ہوا ہے، مگر بعد میں جب اُسے اس حقیقت کا علم ہوا تو اس نے اس موضوع پر الگ سے ایک طویل مضمون "some river names in the Rig veda" لکھا جو ۱۹۱۷ء کے "The Journal of the Royal Asiatic Society" میں شائع ہونے کے علاوہ کتابچے کی صورت میں الگ سے چھپ چکا ہے۔

نئے انکشافات اور تحقیق کی روشنی میں سٹین راج ترنگنی کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن شائع کرنا چاہتا تھا جس کے لئے وہ مواد اکٹھا کرنے میں مصروف کار تھا۔ اس کا پتہ ہمیں رام چند بالی کے نام ۱۳ نومبر ۱۹۴۰ء کے ایک خط سے چلتا ہے:-

"پیارے رام چند

میں وادیٔ کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں۔ میرا مقصد قدیم مقامات (sites) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا تھا تاکہ انہیں راج ترنگنی کے نئے ایڈیشن کے ترجمے میں شامل کر سکوں اس لئے ان تمام مقامات کی دوبارہ سیاحت کی جہاں گھومنے کی سعادت مجھے ۵۲ سال پہلے نصیب ہوئی تھی۔ یہ سیاحت میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ثابت ہوئی۔

"خلوص کیش ـ ارل سٹین"

راج ترنگنی کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا اس کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوا مگر ترمیم شدہ ایڈیشن کے لئے جو مواد سٹین نے اکٹھا کر کے ترتیب دیا تھا وہ کہاں ہے ہمارے لئے ایک معمے سے کم نہیں۔ اغلب ہے کہ یہ مواد بھی سٹین کی آکسفورڈ کلیکشن (Oxford Collection) میں شامل ہوگیوں کہ لل واکھیوں پر مشتمل اس کا جمع کیا ہوا مجموعہ بھی اسی مجموعے میں شامل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کشمیر کے بارے میں اُس کے سارے کاغذات آکسفورڈ میں ہی ہوں۔ ہنگری کے Kultara میں سٹین کی جو چیزیں رکھی ہوئی ہیں اُن میں کشمیر سے متعلق کوئی چیز موجود نہیں کیوں کہ آخری زمانے میں سٹین کا ہنگری سے رابطہ نہیں رہا تھا۔ میں نے ہنگری کے قونصل خانے سے بھی اس بارے میں رابطہ قائم کیا تھا مگر وہ کسی چیز کی نشاندہی نہیں کر سکے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کشمیر سے متعلق سٹین کے جو بھی کاغذات ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اُن کی نقول حاصل کر کے محققین کے لئے مزید تحقیق کی گنجائش پیدا کی جائے۔

مارک ارل سٹین کشمیریوں کی علمی صلاحیتوں کا نہ صرف معترف تھا بلکہ گرویدہ بھی۔ اپنی آراء کا اظہار کرتے ہوئے سٹین رقمطراز ہے:۔

"میں یہاں پران شواہد کو بیان نہیں کر سکتا جو کشمیر میں لکھے گئے سنسکرت گرنتھوں اور مقامی روایات کا سہارا لے کر اکٹھا کئے جاسکتے ہیں جن کی بنا پر میرا یقین ہے کہ عظیم علمی کامیابیاں اور صاف شستہ اور شاعرانہ اظہار کشمیر کے فضلاء میں یکجا نظر آتا ہے اس کا ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں فقدان ہے۔ یہاں کے عالم و فاضل

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

زندگی کے حقائق کو گہرائی کے ساتھ دیکھنے کے علاوہ بذلہ سنجی سے مرصع مشاہدے اور ملکی معاملات میں خصوصی دلچسپی کی دولت سے بھی مزین ہیں"۔

اگرچہ کشمیر کی تاریخ سٹین کی توجہ کا مرکز رہی پھر بھی اُس نے زبان اور ادب سے کنارہ کشی نہیں کی۔ سب سے پہلے اُس نے پنڈت گووند کول کے اشتراک سے "حاتمز ٹیلز" مرتب کی۔ یہ کہانیاں پانزل کے ایک پیشہ ور کتھا کار حاتم تیلی کی زبانی سُن کر مہندمرگ میں ۱۸۹۶ء میں قلم بند کی گئیں۔ کہانیوں کا سنسکرت ترجمہ پنڈت گووند کول نے ۱۸۹۷ء میں تیار کیا مگر دوسری مصروفیات کی وجہ سے سٹین خود اس کام کے لئے وقت نہیں نکال سکا۔ بالآخر سر جارج گریرسن نے ان کہانیوں کو ۱۹۱۰ء میں مرتب کر کے شائع کر دیا۔

سٹین کے کشمیری کے ساتھ لگاؤ اور دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ اس نے کشمیر کے مشہور سنسکرت عالم نتیانندجی سے "ڈال کو یک زوٹ" کا کشمیری اور سنسکرت میں ترجمہ کروایا تھا۔ ۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو اُس نے رام چند بالی کے نام اپنے ایک خط میں لکھا:۔

"میرے پیارے رام چند
براہ کرم نتیانند سے بہت جلد ملئے اور معلوم کیجئے کہ کیا انہیں وہ رقم مل گئی ہے جس کا میں نے اکتوبر اور اب جنوری میں اُن کے لئے انتظام کروایا تھا۔ یہ انہیں امپیریل بنک کے ذریعے ملے گی۔ یہ رقم دراصل انہیں "ڈال کو یک زوٹ" کے کشمیری اور سنسکرت ترجمے کے معاوضے کے طور پر دی گئی ہے۔ میں نے سنسکرت ترجمے کو صاف کرنے کے لئے پنڈت زاڈو سے خط و کتابت کی تھی۔ کیا انہوں نے اس خط و کتابت کو ایک نظر دیکھ لیا؟"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سٹین کی دلی خواہش تھی کہ بعد از مرگ اُسے مہند مرگ میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ اُس نے اس مقصد کے لئے جگہ کا انتخاب بھی کر رکھا تھا۔ مہند مرگ سے اُسے گہرا لگاؤ تھا۔ کشمیر میں قیام کے دوران وہ اپنا زیادہ وقت ہر مکھ کے سائے میں واقع اسی چراگاہ میں گذارتا تھا۔ یہیں بیٹھ کر اُس نے اپنی اکثر کتابوں کو آخری شکل بھی دی۔ سٹین کی آخری خواہش تو پوری نہیں ہو سکی مگر اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اس کے دوست گریڈ منڈہسن اینڈرویز اور رام چندر نے مل کر اس چراگاہ میں ایک سنگِ مرمر کا کتبہ نصب کر دیا:

مہند مرگ

"سر ارل سٹائن نے ۱۸۹۵ء کے موسم گرما میں جب وہ راج ترنگنی تالیف کر رہے تھے اس مرگ (چراگاہ) میں پہلی بار اپنا کیمپ لگایا۔ بعد ازاں جب وہ اپنے سفر ہائے عظیم کا حال لکھ رہے تھے کئی بار موسم گرما میں پھر یہاں آئے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہاں سے افغانستان روانہ ہوئے۔ اکیاسی سال کی عمر میں بمقام کابل ۲۶ راکتوبر ۱۹۴۳ء کو رحلت کر گئے"

(نوٹ: خطوط اور کتبہ کا اُردو ترجمہ میں نے ڈاکٹر برج پریمی کی کتاب 'جلوۂ صد رنگ' سے لیا ہے کیوں کہ انگریزی میں لکھے گئے خطوط اور کتبے تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہو سکا۔)

کشمیر کے بارے میں سٹین نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں اکثر لوگوں کو تفصیلات کا علم نہیں کیونکہ راج ترنگنی کے بغیر اُن کے دیگر تحقیقی کارنامے عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ تحقیق کے شعبے سے دل چسپی رکھنے والوں کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے اس کی تفصیل اس طرح ہے:۔

سال اشاعت	کتاب کا نام
1900	1. Kalhana's Rajtarangni
1919	2. Marco-Polo's account of Mongoltan roads in Kashmir

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

3.	Hatim's tales	1910
4.	Memoir of maps illustrating the ancient Geography of Kashmir	1899
5.	Kashmiri-English Dictionary 2 vols:	
6.	In memorium Pandit Govind Koul	1923
7.	The castle of Lohara (Indian antiquary XXVI	
8.	Identification of Parihaspora	1915-16.
9.	A note on Avantipora	1913-14
10.	A note on kashmiri monuments	1915-16
11.	Sanskrit deed of sale concerning a Kashmiri Maha bharata mss	1900
12.	Ancient Geography of Kashmir	1900

مندرجہ بالا تحقیقی کارناموں میں سے کشمیری ڈکشنری کے بغیر سبھی چیزیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ ڈکشنری کے بارے میں اب تک یہی بات ہمارے علم میں ہے کہ ایشور کول کے "دش بھاشا کوش" کو بنیاد بنا کر پہلی کشمیری انگریزی ڈکشنری سر جارج ابراہیم گریرسن نے پنڈت مکند رام شاستری اور دوسرے لوگوں کی مدد سے تیار کی تھی مگر سٹین کی دو جلدوں پر مشتمل کشمیری۔ انگریزی ڈکشنری کی نشاندہی ہونے سے واقعات کا تناظر ہی بدل جاتا ہے۔ سٹین کی ڈکشنری کا انکشاف ڈاکٹر چکرورتی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے مگر اس نے اس امر کی نشاندہی نہیں کی ہے کہ اس کا مسودہ کہاں ہے۔ ڈکشنری کی تفصیلات دیتے ہوئے ڈاکٹر چکرورتی نے کتاب کے آگے سن اشاعت درج نہیں کیا ہے جس کا مطلب یہی لیا جا سکتا ہے کہ ڈکشنری

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غیر مطبوعہ ہے۔ڈاں کو بک نوٹ کے کشمیری ترجمے کی طرح ڈکشنری (دو جلد)
کی نایابی بھی کشمیری محققین کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

○

کتابیات:

H.A.Stein — In Memorium Govit koul
London - 1923

H.A.Stein — Some river names in Rigveda
London - 1917

H.A.Stein — Kalhana's Rajatarangini
Delhi - 1961

H.A.Stein — Ancient Khotan
London - 1907

H.A.Stein — Ancient Geography of Kashmir
Delhi - 1961

H.A.Stein — Inner most Asia
London - 1928

H.A.Stein — Ser India
Oxford - 1921

H.A.Stein — Alexundra's tract in India
Delhi - 1983

Dr. N. Pchakravati : The Journal of the Great India Society - 1944
Reprint: 1987

Dr. Brij Premi — Jalva Sad Rang
Srinagar - 1985

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رشید تاثیر

بخشی غلام محمدؐ

جناب بخشی غلام محمد کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے اُن معروف و منفرد سیاستدانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی فہم و فراست سے ریاست کی سیاسی تاریخ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دئیے ہیں۔ وہ ایک بامقصد، ارادے کے پکے اور بیدار مغز سیاستدان تھے۔

وہ ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۰۷ء کی نمناک اور یخ بستہ شب کو چھتہ بل سرینگر میں ایک[1] اوسط درجے کے گھرانے میں تولّد ہوئے۔ اُن کے والد بزرگوار کا نام عبدالغفار بخشی تھا۔ بخشی غلام محمد اپنے چھ بھائیوں (غلام نبی، علی محمد۔ ولی محمد۔ عبدالمجید۔ عبدالحمید) اور دو بہنوں (عائشہ اور زونی) میں سب سے بڑے تھے۔ اُنکی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد نے چھتہ بل کو خیرباد کہہ کے خانقاہ سوختہ میں سکونت اختیار کی[2]۔ اس طرح بخشی غلام محمد کی تعلیم و تربیت اُن کے ماموں غلام قادر خان[3] کی سرپرستی میں ہوئی۔ بخشی صاحب نے نویں جماعت[4] تک تعلیم حاصل کی اور سنہ[5] ۱۹۲۹ء میں چیرچ مشن[6] کے لبھہ میں قائم کردہ پرائمری سکول میں بحیثیت اُردو معلم کے پانچ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غیر مطبوعہ ہے۔ ڈان کویک زوٹ کے کشمیری ترجمے کی طرح ڈکشنری[2] (دو جلد)
کی نایابی بھی کشمیری محققین کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔

○

کتابیات:

H.A.Stein — In Memorium Govit Koul — London - 1923

H.A.Stein — Some river names in Rigveda — London - 1917

H.A.Stein — Kalhana's Rajatarangini — Delhi - 1961

H.A.Stein — Ancient Kholan — London - 1907

H.A.Stein — Ancient Geography of Kashmir — Delhi - 1961

H.A.Stein — Inner most Asia — London - 1928

H.A.Stein — Ser India — Oxford - 1921

H.A.Stein — Alexandra's tract in India — Delhi - 1983

Dr. N. Pchakravati : The Journal of the Great India Society - 1944 — Reprint: 1987

Dr. Brij Premi — Jalva Sad Rang — Srinagar - 1985

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رشید تاثیر

بخشی غلام محمدؐ

جناب بخشی غلام محمد کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے اُن معروف و منفرد سیاستدانوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی فہم و فراست سے ریاست کی سیاسی تاریخ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں۔ وہ ایک با مقصد، ارادے کے پکے اور بیدار مغز سیاستدان تھے۔

۲۵، ۱۴ جنوری ۱۹۰۷ء کی خنک اور یخ بستہ شب کو چھتہ بل سرینگر میں ایک[1] اوسط درجے کے گھرانے میں تولّد ہوئے۔ اُن کے والد بزرگوار کا نام عبدالغفار بخشی تھا۔ بخشی غلام محمد اپنے چھ بھائیوں (غلام نبی، علی محمد، ولی محمد، عبدالمجید، عبدالحمید) اور دو بہنوں (عائشہ اور زونی) میں سب سے بڑے تھے۔ انکی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد نے چھتہ بل کو خیرباد کہہ کے خانقاہ سوختہ میں سکونت[3] اختیار کی[2]۔ اس طرح بخشی غلام محمد کی تعلیم و تربیت اُن کے ماموں غلام قادر[5] خان کی سرپرستی میں ہوئی۔ بخشی صاحب نے نویں جماعت[4] تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۲۹ء میں چرچ مشن[6] کے لبھہ میں قائم کردہ پرائمری سکول میں بحیثیت اردو معلم کے پانچ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سال کے شرطیہ قیام کے اقرار پر لداخ چلے گئے۔ اُن کے لداخ پہنچنے کے بعد اُن کے عزیز و اقارب دوست احباب میں یہ افواہ شدّت سے گشت کرنے لگی کہ انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے اور انہیں جوزف نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُن کے اہل خانہ کے لئے یہ بڑی تشویش ناک خبر تھی۔ انہوں نے ٹنڈل بسکو کے سامنے یہ بہانہ بنا کر کہ اُن کی شادی ہونے والی ہے۔ انہیں فوراً سرینگر واپس لایا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں وہ واپس سرینگر آ گئے اور اسی برس اُن کی شادی ہوئی۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے دوبارہ واپس لداخ جانے کے بجائے ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ سرینگر میں واقع کھادی بھنڈار میں بحیثیت سیلزمین کے ملازمت اختیار کی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں انہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے کر لاہور بھیجا گیا۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء میں کھادی بورڈ نے لاہور کا برانچ بند کیا اور بخشی غلام محمد سرینگر کھادی بھنڈار کے منیجر کی حیثیت میں واپس آ گئے۔

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے سانحہ کے بعد وادی کشمیر ریاستی انقلابیوں کا مرکز بن چکا تھا اور لوگوں میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی تھی جس پر قابو پانا جاگیردارانہ نظام کے بس کا روگ نہ تھا۔ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء میں گلانسی اصلاحاتی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس کے تحت ریاستی عوام کو بنیادی انسانی حقوق اور پریس و پلیٹ فارم کی محدود آزادی نصیب ہوئی۔ ان ہی دنوں کشمیری پنڈتوں نے روٹی مومنٹ کے نام سے ایجی ٹیشن شروع کی جس کو جاگیردارانہ نظام نے چٹکی بجاتے دفن کیا۔ اس سے حکومت کے حوصلے بڑھے اور اس نے گلانسی سفارشات کو روبہ عمل لانے میں لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا۔ حکومت کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے ریاستی مسلمانوں میں دبی ہوئی بے چینی ابھر آئی۔ مفتی ضیاءالدین ضیا پونچھی نے اس کے خلاف اپنی ایک تقریر میں حکومت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کو انتباہ کیا جس کے بعد ایک بار پھر وادیٔ کشمیر کے آزادی پسندوں نے ایجی ٹیشن کی راہ اختیار کی جس کے نتیجہ میں مہاراجہ ہری سنگھ کے حکم پر جامع مسجد سرینگر کے بیرونی احاطہ میں جمع لوگوں پر بے تحاشا گولیاں برسائیں جس سے چار افراد جاں بحق اور بے شمار زخمی ہوئے۔ لوگوں نے خوف اور بربریت کے اس عریاں ناچ سے وحشت زدہ ہو کر جامع مسجد کے چاروں دروازوں کو بند کر لیا۔ گو کہ اس وقت تک بخشی غلام محمد نے ریاستی سیاست میں براہِ راست کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن بدلتے ہوئے حالات اور سیاسی اُفق کے مد و جزر سے بے نیاز بھی نہ تھے۔ اس دن جامع مسجد کے محصورین میں وہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے مسجد میں جمع لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر پہلی بار ایک طویل ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا:۔

"اس فرسودہ اور جابرانہ نظام کو نابود کرنے کے لئے مجھے ایک کم دس ہزار جانبازوں کی ضرورت ہے۔ ایک کی کمی پورا کرنے کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں اور اس ظالم حکومت کی پہلی گولی کے لیے میں اپنا سینہ پیش کروں گا۔ مسجد کے دروازے کھول دیجئے میں دیکھتا ہوں کہ یہ نکمی حکومت ہمارا کیا بگاڑتی ہے"۔

اس پرجوش تقریر کے بعد جوش و خروش سے بھرپور مجمعے نے مسجد کے دروازے وا کئے اور بیرونی احاطہ سے ہوتے ہوئے نوہٹہ چوک میں پہونچتے ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان سے آملی۔ بخشی غلام محمد کی اس پہل سے مسرور ہو کر انکے حق میں کھدر بھنڈار کی نسبت سے غلام محمد گاندھی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ اس طرح بخشی صاحب ریاستی سیاست میں داخل ہوئے۔ بخشی صاحب کی بات کرتے وقت تحریک حریت کشمیر کے تمام تر مراحل اور واقعات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ مضمون بخشی صاحب کا سیاسی خاکہ بھی ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سال کے شرطیہ قیام کے اقرار پر لداخ چلے گئے۔ اُن کے لداخ پہنچنے کے بعد اُن کے عزیز و اقارب دوست احباب میں یہ افواہ شدت سے گشت کرنے لگی کہ انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کیا ہے اور انہیں جوزف نام سے پکارا جاتا ہے۔ اُن کے اہل خانہ کے لئے یہ بڑی تشویش ناک خبر تھی۔ انہوں نے ٹنڈل بسکو کے سامنے یہ بہانہ بنا کر کہ اُن کی شادی ہونے والی ہے۔ انہیں فوراً سرینگر واپس لایا جائے چنانچہ ۱۹۳۰ء میں وہ واپس سرینگر آگئے اور اسی برس اُن کی شادی ہوئی۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے دوبارہ واپس لداخ جانے کے بجائے ہری سنگھ ہائی اسٹریٹ سرینگر میں واقع کھادی بھنڈار میں بحیثیت سیلز مین کے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۳۰ء میں انہیں منیجر کے عہدے پر ترقی دے کر لاہور بھیجا گیا۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں کھادی بورڈ نے لاہور کا برانچ بند کیا اور بخشی غلام محمد سرینگر کھادی بھنڈار کے منیجر کی حیثیت میں واپس آئے۔

۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے سانحہ کے بعد وادی کشمیر ریاستی انقلابیوں کا مرکز بن چکا تھا اور لوگوں میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑ گئی تھی جس پر قابو پانا جاگیردارانہ نظام کے بس کا روگ نہ تھا۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں گلانسی اصلاحاتی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی جس کے تحت ریاستی عوام کو بنیادی انسانی حقوق اور پریس و پلیٹ فارم کی محدود آزادی نصیب ہوئی۔ ان ہی دنوں کشمیری پنڈتوں نے روٹی موومنٹ کے نام سے ایجی ٹیشن شروع کی جس کو جاگیردارانہ نظام نے چٹکی بجاتے دفن کیا۔ اس سے حکومت کے حوصلے بڑھے اور اس نے گلانسی سفارشات کو روبہ عمل لانے میں لیت و لعل سے کام لینا شروع کیا۔ حکومت کی اس ناعاقبت اندیشانہ حرکت سے ریاستی مسلمانوں میں دبی ہوئی بے چینی ابھر آئی۔ مفتی ضیاء الدین ضیا پونچھی نے اس کے خلاف اپنی ایک تقریر میں حکومت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کو انتباہ کیا جس کے بعد ایک بار پھر وادیٔ کشمیر کے آزادی پسندوں نے ایجی ٹیشن کی راہ اختیار کی جس کے نتیجہ میں مہاراجہ ہری سنگھ کے حکم پر جامع مسجد سرینگر کے بیرونی احاطہ میں جمع لوگوں پر بے تحاشا گولیاں برسائیں جس سے چار افراد جاں بحق اور بے شمار زخمی ہوئے۔ لوگوں نے خوف اور بربریت کے اس عریاں ناچ سے وحشت زدہ ہو کر جامع مسجد کے چاروں دروازوں کو بند کر لیا۔ گو کہ اس وقت تک بخشی غلام محمد نے ریاستی سیاست میں براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن بدلتے ہوئے حالات اور سیاسی اُفق کے مدوجزر سے بے نیاز بھی نہ تھے۔ اس دن جامع مسجد کے محصورین میں وہ بھی شامل تھے۔ انہوں نے مسجد میں جمع لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر پہلی بار ایک طویل ولولہ انگیز تقریر کی اور کہا:۔

"اس فرسودہ اور جابرانہ نظام کو نابود کرنے کے لئے مجھے ایک کم دس ہزار جانبازوں کی ضرورت ہے ایک کی کمی پورا کرنے کیلئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں اور اس ظالم حکومت کی پہلی گولی کیلئے میں اپنا سینہ پیش کروں گا۔ مسجد کے دروازے کھول دیجئے میں دیکھتا ہوں کہ یہ نکمی حکومت ہمارا کیا بگاڑتی ہے"۔

اس پُرجوش تقریر کے بعد جوش و خروش سے بھرپور مجمعے نے مسجد کے دروازے وا کئے اور بیرونی احاطہ سے ہوتے ہوئے نوہٹہ چوک میں پہونچتے ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد ان سے آملی۔ بخشی غلام محمد کی اس پہل سے مسرور ہو کر انکے حق میں کھدر بھنڈار کی نسبت سے غلام محمد گاندھی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ اس طرح بخشی صاحب ریاستی سیاست میں داخل ہوئے۔ بخشی صاحب کی بات کرتے وقت تحریک حریت کشمیر کے تمام تر مراحل اور واقعات کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ مضمون بخشی صاحب کا سیاسی خاکہ بھی ہے۔

دریں اثناء میرواعظان کشمیر کے درمیان باہمی پرانی رقابتیں ترکہ کوٹہ کے نام سے عود کر آئیں جس نے آگے چل کر "شیر بکرا" نام کے شرمناک تنازعہ کو جنم دیا اور بنیادی انسانی حقوق کی ضمانتیں تلاش کرنے والوں پر حیوانیت کی رعونت غالب آئی۔ اس طرح لوٹ مار کا ایک نیا باب کھلا جس میں یا علی کا نعرہ دے کر نرغہ میں پھنسے ہوئے کی پگڑی "ململی" کہہ کر اتاری جاتی تھی اور حیدری کے جواب میں "زادری" یعنی چادر سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس عبرت انگیز ماحول میں بڑے بڑے اپنے ہوش وحواس قابو میں نہ رکھ سکے۔ بخشی غلام محمد کے فرائض منصبی میں قائدین کے تنظیمی دورہ کا پروگرام مرتب کرنا اُسے روبہ عمل لانا مسلم کانفرنس کے جلوسوں کی بحیثیت سالار اعظم آگے آگے گھوڑے پر سوار ہو کر پیشوائی کرنا شامل ہوئی[۱۳]۔ بخشی صاحب کی ان ہی صلاحیتوں کے باعث ۱۹۳۴ء میں جب مجاہد منزل تعمیر کرنے کا اہتمام ہوا، انہیں اس پروجیکٹ کا مہتمم خصوصی قرار دیا گیا۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۴ء کو ریاستی حکومت نے بخشی غلام محمد کو سرکار کے خلاف نفرت پھیلانے کے جرم میں گرفتار کرکے ریاسی جیل بھیج دیا[۱۴]۔ یہ بخشی صاحب کی پہلی سیاسی گرفتاری تھی۔ مسلم کانفرنس کی تنظیم میں انکی گرفتاری کے ساتھ ہی وہ عنصر جو اُن کی شہرت، صلاحیتوں اور انوکھے طرز تنظیم سے خار کھا بیٹھے تھے، بخشی صاحب پر یہ الزام لگانے سے باز نہیں رہے کہ انہوں نے مجاہد منزل کی تعمیر کے ضمن میں آئے ہوئے عوامی چندہ کا خورد برد کیا ہے۔ جبکہ تحقیقات کے بعد یہ الزام بے بنیاد ثابت ہوا۔ چنانچہ شیخ محمد عبداللہ، جنہیں ۱۹۵۳ء کے بعد بخشی صاحب کے ساتھ ہر سطح پر شدید اختلافات رہے اور اکثر و بیشتر اُن کے خلاف بولتے رہے، بخشی غلام محمد کے مجاہد منزل کی تعمیر و حفاظت کے جذبۂ ایثار کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ "آتش چنار" میں صفحہ ۲۴۲ پر یوں رقمطراز

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیں:-

"اس امر کا اعتراف برحق ہوگا کہ بخشی غلام محمد نے مجموعی حیثیت سے اس عمارت (مجاہد منزل) کی حفاظت کی اور بعد میں اسے اوقاف کے سپرد کر دیا"

۱۹۳۵ء میں مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت پریم ناتھ بزاز کے اشتراک سے ہفت روزہ "ہمدرد" سرینگر سے جاری کیا اور سنہ ۱۹۴۱ء میں جموں و کشمیر آرمز ایکٹ یا ہندی رسم الخط کے معاملے پر ان دونوں کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ پریم ناتھ بزاز نے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی جس کے نتیجہ میں "ہمدرد" کے مالکانہ حقوق زیر بحث آئے۔ شیخ صاحب معترضین کے کہنے پر قریب قریب اس بات پر راضی ہوئے کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز کو "ہمدرد" کے جملہ حقوق بغیر کسی معاوضہ کے تفویض کئے جائیں لیکن مولانا سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد اس بات پر بضد رہے کہ اس سے معاوضہ لیا جائے۔ ڈاکٹر ٹپلش کو ثالث مقرر کیا گیا اور اُن کے فیصلہ کے مطابق پانچ ہزار روپے لے کر شیخ صاحب "ہمدرد" کے حقوق سے دستبردار ہو گئے۔ اس واقعہ کو دُہرانے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مولانا مسعودی کے دوش بہ دوش بخشی غلام محمد کی رائے بھی شیخ صاحب کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

اخبار "ہمدرد" کے حوالے سے یہ کہنا بعید از معلومات نہ ہوگا کہ پنڈت پریم ناتھ بزاز اور مرحوم شیخ محمد عبداللہ نے پنڈت جواہر لال نہرو سے تعلقات قائم کرنے کے لئے ہفت روزہ ہمدرد کو ہی اپنا ذریعہ بنایا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں مولانا محمد سعید مسعودی ایڈیٹر ہمدرد نے اخبار کی مکمل فائل پنڈت جی کے مطالعے کے لئے مالکان کی ہدایت پر الہ آباد بھیجی اور اس کے بعد پنڈت بزاز اور شیخ صاحب نے اُن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے نام اپنا پہلا مشترکہ خط ڈائل کے حوالہ سے پنڈت نہرو کو کشمیر آنے کی دعوت کا پیغام دے کر بھیجا۔ اس مکتوب نے آدھے تعارف کا کام دیا۔ ۱۹۳۷ء میں لاہور ریلوے سٹیشن پر شیخ محمد عبداللہ نے بخشی غلام محمد کے ہمراہ پنڈت جی سے ملاقات کی۔ شیخ صاحب انکی دعوت پر صوبہ سرحد کے دورے پر گئے اور بخشی صاحب اس ملاقات کے خوشگوار تاثرات لے کر سرینگر لوٹ آئے۔

۷ رجون ۱۹۳۷ء کو پنڈت شیو نرائن فوطیدار نے کشمیری پنڈت جاتی کو شیتل ناتھ کے احاطہ میں بھاشن دیتے ہوئے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے مسلمانوں کی دلآزاری ہوئی۔ یہ خبر ۸ رجون ۱۹۳۷ء کو اخبار مارتنڈ سرینگر میں شائع ہوئی جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہونچی اور وہ مشتعل ہوگئے اور میرواعظ مولانا یوسف شاہ کی قیادت میں اس واقعہ کے خلاف جامع مسجد سرینگر سے ایک پر امن احتجاجی جلوس نکالا گیا۔ بہوری کدل کے قریب پولیس نے جلوس کو روکنے کی غرض سے گولی چلادی۔ فرزندان توحید میں سے ایک شہید ہوا۔ اہل جلوس نعش کو لے کر بھانہ محلہ پہونچے جہاں پولیس نے ان پر حملہ کر کے نعش کو اپنے قبضہ میں لیا۔ میرواعظ کو ان کے پانچ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا۔ ان دنوں شیخ صاحب بیجبہاڑہ میں تھے۔ انہوں نے اس سانحہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"مذہب کسی کی میراث نہیں۔ اگر میرواعظ دوپہر کا کھانا جیل میں کھاتے ہیں تو رات کے کھانے پر ہم اُن کے شریک دسترخوان ہوں گے"۔

ان حالات سے خوفزدہ ہو کر پنڈت فوطیدار خبر کو اخبار مارتنڈ کی غلط رپورٹنگ قرار دے کر مسلم کانفرنسی لیڈروں کے قدموں پہ بچے سیب کی طرح گر کر معافیاں مانگنے لگے۔ کچھ دن بعد بخشی غلام محمد نے فوطیدار صاحب کو ایک کھلی موٹر کار میں اپنے ہمراہ سوار کر کے مہاراج گنج اور شہر کے دوسرے اندرونی علاقوں میں گشت لگایا جس کا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ظاہری اور باطنی مقصد یہ تھا کہ قصوروار نے معافی مانگ لی ہے اور مسلم کانفرنسی رہنماؤں نے اسلامی روایات کے مطابق اُسے معاف کیا ہے۔ شیخ صاحب "آتش چنار" میں اس واقعہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"...... وہ ہماری پناہ میں آگئے۔ ہم نے انہیں پریشان دیکھا تو ہم نے اپنے کارکنوں کے ہمراہ ایک کھُلی کار میں انہیں شہر میں گھمایا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ شخص پشیمان ہو کر اب معافی مانگ رہا ہے لہٰذا معاملے کو اب ختم کرنا چاہیئے"۔

شیخ صاحب نے بخشی غلام محمد کا نام لئے بغیر صیغہ جمع استعمال کیا ہے۔ جبکہ صیغہ واحد کارکن بخشی غلام محمد تھا۔ اس واقعہ کو دُہرانے کا مقصد یہ ہے کہ ایک شعلہ بار ماحول میں یہ بخشی غلام محمد کا دل گُردہ اور حوصلہ مندی تھی کہ انہوں نے ایک گستاخ شخص کو اسلامی روایات کے مطابق پناہ دینے اور معاف کرنے کا انوکھا راستہ تلاش کیا۔

۸ راگست ۱۹۳۸ء کو مسلم کانفرنس نے ذمہ دار نظام حکومت ڈے منایا جسمیں مسلمانوں کے دوش بدوش ہندو اور سکھ رہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ ضلع میرپور کے صدر راجہ محمد اکبر خان نے اس ضمن میں ایک پُر جوش تقریر کی۔ انہیں گرفتار کر کے ایک سال قید اور ایک سو روپے جرمانہ کا حکم سنایا گیا۔ اس پر احتجاجی جلسے اور جلوس نکلنے لگے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ہندو مسلم رہنماؤں کے دستخطوں سے ۲۷ راگست ۱۹۳۸ء کو قومی ڈیمانڈ نام کی ایک دستاویز مشتہر کی گئی۔ حکومت نے دستاویز پر دستخط کرنے والوں اور اُن کے حامیوں کو گرفتار کر کے چھ چھ ماہ قید اور پچیس پچیس روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق اور مولانا محمد سعید مسعودی سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی۔ اُن کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

انکار پر انہیں بھی چھ چھ ماہ قید کا حکم سنایا گیا۔ قید سے رہا ہونے کے بعد مسلم کانفرنسی لیڈروں نے قومی سطح کی تنظیم قائم کرنے کے لیے غور و خوض شروع کیا اور بدلتے ہوئے نظریات و حالات کا جائزہ لینے کے لیے شیخ محمد عبداللہ، بخشی غلام محمد، پریم ناتھ بزاز اور کیشپ بندھو بمبئی یا کلکتہ کے دورے پر گئے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ ریاست میں قومی سطح کی تنظیم قائم کرنے سے کون سے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی واپسی پر قومی سطح کی نئی انجمن تشکیل دینے کی خاطر باہمی صلاح مشورے شروع ہو گئے۔ مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں اس تجویز پر جموں کے ممبران نے زبردست نکتہ چینی کی۔

۱۰ جون ۱۹۳۹ء کو سپیشل اجلاس میں مسلم کانفرنس کے نام اور آئین کو تبدیل کرنے کی تجویز کے حق میں چودھری غلام عباس خان نے تقریر کی۔ اور پھر نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی۔* یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ تجویز کی مکمل حمایت کے باوجود کشمیری لیڈر کلی طور اس سے متفق نہیں تھے بلکہ اسے شیخ محمد عبداللہ کی من مانی کاروائی اور دباؤ کا ردِ عمل قرار دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسلام آباد کے مسلم کانفرنسیوں نے سپیشل اجلاس کا نہ صرف بائیکاٹ کیا بلکہ مسلم کانفرنس کی سرگرمیاں تیز ترکیں۔ سرینگر میں پُرجوش نوجوان قریشی محمد یوسف کی قیادت میں منظم ہوئے۔ اس موقع پر بخشی غلام محمد نے اپنی حکمتِ عملی کو بروئے کار لا کر ان سے خفیہ رابطہ قائم کیا اور انہیں یہ کہہ کر تھپکی دی کہ " تم لوگوں نے بڑی جرات اور جواں مردی کا مظاہرہ کر کے مسلم کانفرنس کو زندہ رکھ کر شیخ محمد عبداللہ کے بدلتے ہوئے سیاسی نظریہ کا مقابلہ کیا ہے گو کہ میری مجبوریاں مجھے نیشنل کانفرنس

---

* وجوہات کا تفصیلی جائزہ چودھری غلام عباس خان نے اپنی سوانح حیات "کشمکش" کے صفحہ ۲۱۲ تا ۲۱۶ پر پیش کیا ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے وابستہ کر چکی ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب میں مسلم کانفرنس میں شامل ہو کر آپ کے دوش بدوش کام کروں گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ مجاہد منزل کو جو مسلم کانفرنس کی قیادت میں مسلمانوں کے عطیہ سے تعمیر کیا گیا ہے، نیشنل کانفرنس اور شیخ محمد عبداللہ کے تصرف سے آزاد کرایا جائے۔ آپ کا فرض ہے کہ مجاہد منزل کو اپنے قبضہ میں لینے کے لئے عملی اقدام اٹھائیں اور فی الحال اس عمارت کے ایک حصہ پر مسلم کانفرنس کا بورڈ آویزاں کر کے اس پر قبضہ کیا جائے۔"[1]

اگلے دن محمد یوسف قریشی کی قیادت میں مسلم نوجوانوں کی ایک ٹولی نے مجاہد منزل کے ایک حصہ پر مسلم کانفرنس کا بورڈ چڑھا کر اپنا آفس کھولا۔ جب اس واقعہ کا شیخ صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے بخشی غلام محمد کی قیادت میں پچاس والنٹیروں کا ایک جتھا تحقیق و پاک صاف کرنے کیلئے بھیجا۔ بخشی صاحب نے اپنے قول سے ہٹ کر نہ صرف بورڈ کو اتار کر توڑا بلکہ ان لوگوں کی خاصی مرمت بھی کی۔ مولانا محمد سعید مسعودی نے مجھے اس واقعہ کی مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ مسلم کانفرنسیوں سے عہد و پیمان باندھنے کے عمل میں بخشی صاحب اکیلے نہیں تھے بلکہ خواجہ غلام محمد صادق بھی ان کے ساتھ تھے۔ ان کی یہ میٹنگ بادام واری میں ہوئی تھی۔ جب بخشی صاحب غضبناک ہو کر مجاہد منزل پر قبضہ کرنے والوں کے خلاف لشکر کشی میں مصروف تھے میں مجاہد منزل میں موجود تھا اور میں نے محمد یوسف قریشی کو مزید مار کھانے سے بچایا۔ غرض بخشی صاحب نے جہاں ایک تیر سے دو شکار کئے وہاں ہر ایک کو اپنے قد کے مطابق تراش کے رکھا۔ چنانچہ "آتش چنار"[2] میں شیخ صاحب اس واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

"ایک طرف اگر مجھے چودھری غلام عباس خان، اللہ رکھا ساغر اور عبدالمجید

---

[1] تاریخ حریت کشمیر جلد ا ص ۳۴۳-۴۴ [2] صفحہ ۲۳۱

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

قریشی کے تابڑ توڑ اعتراضات کا جواب دینا پڑتا تھا تو دوسری طرف مولانا محمد سعید مسعودی، بخشی غلام محمد اور افضل بیگ کی ڈھلمل اور بعض حالات میں وشواسگھات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ مولوی عبداللہ وکیل جیسے لوگ کھلم کھلا اس نظریئے کے دشمن تھے"

لیکن بخشی غلام محمد کی ادائیں شیخ صاحب کو اس قدر بھائیں تھیں کہ بقول اُن کے "میں نے ہمیشہ بخشی غلام محمد کی ان لغزشوں کو درگذر کیا"

کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع ہونے سے چند دن قبل بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق جماعتی ہدایت کے تحت خفیہ طور لاہور چلے گئے اور جب اس ریاست گیر تحریک نے اپنے ارتعاش انگیز شباب سے مہذب دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا تو پنجاب کے مختلف علاقوں کا خصوصی طور دورہ کر کے بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق نے جہاں ہندوستانی رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے اہم رول ادا کیا، وہاں ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں سے نہ صرف قریبی رابطہ قائم رکھا جس سے مجموعی طور پر برصغیر میں تحریک کی حمایت کی گئی۔ خصوصی طور پر دہلی، صوبہ سرحد اور پنجاب کے مسلم لیگی اخباروں نے کوئٹ کشمیر تحریک کی پُرزور حمایت کی۔

بہرکیف ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کو جب ہندوستان کی آزادی کا اعلان ہوا تو پاکستان کے نام سے ایک نئی مملکت دنیا کے نقشے پر اُبھر آئی۔ اس کے ساتھ ہی ریاست جموں وکشمیر کے مسئلہ الحاق کا پیچیدہ معاملہ سامنے آیا۔ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو موہن داس کرم چند گاندھی نے سرینگر میں مہاراجہ ہری سنگھ سے ملاقات کی۔ ان کے واپس جاتے ہی وزیر اعظم رام چندر کاک کو وزارت اعظمیٰ سے برطرف

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کر کے جرنیل جنک سنگھ کو ریاست کا عارضی وزیر اعظم بنایا گیا اور اسیران تحریک کوئٹ کشمیر غیر مشروط طور پر رہا ہوئے۔ بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق، کامریڈ چودھری محمد شفیع پر ریاست میں داخلہ کی پابندی منسوخ ہوئی۔ بخشی صاحب کے اعزاز میں مائیسمہ بازار سری نگر میں ایک استقبالیہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں لوگوں نے "باغی عبداللہ کی جے" کے نعرے لگائے۔ بخشی غلام محمد نے اس نعرے میں اصلاح کی خاطر کہا: "جے" ہماری قومی زبان کا لفظ نہیں ہے "زندہ باد" کہو۔

۲۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو جناب شیخ محمد عبداللہ بادامی باغ کنٹونمنٹ جیل سے رہا کئے گئے۔ گمان تھا کہ انہیں ریاست کا وزیر اعظم بنایا جائے گا لیکن مہاراجہ ہری سنگھ نے مہر چند مہاجن کو وزیر اعظم بنایا۔ ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو پونچھ میں مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی۔ شیخ صاحب کی رہائی کے ساتھ ہی ریاست میں جہاں سیاسی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہوئی وہیں الحاق کے بارے میں قیاس آرائیاں، آراء اور سرگوشیاں تیز ہونے لگیں۔ پاکستان کے کئی سرکردہ حکام اور لیڈر سرینگر آئے اور گفت و شنید کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا۔ افواہوں کی گرم بازاری اور ۱۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو نیشنل کانفرنس کے سرکردہ لیڈروں اور ورکنگ کمیٹی کے ممبران کے درمیان غلام قادر خان کے مکان واقعہ خانقاہ سوختہ پر طویل محفل مذاکرہ منعقد ہوئی۔ اسے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے بجائے عام صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیالات کی محفل کا نام دیا گیا۔

دہلی جانے سے قبل ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے لال چوک سرینگر میں ایک عوامی اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے اور باتوں کے علاوہ کہا:

---

۵ ماسوائے مرزا محمد افضل بیگ، جو اسلام آباد چلے گئے تھے۔

۶ بخشی غلام محمد کے ماموں جی کا تذکرہ "آتش چنار" میں بھی کیا گیا ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"تاریخ کے اس نازک ترین دور میں آپ لوگ فرزند واحد کی طرح متحد ہو کر غیر مسلموں کے مال و جان کی حفاظت کریں۔ میں کل دہلی جا رہا ہوں آپ لوگ بخشی غلام محمد کی ہدایات پر عمل کریں"۔

۲۶ ، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قبائلیوں نے منظم طور پر کشمیر پر حملہ کیا۔ مہاراجہ کی فوج حملے کی تاب نہ لا کر تیزی سے پیچھے ہٹنے لگی۔ میدان جنگ سے آنیوالی تشویشناک خبروں سے مہاراجہ ہری سنگھ کے حوصلے پست کئے اور وہ راتوں رات وادی سے فرار ہو گئے۔ مہاراجہ کے بھاگ جانے کی خبر عام ہوتے ہی وادی میں طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہوا۔ خوف و ہراس اور سراسیمگی کے اس عالم میں بخشی غلام محمد نے جرأت مندی کا مظاہرہ کر کے خانقاہ معلی کے صحن پاک میں عام لوگوں کو حالات حاضرہ سے باخبر کراتے کہا کہ ہمیں ہر قیمت پر فرقہ وارانہ اتحاد بحال رکھنا ہے اور اس کی عمل آوری کے لئے مجھے دس ہزار والنٹیروں کی فوری ضرورت ہے۔ آگے چل کر یہی رضاکار تنظیم سلامتی فوج کہلانے لگی۔ یہ بات شک شبہ سے بالاتر ہے کہ سلامتی فوج نے اپنے ابتدائی ایام میں بڑی خوش اسلوبی سے وادی کشمیر میں فرقہ وارانہ اتحاد کو قائم رکھنے میں مدد دی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس تنظیم سے تنومند افراد کو چن کر کشمیر نیشنل ملیشیا قائم کی گئی جو ۱۹۵۴ء میں انڈین آرمی میں مدغم ہو کر اس کا حصہ بن گئی۔

۳۱ ، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک فرمان کے ذریعہ شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا ناظم اعلیٰ مقرر کر کے وزیر اعظم مہر چند مہاجن کے ساتھ منسلک کیا۔ بخشی غلام محمد نائب ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ انہیں جموں بھیجا گیا۔ انہوں نے وہاں اپنی سوجھ بوجھ اور سیاسی تدبر سے نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات پر قابو پایا بلکہ ہزاروں اغوا شدہ مسلم خواتین کو برآمد کر کے ان کے لواحقین کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پاس پاکستان بھیجنے کا بندوبست بھی کیا۔ بلکہ ان ہتھیاروں کے بارے میں بھی تحقیقات کرانے کا اہتمام کرایا جو مرکزی حکومت نے قبائلی حملہ روکنے کے لئے ریاستی حکومت کو بھیجے تھے اور جنہیں فرقہ پرستوں میں تقسیم کرایا گیا تھا۔ اس موضوع پر شیخ محمد عبداللہ اور مرکزی حکومت کے مابین طویل خط و کتابت کے بعد مہاراجہ کی وساطت سے ہتھیار درآمد کرنے کا سلسلہ منقطع ہوا۔

۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک اور فرمان کے ذریعہ مہر چند مہاجن کو ریاستی وزارت عظمیٰ کے عہدے سے برطرف کر کے شیخ محمد عبداللہ کو ریاست کا نیا وزیر اعظم نامزد کیا۔ بخشی غلام محمد نئی وزارت میں نائب وزیر اعظم بنائے گئے اور انہیں وزارت داخلہ کا قلمدان سونپا گیا۔ ریاست میں نیشنل کانفرنس کو بحیثیت واحد سیاسی جماعت کے اُبھارنے میں انہوں نے کلیدی رول ادا کیا۔ یہ اور بات ہے کہ صوبہ جموں میں وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے لیکن وہاں نیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ضرور ہوئے جس کی بناء پر وہ نہ صرف داد تحسین کے مستحق قرار پائے بلکہ مرد آہن بھی کہلانے لگے۔

اس زمانے میں خواجہ غلام محی الدین قرہ نیشنل کانفرنس کے صوبائی صدر تھے۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کے صوبائی اجلاسوں میں بخشی غلام محمد کے طور طریقوں پر شدید نکتہ چینی شروع کی جس سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ اس جماعت کے اندر بھی اختلافات چل رہے ہیں اور جماعت باہمی کشیدگی سے خالی نہیں ہے لیکن جماعت کے قائد جناب شیخ محمد عبداللہ جنہیں بخشی غلام محمد کی ہر ادا مرغوب اور دل نواز لگتی تھی ـــــ نے غلام محی الدین قرہ کی بڑھتی ہوئی نکتہ چینی کا جواب دینے کے لئے نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد سعید مسعودی کو مجاہد منزل میں منعقدہ ایک ایسی ہی میٹنگ میں بھیجا جس میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بخشی اور قرہ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے کہا:

"یہ اختلافات کہیں ناسمجھی، کہیں غلط فہمی اور کہیں خودغرضیوں کے نتائج ہیں۔ تمام مخلص اور دانشور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان میں نہ الجھیں اور ان بحثوں سے دور رہ کر اپنا فرض انجام دیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایات کی تحقیقات کرنا اور مجلس آرائی کا طریقہ تخریبی ہے، اس کو ترک کرو۔"

خواجہ غلام محی الدین قرہ نے نوشتۂ دیوار پڑھا۔ ان کی علیحدگی سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں پہلی دراڑ پڑی مگر یہ تنظیمی سطح پر بخشی غلام محمد کی ایسی فتح تھی جس نے انہیں تنظیمی اور سرکاری احکامات پر حاوی ہونے کی قوت بخشی۔

فروری ۱۹۴۹ء میں صوبۂ جموں میں پرجا پریشد نے شیخ وزارت کیخلاف ایجی ٹیشن شروع کی۔ گو اسے زمانے میں حکومت کو بے شمار و قتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ بخشی غلام محمد نے اسے جمنے نہیں دیا۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پرجا پریشد کے رہنماؤں نے غیر مشروط طور پر یہ تحریک واپس لے لی اور اس عمل کو بخشی غلام محمد کا حسن تدبر قرار دیا گیا۔

اسی دوران سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں کشمیر کی اقتصادی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"حکومت ہند نے ۴۸-۱۹۴۷ء میں حکومت کشمیر کو ۲ کروڑ روپے کا قرضہ دیا ہے اور سال ۱۹۴۹ء کے لئے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کا قرضہ فراہم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کشمیر میں جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ قرضہ ہی ہے جو پانچ سال تک واجب الادا ہے۔"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اسس بیان کے جواب میں بخشی غلام محمد نے ریاست کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے سدباب کے لئے اعلان کیا کہ سرکاری اخراجات کو اعتدال پر لانے کے لئے لازم ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی ذات، مہارانی اور شاہی خاندان کی ٹھاٹھ باٹھ کو قائم رکھنے کے لئے ریاست سے ہونیوالے خرچہ کی تمام مدوں کو ختم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے وزیر داخلہ کی سفارش پر مہاراجہ اور مہارانی کی ذات پر ریاستی مدوں سے خرچ ہونے والی دس لاکھ روپے کی سالانہ رقم، پولو گراؤنڈ پر سالانہ بیس لاکھ روپے اور ریاستی گیسٹ ہاؤس پر بے پناہ دولت لٹانے کے سابق احکامات کو کالعدم و منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔

۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس نے غیر حاضر زمینداری کا خاتمہ اور زرعی زمین کسانوں کی ملکیت قرار دینے کا اصول تسلیم کیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں ریاستی حکومت نے اسی اصول کے تحت زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی در اس بات کے حق میں تھے کہ غیر حاضر زمینداروں کی تحویل میں ایک ہزار کنال زمین رکھنے کے بعد جو باقی رہے گی، وہ کاشتکاروں میں مفت تقسیم کی جائے جبکہ مولانا محمد سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں ماسٹر روشن لال کے ذریعہ قرارداد پیش کرائی کہ زمینداروں کے پاس صرف ۱۶۰ کنال تک زمین رکھی جائے۔ قرارداد معمولی سی ترمیم کے بعد پاس ہوئی۔ لیکن لفظ بلا معاوضہ کے مدعا و مقصد پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے شیخ محمد عبداللہ اپنی ساری کابینہ کو لے کر دہلی گئے جہاں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بخشی اور قرہ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے کہا:

"یہ اختلافات کہیں ناسمجھی، کہیں غلط فہمی اور کہیں خود غرضیوں کے نتائج ہیں۔ تمام مخلص اور دانشور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان میں نہ الجھیں اور ان بحثوں سے دور رہ کر اپنا فرض انجام دیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایات کی تحقیقات کرنا اور مجلس آرائی کا طریقہ تخریبی ہے، اس کو ترک کرو۔"

خواجہ غلام محی الدین قرہ نے نوشتۂ دیوار پڑھا۔ ان کی علیحدگی سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں پہلی دراڑ پڑی مگر یہ تنظیمی سطح پر بخشی غلام محمد کی ایسی فتح تھی جس نے انہیں تنظیمی اور سرکاری احکامات پر حاوی ہونے کی قوت بخشی۔

فروری ۱۹۴۹ء میں صوبۂ جموں میں پرجا پریشد نے شیخ وزارت کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کی۔ گو اسے دبانے میں حکومت کو بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ بخشی غلام محمد نے اسے جمنے نہیں دیا۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پرجا پریشد کے رہنماؤں نے غیر مشروط طور پر یہ تحریک واپس لے لی اور اس عمل کو بخشی غلام محمد کا حسنِ تدبر قرار دیا گیا۔

اسی دوران سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں کشمیر کی اقتصادی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"حکومت ہند نے ۴۸-۱۹۴۷ء میں حکومت کشمیر کو ۲ کروڑ روپے کا قرضہ دیا ہے اور سال ۱۹۴۹ء کے لئے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کا قرضہ فراہم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کشمیر میں جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ قرضہ ہی ہے جو پانچ سال تک واجب الادا ہے۔"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس بیان کے جواب میں بخشی غلام محمد نے ریاست کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے سدباب کے لئے اعلان کیا کہ سرکاری اخراجات کو اعتدال پر لانے کے لئے لازم ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی ذات، مہارانی اور شاہی خاندان کی ٹھاٹھ باٹھ کو قائم رکھنے کے لئے ریاست سے ہونیوالے خرچہ کی تمام مدوں کو ختم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے وزیر داخلہ کی سفارش پر مہاراجہ اور مہارانی کی ذات پر ریاستی مدوں سے خرچ ہونے والی دس لاکھ روپے کی سالانہ رقم، پولو گراؤنڈ پر سالانہ بیس لاکھ روپے اور ریاستی گیسٹ ہاؤس پر بے پناہ دولت لٹانے کے سابق احکامات کو کالعدم و منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔

۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس نے غیر حاضر زمینداری کا خاتمہ اور زرعی زمین کسانوں کی ملکیت قرار دینے کا اصول تسلیم کیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں ریاستی حکومت نے اسی اصول کے تحت زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی در اس بات کے حق میں تھے کہ غیر حاضر زمینداروں کی تحویل میں ایک ہزار کنال زمین رکھنے کے بعد جو باقی رہے گی، وہ کاشتکاروں میں مفت تقسیم کی جائے جبکہ مولانا محمد سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں ماسٹر روشن لال کے ذریعہ قرارداد پیش کرائی کہ زمینداروں کے پاس صرف ۱۶۰ کنال تک زمین رکھی جائے۔ قرارداد معمولی سی ترمیم کے بعد پاس ہوئی۔ لیکن لفظ بلا معاوضہ کے مدعا و مقصد پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے شیخ محمد عبداللہ اپنی ساری کابینہ کو لے کر دہلی گئے جہاں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بخشی اور قرہ دونوں موجود تھے۔ انہوں نے کہا:

"یہ اختلافات کہیں ناسمجھی، کہیں غلط فہمی اور کہیں خود غرضیوں کے نتائج ہیں۔ تمام مخلص اور دانشور کارکنوں کا فرض ہے کہ وہ ان میں نہ الجھیں اور ان بحثوں سے دور رہ کر اپنا فرض انجام دیں۔ ایک دوسرے کے خلاف شکایات کی تحقیقات کرنا اور مجلس آرائی کا طریقہ تخریبی ہے، اس کو ترک کرو۔"

خواجہ غلام محی الدین قرہ نے نوشتۂ دیوار پڑھا۔ ان کی علیحدگی سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم میں پہلی دراڑ پڑی مگر یہ تنظیمی سطح پر بخشی غلام محمد کی ایسی فتح تھی جس نے انہیں تنظیمی اور سرکاری احکامات پر حاوی ہونے کی قوت بخشی۔

فروری ۱۹۴۹ء میں صوبۂ جموں میں پرجا پریشد نے شیخ وزارت کیخلاف ایجی ٹیشن شروع کی۔ گو اسے زمانے میں حکومت کو بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ بخشی غلام محمد نے اسے جمنے نہیں دیا۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۴۹ء میں پرجا پریشد کے رہنماؤں نے غیر مشروط طور پر یہ تحریک واپس لے لی اور اس عمل کو بخشی غلام محمد کا حسنِ تدبر قرار دیا گیا۔

اسی دوران سردار ولبھ بھائی پٹیل مرکزی وزیر داخلہ نے پارلیمنٹ میں کشمیر کی اقتصادی صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"حکومت ہند نے ۴۸-۱۹۴۷ء میں حکومت کشمیر کو ۲ کروڑ روپے کا قرضہ دیا ہے اور سال ۱۹۴۹ء کے لئے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ روپے کا قرضہ فراہم کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت ہند کشمیر میں جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ قرضہ ہی ہے جو پانچ سال تک واجب الادا ہے۔"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس بیان کے جواب میں بخشی غلام محمد نے ریاست کی معاشی اور اقتصادی بدحالی کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اس کے سدباب کے لئے اعلان کیا کہ سرکاری اخراجات کو اعتدال پر لانے کے لئے لازم ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی ذات، مہارانی اور شاہی خاندان کی ٹھاٹھ باٹھ کو قائم رکھنے کے لئے ریاست سے ہونیوالے خرچہ کی تمام مدوں کو ختم کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ چنانچہ ریاستی حکومت نے وزیر داخلہ کی سفارش پر مہاراجہ اور مہارانی کی ذات پر ریاستی مدوں سے خرچ ہونے والی دس لاکھ روپے کی سالانہ رقم، پولو گراؤنڈ پر سالانہ بیس لاکھ روپے اور ریاستی گیسٹ ہاؤس پر بے پناہ دولت لٹانے کے سابق احکامات کو کالعدم و منسوخ کرنے کا حکم جاری کیا۔

۱۹۳۹ء میں نیشنل کانفرنس نے غیر حاضر زمینداری کا خاتمہ اور زرعی زمین کسانوں کی ملکیت قرار دینے کا اصول تسلیم کیا تھا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں ریاستی حکومت نے اسی اصول کے تحت زرعی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں مرزا محمد افضل بیگ اور ڈی پی در اس بات کے حق میں تھے کہ غیر حاضر زمینداروں کی تحویل میں ایک ہزار کنال زمین رکھنے کے بعد جو باقی رہے گی، وہ کاشتکاروں میں مفت تقسیم کی جائے جبکہ مولانا محمد سعید مسعودی اور بخشی غلام محمد نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں ماسٹر روشن لال کے ذریعہ قرارداد پیش کرائی کہ زمینداروں کے پاس صرف ۱۶۰ کنال تک زمین رکھی جائے۔ قرارداد معمولی سی ترمیم کے بعد پاس ہوئی۔ لیکن لفظ بلا معاوضہ کے مدعا و مقصد پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے درمیان اختلافات نے سنگین صورت اختیار کرلی۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں اس مسئلہ کو سلجھانے کیلئے شیخ محمد عبداللہ اپنی ساری کابینہ کو لے کر دہلی گئے جہاں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نہرو اور سردار پٹیل کو یہ رمز سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ ریاست میں رائے شماری کے موقعہ پر یہ عمل ہمارے لئے ثمرآور ثابت ہوگا۔ اس پر مرکزی حکومت کی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے سردار پٹیل نے پارلیمنٹ میں اس موضوع پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا:

"بڑی زمینداریاں ختم کرنا ریاست کا اندرونی معاملہ ہے مرکز اس میں مداخلت نہیں کر سکتا ہے"۔

یوں مسئلہ باہمی گفت و شنید اور سمجھداری سے طے ہوا۔

دلی سے بخشی غلام محمد اپنے کسی نجی کام سے اور خواجہ غلام محمد صادق گردے کا آپریشن کرانے کے لئے بمبئی چلے گئے۔ دونوں نے ایک ہی ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک رات بخشی غلام محمد صادق صاحب کے کمرے میں آئے اور ترنگ میں آکر باتوں باتوں میں کہا، "صادق تم میرا ساتھ دو میں نے اس ... کا دہلی میں پتہ کاٹ لیا ہے، میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلادوں گا"۔ اگلے دن سویرے بخشی صاحب کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں غلام محمد صادق راز فاش نہ کردے انہوں نے صادق صاحب کو اسلوب لفاظیت کے مختلف زاویوں سے کریدنا شروع کیا۔ صادق صاحب بھانپ گئے، انہوں نے اپنی بات چیت میں بخشی صاحب کے منہ سے نکلے صدر جملے کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ بخشی صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اپنا وہم خیال کر کے بھول گئے۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق کے درمیان ٹھن گئی۔

ف ۱۳ جولائی ۱۹۵۰ء صبح ۹ بجے لال چوک سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی پولیس اور ملیشیا کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ریاست میں زرعی اصلاحات نافذ ہونے کا اعلان کیا اور اسی شام کو مزار شہداء پر اپنی تقریر میں اس کی تفصیلات بیان کیں+

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صادق صاحب نے بخشی غلام محمد کو نیچا دکھانے کی خاطر صدر، واقعہ شیخ صاحب کی نوٹس میں لایا اور جب شیخ صاحب نے انہیں بخشی صاحب کے سامنے اسے دُہرانے کو کہا تو بقول شیخ محمد عبداللہؒ غلام محمد صادق مُکر گئے۔ اس پر شیخ صاحب سخت ناراض ہوئے۔ صادق صاحب کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں بخشی غلام محمد کی سفارش اور حمایت سے ہی غلام محمد صادق ریاستی مجلس آئین سازیہ کے صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے اپنی سیاسی بساط اور شیخ محمد عبداللہ پر اپنی گرفت کا لوہا غلام محمد صادق سے منوالیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات نے ہندوستان کے خاور و باختر کو متاثر کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے لئے یہ ماحول تشویش اور فکرمندی کا باعث بنا۔ انہیں یہ کھٹکا ستانے لگا کہ اگر ان حالات میں ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کی گئی تو ریاست میں ہند مخالف قوتیں اسے اپنا سیاسی سرمایہ بنا کر ان کے تیس سالہ سیاسی نظریہ کو بھسم کر کے چھوڑ دیں گے۔ اس اندیشہ کی روک تھام کے لئے انہوں نے دہلی کے اعلیٰ ایوانوں میں آواز اٹھائی جہاں انکی بات سنجیدگی سے سنی گئی۔ لیکن سردار پٹیل نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔ دراصل شیخ محمد عبداللہ کے بڑھ چڑھ کر بولنے کی عادت سے سردار پٹیل خار کھا بیٹھے تھے۔ اور انہیں یہ بھی گمان تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کا الحاق مہاراجہ ہری سنگھ کے احساس اور ان کے فہم و فراست کا نتیجہ ہے اور شیخ محمد عبداللہ کو پنڈت جواہر لال نہرو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ ان حالات سے مایوس ہو کر شیخ محمد عبداللہ نے مرکزی لیڈروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اپنی دلی کیفیت کو عوامی سطح پر ابھارنے کا طریقہ اختیار کیا تو سردار پٹیل نے اسے چیلنج سمجھ کر نہ صرف

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نہرو اور سردار پٹیل کو یہ امر سمجھانے میں کامیاب ہوئے کہ ریاست میں رائے شماری کے موقعہ پر یہ عمل ہمارے لئے ثمرآور ثابت ہوگا۔ اس پر مرکزی حکومت کی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے سردار پٹیل نے پارلیمنٹ میں اس موضوع پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا:

"بڑی زمینداریاں ختم کرنا ریاست کا اندرونی معاملہ ہے مرکز اس میں مداخلت نہیں کرسکتا ہے"

یوں مسئلہ باہمی گفت وشنید اور سمجھداری سے طے ہوا۔

دلی سے بخشی غلام محمد اپنے کسی نجی کام سے اور خواجہ غلام محمد صادق گردے کا آپریشن کرانے کے لئے بمبئی چلے گئے۔ دونوں نے ایک ہی ہوٹل میں قیام کیا۔ ایک رات بخشی غلام محمد صادق صاحب کے کمرے میں آئے اور ترنگ میں آکر باتوں باتوں میں کہا۔ "صادق تم میرا ساتھ دو میں نے اس..... کا دہلی میں پتہ کاٹ لیا ہے، میں اسے چھٹی کا دودھ یاد دلادوں گا۔" اگلے دن سویرے بخشی صاحب کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں غلام محمد صادق راز فاش نہ کردے انہوں نے صادق صاحب کو اسلوب لفاظیت کے مختلف زاویوں سے کریدنا شروع کیا۔ صادق صاحب بھانپ گئے، انہوں نے اپنی بات چیت میں بخشی صاحب کے منہ سے نکلے صدر جملے کی جانب ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ بخشی صاحب نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اپنا وہم خیال کرکے بھول گئے۔

اپریل ۱۹۵۱ء میں بخشی غلام محمد اور غلام محمد صادق کے درمیان ٹھن گئی۔

نوٹ ۱۳ جولائی ۱۹۵۰ء صبح ۹ بجے لال چوک سرینگر میں شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی پولیس اور ملیشیا کے جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ریاست میں زرعی اصلاحات نافذ ہونے کا اعلان کیا اور اسی شام کو مزار شہداء پر اپنی تقریر میں اس کی تفصیلات بیان کیں +

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صادق صاحب نے بخشی غلام محمد کو نیچا دکھانے کی خاطر یہ واقعہ شیخ صاحب کی نوٹس میں لایا اور جب شیخ صاحب نے انہیں بخشی صاحب کے سامنے اسے دُہرانے کو کہا تو بقول شیخ محمد عبداللہؔ، غلام محمد صادق مُکر گئے۔ اس پر شیخ صاحب سخت ناراض ہوئے۔ صادق صاحب کو وزارت سے مستعفی ہونا پڑا۔ یہ اور بات ہے کہ بعد ازاں بخشی غلام محمد کی سفارش اور حمایت سے ہی غلام محمد صادق ریاستی مجلس آئین ساز کے صدر منتخب ہوئے۔ اس طرح بخشی غلام محمد نے اپنی سیاسی بساط اور شیخ محمد عبداللہ پر اپنی گرفت کا لوہا غلام محمد صادق سے منوالیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ وارانہ تعصب اور فسادات نے ہندوستان کے خاور و باختر کو متاثر کیا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ کے لئے یہ ماحول تشویش اور فکر مندی کا باعث بنا۔ انہیں یہ کھٹکا ستانے لگا کہ اگر ان حالات میں ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کی گئی تو ریاست میں ہند مخالف قوتیں اسے اپنا سیاسی سرمایہ بنا کر ان کے تیس سالہ سیاسی نظریہ کو بھسم کر کے چھوڑ دیں گے۔ اس اندیشہ کی روک تھام کے لئے انہوں نے دہلی کے اعلیٰ ایوانوں میں آواز اٹھائی جہاں انکی بات سنجیدگی سے سنی گئی۔ لیکن سردار پٹیل نے اسے آگے بڑھنے سے روکا۔ دراصل شیخ محمد عبداللہ کے بڑھ چڑھ کر بولنے کی عادت سے سردار پٹیل خار کھا بیٹھے تھے۔ اور انہیں یہ بھی گمان تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کا الحاق مہاراجہ ہری سنگھ کے احساس اور ان کے فہم و فراست کا نتیجہ ہے اور شیخ محمد عبداللہ کو پنڈت جواہر لال نہرو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے رہے ہیں۔ ان حالات سے مایوس ہو کر شیخ محمد عبداللہ نے مرکزی لیڈروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اپنی دلی کیفیت کو عوامی سطح پر اُبھارنے کا طریقہ اختیار کیا تو سردار پٹیل نے اسے چیلنج سمجھ کر نہ صرف

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جموں کی پرجا پریشد کی پشت پناہی شروع کی بلکہ ریاست میں متوازی لیڈر شپ قائم کرنے کے لئے بخشی غلام محمد کی پشت پناہی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ میں وزیراعظم ہند کو متعصب ممبران کے ذریعہ پریشان کرنے اور کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی حمایت نہ کرنے کے لئے اُن پر دباؤ ڈالنے سے بھی باز نہ آئے جس کے نتیجہ میں وزیراعظم ہند نے وزیراعظم کشمیر کے نام خطوط کی کاپیاں ریاست کے وزیر داخلہ کو بھیجنے سے ابتدا کی۔ شیخ محمد عبداللہ نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو لکھا:

"یہ طریقہ غلط ہے اگر آپ ریاست میں بخشی غلام محمد کو وزیراعظم بنانا چاہتے ہیں تو شوق سے بنایئے لیکن اوچھے ہتھیاروں کا استعمال نہیں کیجئے۔"

دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

چنانچہ بداعتمادی کی فضا اور ان رنجشوں کو دور کرنے کے لئے جولائی ۱۹۵۲ء میں مرکز اور ریاستی حکومت کے مابین ریاستی امور کے متعلق تعلقات و اختیارات کی حد بندی کے لئے ایک خصوصی میٹنگ دہلی میں منعقد ہوئی جس میں بعض امور پر اختلاف رائے نے سنگین صورت اختیار کی جس کے باعث ریاستی نمائندے شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ تفصیلات طے کئے بغیر ہی کشمیر واپس آنے کے لئے دہلی ریلوے سٹیشن پر پہونچے۔ اس نازک موقعہ پر بخشی غلام محمد کی سعی کامیاب نے تعطل کو ختم کرنے کے لئے ریاستی نمائندوں کو واپس گفت و شنید کی میز تک پہونچایا۔

۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء کو دہلی اگریمنٹ عالم وجود میں آیا لیکن حالات گو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیں کہ معاہدے سے دونوں فریق مطمئن نہیں تھے۔ اگریمنٹ میں طے شدہ امور سے متعلق الفاظ، معنی اور تشریحات کی فریقین نے اپنے اپنے ڈھنگ اور مقصد سے تعبیریں نکالنی شروع کیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے کھلم کھلا مرکز پر عہد شکنی کا الزام عائد کرتے ہوئے ریاستی مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے حق میں تقاریر اور بیانات جاری کرنے کا عمل تیز تر کیا۔ اس ڈرامے کا آخری سین ۹ اگست ۱۹۵۳ء کی صبح کو شیخ محمد عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدہ سے برطرف اور گرفتار کر کے ڈراپ ہوا۔ صوبہ جموں میں پرجا پریشد نے تحریک واپس لی اور وادی کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ کی برطرفی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس تحریک کے دوران ۳۴ جانیں تلف ہوئیں۔

۹ اگست کی رات کے ساڑھے آٹھ بجے بخشی غلام محمد نے ریڈیو کشمیر سے اپنی نشری تقریر میں کئی مراعات کا اعلان کرتے ہوئے کہا:

"آج کا دن کشمیر کی سیاسی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جو فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں وہ ہماری قوم کی تاریخ اور مستقبل پر اثر انداز ہوگا۔ آپ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ گذشتہ چند ماہ سے ہماری ریاست ایک شدید سیاسی اور معاشی بحران کا شکار بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے ریاست کی وحدت اور یہاں کے عوام کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس قومی خطرے کو دور کرنے کی اہم ضرورت کے پیش نظر میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنے فرائض کو محسوس کرتے ہوئے حکومت کی ذمہ داریوں کو سنبھال لیا ہے۔"

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ بخشی غلام محمد اور شیخ محمد عبداللہ کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

درمیان نظریاتی اختلافات ۹ اگست سے قبل ہی منظر عام پر آ چکے تھے۔ لیکن بخشی غلام محمد وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر انہیں چھپاتے رہے۔ حالانکہ ۷ اگست کو مجاہد منزل میں نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے ان افواہوں کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ عام مسلمانوں کے لئے پانچ ارکان اسلام پر ایمان لانا لازمی ہے لیکن میرے لئے شیخ محمد عبداللہ کی وفاداری چھٹے رکن کا درجہ رکھتی ہے"۔

اقتدار سنبھالنے سے پہلے بخشی صاحب نے یہ شرط عائد کی تھی کہ شیخ محمد عبداللہ کے آزاد رہنے کی صورت میں وہ کاروبار حکومت نہیں چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ بنی وزارت کا حلف لینے سے قبل انہیں شیخ صاحب کی وارنٹ گرفتاری کی نقل فراہم کی گئی۔ بقول اجیت پرشاد جین اور ڈاکٹر کرن سنگھ شروع میں بخشی صاحب کچھ ڈھیلے رہے لیکن بعد میں انہوں نے پوری قوت سے اقتدار کا استعمال کیا۔

۹ اگست ۱۹۵۳ء کی تحریک کو دبانے میں بخشی صاحب کو زیادہ دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ انہوں نے سیاسی وضعداری کی خاطر وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والے تقریباً جملہ ممبران اسمبلی کو حفاظت خود ی کے نام پر حراست میں لیا اور اُن میں سے بیشتر ممبران کی وفاداریاں خرید کر ریاستی اسمبلی میں اپنی اکثریت کا اعلان کیا۔

شیخ صاحب کی گرفتاری کے بعد انہیں نیشنل کانفرنس کی صدارت سے الگ کرنا بخشی صاحب کے لئے لازمی تھا۔ انہوں نے نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ مولانا مسعودی جنرل سیکریٹری و ممبر پارلیمنٹ اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے دہلی سے سری نگر آئے۔ راستے میں انہیں ڈی ٹی پی در کی ہدایت پر بس سے نیچے اتارا گیا۔ اس بات پر تنگی پر مولانا محمد سعید مسعودی نے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رام بن میں نائب تحصیلدار کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا۔ اس طرح مولانا کے سری نگر پہونچنے سے قبل ہی ورکنگ کمیٹی نے حسب منشا اپنا فیصلہ لے لیا۔ مولانا نے خانقاہ معلیٰ کے صحن میں لوگوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ صاحب کی گرفتاری پر اظہار افسوس کیا۔ بخشی غلام محمد نے مولانا پر ڈورے ڈالنے کی غرض سے خفیہ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ بقول مولانا "میں ان حالات میں گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا" اس لئے شرط رکھی کہ صوفی محمد اکبر ممبر پارلیمنٹ کو رہا کرکے اس ملاقات میں شامل کیا جائے۔ ملاقات کے لئے پہلے گنڈ ڈاک بنگلہ اور بعد میں جموں سرکٹ ہاؤس طے پایا۔ ملاقات کے بعد تینوں دہلی چلے گئے۔ بخشی صاحب کو یقین تھا کہ اب پنڈت جواہر لال نہرو کے سامنے مولانا ان کی تشدد آمیز کارروائیوں کی وکالت کریں گے لیکن جب مولانا نے بے گناہ لوگوں کے مرنے کے مخبر وار اعداد وشمار پیش کئے تو بخشی صاحب نے ۳۲ افراد کے مارے جانے کا اقرار کیا جبکہ مولانا تین ہزار بے گناہوں کے قتل ہونے کی دلیل پر بضد رہے۔

پیار، محبت، راحت اور قائدانہ رہنمائی کے بجائے بخشی غلام محمد نے نجانے کیوں صوبہ کشمیر میں دیدہ و دانستہ زور زبردستی کے حربوں کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ ان کے گرد طالع آزماؤں اور سیاسی یتیموں کے ایک بڑے گروہ نے ڈیرہ ڈالا۔ اور وہ اس حصار سے باہر نہ آسکے۔ چنانچہ تحریر و تقریر کی آزادی پر پابندیاں عائد کیں۔ اخبارات کو سانپوں سے تشبیہ دی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سانپ کو سدھایا جائے یا مارا جائے"۔ بخشی صاحب کے دور انتظامیہ میں اخبار کا ڈکلریشن حاصل کرنا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا لیکن اکثر اخبار نویس ان کے وظیفہ خوار تھے۔ کئی نامہ نگاروں پر بخشی صاحب بے حد مہربان تھے۔ بخشی صاحب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے دورِ اقتدار میں سپیشل سٹاف (خفیہ پولیس ایجنسی) کی سیاسی غنڈہ گردی عروج
کو پہونچی بخشی صاحب کی ذات کو ان کے حامیوں نے سپر بنا کر اسے داغدار بنانے
میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ لیکن اس کے باوجود بخشی صاحب نے بحیثیت ایک
ایڈمنسٹریٹر کے مجموعی طور پر ریاست جموں و کشمیر کی تعمیر و ترقی میں حیرت انگیز اور قابل
تحسین کارنامے انجام دیئے ہیں۔ انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں علم کو فروغ دینے
کی خاطر پرائمری کلاس سے لے کر ایم۔ اے۔ تک مفت تعلیم کو رائج کیا۔ ہزاروں
بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کو سرکاری ملازمت سے منسلک کرنے میں نہ
صرف پہل کی بلکہ ملک کے مختلف میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں داخلہ دلاکر
ان کی مالی حالت سدھارنے کے ساتھ ساتھ ریاستی ضرورتوں کو پورا کیا۔ جموں
اور سرینگر میں سنٹرل سیکریٹریٹ کی نئی اور شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ریاست کے
دونوں دارالخلافوں میں سڑکوں کو کشادہ اور گلی کوچوں کو پختہ کرنے پر توجہ
دی۔ ریاست میں سینکڑوں میل لمبی کچی اور پکی سڑکیں تعمیر کرائیں۔ پل بنوائے۔
اور آبپاشی کے لئے نہروں کا جال بچھادیا۔ ریاست میں پہلی بار میڈیکل کالج
اور ریجنل انجینئرنگ کالج کی بنیاد رکھی۔ ٹورسٹ ریسیپشن سنٹر، کھیلوں کے
اسٹیڈیم اور ٹیگور ہال تعمیر کرائے۔ ریاست میں زبانوں، آرٹ اور ثقافت
سے متعلق اکیڈمی (کلچرل اکیڈمی) قائم کی۔ ریاست میں کھیلوں کو بڑھاوا دینے
کے لئے فلم سٹاروں کے کرکٹ میچ کرائے۔ 'جشنِ کشمیر' کے نام سے ثقافتی و تمدنی
سرگرمیوں کا اہتمام کیا۔ اسلامیہ ہائی اسکول سرینگر کی عمارت جو آگ کے حادثہ
میں جل کر خاکستر ہو گئی تھی کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ جموں اور سرینگر میں ایم ایل اے
ہوسٹل جگہ جگہ پنچایت گھروں کی تعمیر، جموں شہر میں تالاب کھٹیکاں کی جامع مسجد
چرار شریف میں حضرت نورالدین نورانیؒ کی خانقاہ کے احاطہ کی وسعت اور اوقاف

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اسلامیہ کے انتظام و انصرام اُن کے یادگاری کارناموں کی لازوال مثالیں ہیں۔

بخشی صاحب کا ریاستی وزیر اعظم کے عہدے سے مستعفی ہونے کا معاملہ کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اگست سنہ ۱۹۶۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے کامراج پلان کے تحت کانگریسی وزراء کے استعفے طلب کیے۔ بخشی غلام محمد نے وزیر اعظم ہند کے مہتمم خصوصی کی حیثیت میں اُن استعفوں کی عمل آوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جوش و اعتماد کی اس فضاء میں بخشی صاحب نے بھی مستعفی ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ اس پر پنڈت جی نے اُن سے کہا کہ آپ کانگریس کے ممبر نہیں ہیں۔ بخشی صاحب نے جیب سے چونی (چار آنے یا ۲۵ پیسے کا سکہ) نکال کر کانگریس کی ممبر شپ حاصل کی حالانکہ نیشنل کانفرنس کے آئین کے تحت اس جماعت کا کوئی ممبر بیک وقت کسی دوسری جماعت کا ممبر نہیں ہو سکتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نے کامراج۔ مرارجی ڈیسائی۔ پرتاپ سنگھ کیرول، جگ جیون رام، چندر بھان گپتا، لال بہادر شاستری سمیت بخشی غلام محمد کا استعفیٰ بھی منظور کر کے انہیں اقتدار سے الگ کیا۔ بخشی صاحب کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ نئی دلی میں تین مورتی ہاوس کے سامنے اور سرینگر کے بازاروں میں ان کے حامیوں نے "پنڈت جی پھر سوچو" اور "استعفیٰ واپس لو" کے فلک شگاف نعرے لگائے لیکن نہ پنڈت جی نے پھر سوچا اور نہ بخشی صاحب کا استعفیٰ ہی مسترد ہوا۔ ردِ عمل کے طور پر بخشی صاحب کی خواہش اور اور ہدایت پر نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی نے خواجہ شمس الدین کو ریاستی وزیر اعظم کے عہدے کے لئے منتخب کیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر برائے نام ہی تھے، اصل طاقت بخشی صاحب کے ہاتھ میں ہی رہی۔

۲۷ دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء کی شب کو آثار شریف حضرت بل سے موئے مقدس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی گمشدگی کے سانحہ سے وادی کے لوگ سڑکوں پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نکل آئے۔ خواجہ شمس الدین کو بڑی لاچاری کے عالم میں وزارت عظمیٰ کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ فروری ۱۹۶۴ء کو جموں میں لال بہادر شاستری کی قیادت میں بخشی صاحب کی قیام گاہ پر نیشنل کانفرنس کی پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں بخشی صاحب کی تجویز پر خواجہ غلام محمد صادق نئے ریاستی وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ صادق صاحب نے اپنے پالیسی بیان میں فوری طور کئی اصلاحات نافذ کرنے کا اعلان کیا جن میں تحریر و تقریر پر عائد شدہ پابندیوں کو ہٹانا شامل تھا۔ ۸ اپریل ۱۹۶۴ء کو کشمیر سازش کیس اور حضرت بل قتل کیس جیسے مقدمے واپس لینے کا اعلان ہوا۔

ان واقعات سے ریاست میں خوشگوار حالات پیدا ہونے میں مدد ملی۔ لیکن عوامی حلقوں میں بخشی صاحب کیخلاف جذبات کم نہ ہوئے۔ اس بارے میں بخشی صاحب کی قطعی رائے یہ تھی کہ اس کے پس منظر میں صادق صاحب تار ہلا رہے ہیں۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو انتقال کر گئے۔ ان کی وفات سے قبل ہی بخشی صاحب اور صادق صاحب کے درمیان رسہ کشی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ بخشی صاحب نے ممبران اسمبلی کی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنا کر صادق حکومت کو اسمبلی سیشن میں عدم اعتماد سے گرانے کا پکا ارادہ کیا جس کا علم صادق صاحب کو اسمبلی سیشن کے پہلے ہی دن ہوا۔ اس حادثہ سے بچنے کے لئے صادق صاحب نے گورنر شری بھگوان سہائے کی مدد سے مرکزی حکومت کو اس امر پر راضی کر لیا کہ انہیں بخشی غلام محمد کو گرفتار کرنے کی اجازت دی جائے۔ مرکزی حکومت کی رضامندی سے اسی شب انہیں حراست میں لے کر ادھم پور کے تارا نواس (جیل) میں نظر بند کیا گیا اور ان کے دوسرے ساتھی بھی گرفتار کئے گئے۔ اسی صبح کو ایک اعلان کے ذریعہ کشمیر اسمبلی کا سیشن برخاست

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کیا گیا۔ صادق صاحب نے بھی ممبران اسمبلی کی وفاداریاں خریدنے کے لئے اپنے رفقاء کو مامور کیا۔ تا انکہ اسی بیچ بخشی صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ تین ماہ بعد ڈاکٹروں کی ہدایت اور مشورے پر وہ رہا کئے گئے۔

بخشی صاحب کو سیاسی سرگرمیوں سے دور رکھنے اور ذہنی طور الجھانے کے لئے صادق انتظامیہ نے بخشی صاحب اور اُنکی حکومت میں مبینہ بدعنوانیوں کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے آئینگر کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ کمیشن نے چھ ماہ کی مسلسل چھان بین کے بعد ایک ہزار صفحات پر مشتمل اپنی رپورٹ میں بخشی خاندان کے جملہ افراد کی جائداد کی تفصیل و تخمینہ پیش کیا۔ لیکن جب اس کے حاصل جمع پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ماسوائے اس کے میزان میں بخشی غلام محمد کو ریاستی اسمبلی کی کسی بھی نشست سے بحیثیت امیدوار کھڑا ہونے سے روکنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کمیشن کی تقرری کا غالباً صادق صاحب کا مدعا و مقصد بھی یہی تھا۔ کمیشن کو اُن تمام حکام کی امداد حاصل رہی، جو کبھی بخشی غلام محمد کے دست و بازو کہلاتے تھے ؎

آگ دی صیاد نے جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

خواجہ غلام محمد صادق کا مقابلہ کرنے کے لئے ۱۹۶۶ء میں بخشی صاحب نے بقول اکبر الہ آبادی ؎

کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو
جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو

اسی منظوم فارمولے کو آزمانے کے لئے روزنامہ نوائے کشمیر سرینگر سے جاری کیا۔ اخبار کی ادارت وقفہ وقفہ سے غلام محمد ڈار، صوفی غلام محمد اور ربدری ناتھ منٹو نے سنبھالی۔ اخبار میں صادق انتظامیہ پر کڑی نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صادق صاحب پر بھی حملے کئے جاتے تھے جنہیں صادق صاحب نہایت ہی متانت اور صبر و ضبط سے برداشت کرتے رہے۔ کشمیری پنڈت پر شوری ایجی ٹیشن کے دوران ریاستی حکومت نے سرینگر کے جن اخباروں کی اشاعت پر تین تین ماہ کی پابندی عائد کی "نوائے کشمیر" ان میں شامل تھا۔ پابندی کے اختتام پر اخبار دوبارہ شائع نہیں ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کے نظریوں میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے سٹیٹ پیپلز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ بخشی غلام محمد نے مجاہد منزل میں کانفرنس کی منعقدہ میٹنگوں میں پابندی سے شرکت کی اور برملا اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے ہندوستان سے ریاست کے الحاق کی حمایت کی۔

فروری ۱۹۷۱ء میں وسط المدتی پارلیمانی انتخابات میں بخشی غلام محمد کانگریس کے امیدوار کی حیثیت میں سری نگر کی نشست سے کھڑے ہوئے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے محاذ رائے شماری کی تنظیم نے شمیم احمد شمیم کو جو پہلے اننت ناگ سے کھڑے ہوئے تھے، کھڑا کیا اور ان کی حمایت میں بیگم شیخ محمد عبداللہ مولانا محمد سعید مسعودی اور خواجہ غلام محی الدین قرہ جیسے کہنہ مشق سیاستدان میدان میں آئے۔ اس معرکہ میں جہاں وزیر اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کی در پردہ حمایت شمیم احمد شمیم کو حاصل تھی وہاں پردیش کانگریس کے صدر سید میر قاسم نے دل کھول کر بخشی غلام محمد کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مولوی محمد فاروق نے حجاب در حجاب رہ کر اپنے حامیوں کو بخشی صاحب کو کامیاب کرنے کی ہدایت دی۔ انتخابی جلسے جلوس اور ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ ایسے ہی ایک انتخابی جلسے میں جو مہاراج گنج میں بخشی صاحب کے حامیوں نے منعقد کیا بخشی صاحب نے تقریر کرتے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوئے کہا :-

"آج جو لوگ میرے خلاف صف آرا ہوئے ہیں اور مجھے ہندوستانی نظریہ کا نقیب کہہ کر طعنہ دے رہے ہیں میرے بعد وہی لوگ ہندوستان کے حق میں سربکف ہو کر آپ کے سامنے آئیں گے لیکن تب میں نہ ہوں گا"۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ موئے مقدس کے سانحہ کے بعد جب کبھی بھی بخشی غلام محمد نے سیاسی سرگرمیاں شروع کیں۔ اُن کے مخالفین "اصلی ملزم کو پیش کرو" کا نعرہ لگا کر یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ موئے مقدس پر دست خیانت دراز کرنے میں بخشی صاحب کا ہاتھ ہے۔ مہاراج گنج کے اسی جلسہ میں بخشی غلام محمد نے واضح الفاظ میں یہی الزام مولانا محمد سعید مسعودی، مرزا محمد افضل بیگ اور خواجہ غلام محی الدین قرہ پر عائد کیا۔ میری یادداشت کے مطابق اس واقعہ کے بعد اس نعرے کے پہلے والے معنی بدل گئے اور یہ نعرہ اُن معنوں میں نہیں دیا جانے لگا جن سے بخشی صاحب کی تضحیک کا پہلو نمایاں ہوتا۔ انتخاب میں بخشی صاحب نے اپنی ہار کو صبر و شکر کے ساتھ قبول کیا۔ انہیں کشمیری عوام کے اس فیصلہ کا کوئی ملال نہ تھا۔ عارضۂ قلب نے بخشی صاحب کی سیاسی سرگرمیاں محدود کر دیں۔ بالآخر ۱۵ر جولائی ۱۹۷۲ء کی صبح ۱۱ بجے نئی دہلی میں تمام استقلال کے حامل اس سیاستدان نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اسی دن شام تین بجے انکی نماز جنازہ پولو گراؤنڈ سری نگر میں ۲۰ ہزار کے قریب فرزندانِ توحید نے ادا کی۔ نماز جنازہ میں اگر کسی نے شرکت نہیں کی تو وہ شیخ محمد عبداللہ کی ذات تھی۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر فاروق عبداللہ بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ان کے جنازے کا جلوس ڈل گیٹ، خانیار، نائید کدل، کلاشں پورہ سے ہوتے ہوئے ان کے آبائی مقبرہ خانقاہ معلی پہونچایا گیا۔ خانقاہ معلی کے مدِمقابل دریائے جہلم کے دوسرے کنارے پر کچھ لوگوں نے اُن کی وفات پر آتش بازی اور پٹاخے چھوڑے ۔ غالباً یہ وہ لوگ تھے جنہیں بخشی صاحب کے دورِ اقتدار میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا حالانکہ ارشادِ نبویؐ ہے کہ موت کے بعد تمام اختلافات ختم ہوتے ہیں"۔ اسی دوران میں نے لگ بھگ اٹھارہ سالہ ایک لڑکے کو خانقاہِ معلیٰ کی ڈیوڑھی کے سامنے والے چبوترے پر بخشی غلام محمد کے متعلق رکیک الفاظ کہتے سنا ۔ ڈیوٹی پر تعینات سی آئی ڈی انسپکٹر محمد شعبان میر نے مجھے بتایا کہ اس لڑکے کی ماں مسماۃ سارہ بیگم نے ۹ اگست سنہ ۱۹۵۳ء کو پولیس کی گولی سے اسی صحن پاک میں دم توڑا، اور اس لڑکے کو اسی صحن میں جنم دیا۔

بخشی غلام محمد کی ان تمام خوبیوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو بات انہیں ریاست جموں و کشمیر کے جملہ سیاسی رہنماؤں میں منفرد، ممتاز اور یکتا بناتی ہے وہ اُن کا دستِ سخاوت ہے ۔ ریاستی سیاست میں داخل ہونے کے ابتدائی ایام میں، جبکہ اُن کا شمار بھی غرباء میں ہوتا تھا، اپنے سے کم تر سیاسی ورکروں کی قلمے سخنے اور درمے مدد کرتے تھے۔ انہیں کسی کے کام آسکنے یا مدد کر کے خوشی ہوتی تھی ۔ اپنے دورِ حکومت میں انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر لینگر کھول رکھا تھا ۔ ان کی وفات پر ان کے مکان سے تقریباً تین سو راشن کارڈ ان لوگوں کو واپس کئے گئے جنہیں باقاعدگی سے ماہوار راشن خرید کر ان کے گھر بھیجا جاتا تھا ۔ اللہ مغفرت کرے بڑی خوبیوں کے مالک تھے ۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حواشی

۱۔ زیر نظر مضمون میں درج کچھ باتوں کے بارے میں میرے رفیق غلام رسول گڈھا (حسرت گڈھا) نے کہا کہ وہ بخشی خاندان کے بارے میں اچھی خاصی جانکاری رکھتا ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق بخشی خاندان کا تعلق اوبر (ٹنگمرگ) سے تھا جہاں سے وہ پتلی پورہ چھتہ بل منتقل ہوا۔

۲۔ بخشی صاحب کے والد کی شادی خانقاہ سوختہ کے بٹ کی بیٹی سے طے ہوئی اور وہ خانہ داماد بن کر وہیں رہنے لگے۔

۳۔ اُن کی ذات بٹ تھی۔ جنگ عظیم کے زمانے میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ وہ اسی پر اپنی بڑی بڑی مونچھوں کی وجہ سے "خان" کہلانے لگے اور یہی ذات ٹھہری۔

۴۔ بخشی صاحب کے ایک ہم درس، ہمعصر اور رفیق، ایم۔ اے رینہ، اپنے ایک مضمون "بخشی غلام محمد۔ خاکی و نوری نہاد"[ف] میں لکھتے ہیں کہ بخشی صاحب ہرگز اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بلتستان جانے کے حق میں نہیں تھے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے خانگی حالات بالکل ناتسلی بخش تھے۔ غربت اور تنگدستی سے اکثر عاجز رہتے تھے۔

۵۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سنہ ۱۹۲۳ء کے آس پاس کا زمانہ ہوگا۔ اس کی تائید ایم۔ اے رینہ کے مضمون سے بھی ہوتی ہے: "راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ سنہ ۱۹۲۹ء کی سردیوں میں بخشی صاحب لاہور میں تھے۔ کھادی بھنڈار کے کام سے دل برداشتہ ہو کر کسی اور دھندے میں روپیہ لگانا چاہتے تھے۔" (ادارہ)

۶۔ بخشی صاحب کے عیسائی مشنری سکول کے لئے منتخب کئے جانے کے بارے میں ایم۔ اے رینہ نے "شیرازہ" (اردو) جلد ۱۲، شمارہ ۲، ۳) میں اپنے مضمون "بخشی

ف۔ ملاحظہ ہو شیرازہ (اردو) ۔ جلد ۱۲، شمارہ ۲، ۳)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صاحب ۔ خاکی و نوری نہاد " میں ایک واقعہ کا یوں ذکر کیا ہے :

" ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسلامیہ ہائی سکول اور مشن سکول میں ہاکی میچ ہو رہا تھا دونوں طرف طلباء اپنے کھلاڑیوں کو شاباش کہہ رہے تھے ۔ اتنے میں چند طلباء نے ہوٹنگ شروع کی ۔ " ہیو دستا ۔ اسلامیہ سکو پچ آلہ ہن " کی آواز کے ساتھ چند ناشائستہ الفاظ بھی کہے گئے ۔ طرفہ یہ کہ اسلامیہ ہائی سکول کا کپتان محمد اسماعیل شال بہترین کھیل کا مظاہرہ کر رہا تھا اور مشن سکول پر دو گول کی برتری حاصل کی تھی ۔ جب کھیل کا وقفہ ہوا مشن سکول کے طلباء کو چاکلیٹ ، لیمن ، سوڈا وغیرہ ملے ۔ دوسری طرف اسلامیہ سکول کے منتظمین نے کشمیری قہوہ اور قیلم اپنے کھلاڑیوں کو چینی فنجانوں میں پیش کیا ۔ ہریالی میں الاچیوں کی بہتات تھی ۔ اسی لئے اسلامیہ سکول کی " آلہ ہن " مشہور ہوئی ۔ وقفہ میں جب پھر ایسی آوازیں بلند ہوئیں تو بخشی صاحب کو سخت غصہ آیا اور اپنے ہمنواؤں کے ساتھ ان طلباء پر یلغار کی اور انہیں خوب پیٹا ۔ یہ تماشہ مسٹر ٹسکو اور ان کے انگریز دوست بھی دیکھ رہے تھے ..... دوسرے روز علی الصباح سکول میں دعا وغیرہ کے بعد ہم سب کو جو بخشی صاحب کی پارٹی میں شامل تھے سکول کے تمام طلباء کے سامنے نام لے کر اسٹیج پر بلایا گیا ۔ ہم پر یہ الزام تھا اپنے سکول کی ہار پر خوشی منانا ، کلاس میٹوں پر حملہ کرنا اور مخالف سکول کی حمایت پر کمر بستہ ہونا ۔ جو کہ سکول کے آداب و لوازمات کی بنیاد کے خلاف ہے ۔ ہم سب تو چپ تھے بخشی صاحب نے برملا کہا کہ مخالف سکول پر گند اچھالنا " گالیاں دینا ، غیر مہذب الفاظ استعمال کرنا اور مذہبی تعصب کو ہوا دینا اگر کسی سکول یا ادارہ کی بنیاد ہو تو میں اس پر لعنت بھیجتا ہوں ۔ یہ حضرت مسیح کے فلسفۂ پیغام انسانیت کے سراسر خلاف ہے ۔ یہ الفاظ سن کر شنکر پنڈت ہیڈ ماسٹر نے سر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جھٹکا لیا اور مسٹر ٹنڈل بسکو نے تمام طلباء کو اپنی کلاسوں میں جانے کے لئے کہا۔ کذب و افترا، زور زبردستی کے خلاف بخشی صاحب کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ اس کا بہت اچھا ردِعمل ہوا۔ انگریز مشنری کے مبلغوں کی نظریں اسی وقت سے بخشی صاحب پر پڑیں۔ یہ انکی بہت خاطر تواضع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ فورتھ مائی (نویں جماعت) میں ہی مشنری نے ان کو لداخ، بلتستان کی تبلیغی مہم پر روانہ کیا۔ مسٹر بین ٹن بخشی صاحب کے خاص مہربان تھے۔ بین ٹن اس کرسچین مشن کے سربراہ تھے"۔ (ادارہ)

۷ حضرت صاحب کے مطابق وہ لداخ نہیں بلکہ ہشگر گئے تھے۔

۸ ایم۔ اے رینہ نے اپنے مضمون میں اس ضمن میں لکھا ہے:

"اس زمانہ میں بخشی صاحب نے اپنے ایک دوست اور رشتہ دار کو جو چھٹی لکھی تھی اس کا مفہوم یہ تھا کہ "بوٹے" اِدھر اُدھر کرسٹان بن رہے ہیں مگر میں اپنے مسلمان بھائیوں کو دین پر قائم رہنے کی تلقین کر رہا ہوں اور میرا مشن کامیاب ہو رہا ہے۔ اس چھٹی نے بخشی صاحب کے دوستوں اور رشتہ داروں میں "دیدار" کی کیفیت پیدا کی۔ ہر ایک اس کو دیکھنے آتا اور دیکھنا چاہتا کیونکہ یہاں عام افواہ تھی کہ بخشی صاحب کرسٹان بن کر اب اس کی تبلیغ کر رہے ہیں..... اور آخر بخشی صاحب تنومند جوان کی طرح گھر لوٹے۔ مشنری کے ساتھ ان کے تعلقات کلیتاً ختم ہوئے۔ (ادارہ)

۹ اس سے بہت پہلے آ گئے تھے۔

۱۰ ایم۔ اے رینہ لکھتے ہیں:

"سنہ ۱۹۲۵ء میں سری نگر میں کھادی کا کچھ چرچا ہونے لگا تھا اور کانگریس نے برطانوی ہندوستان میں سودیشی تحریک شروع کی تھی۔ بخشی صاحب فوراً بائیکاٹ کی اس

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تحریک میں شامل ہو گئے اور کھادی بھنڈار میں ملازمت کا موقعہ ملا ۔ (ادارہ)

۱۱؎ ایم ۔ اے رینہ کے مطابق جولائی ۱۹۳۱ء میں بخشی صاحب کلکتہ میں تھے ۔ جوں ہی انہوں نے سنا کہ مادرِ وطن میں طاغوت خون کی ہولی کھیل رہا ہے، فوراً واپس آگئے اپنے ماموں، والد اور والدہ کی اجازت سے اس آگ میں کود پڑے ۔

۱۲؎ اس واقعہ کا ذکر ایم ۔ اے رینہ نے یوں کیا ہے :

"۲۴ ستمبر ۱۹۳۱ء کی رات کو اپنے رفیقوں کے ساتھ جامع مسجد پہنچے ۔ رات کو ہلکی بارش ہو رہی تھی ۔ اسی سرد و خشک فضا میں نہائے اور نماز پڑھی ۔ ربِ کعبہ کی طرف دست دراز کئے اور اشک جاری ہوئے ۔ شاید اس وقت بخشی صاحب نے اپنے مالک حقیقی سے جو دعا مانگی تھی، قبول ہوئی ۔ اس موقعہ پر دوستوں میں سے صرف راقم الحروف ہی ان کے ساتھ رہا ۔ صبح سویرے لوگوں کے جم غفیر میں بخشی صاحب اسٹیج پر آئے اور تقریر کی ۔ اس وقت تقریر سے زیادہ شخصیت کی طرف ہی دھیان رہتا تھا ۔ کوئی کہتا تھا کہ گاندھی ہے، کوئی گلہ بخشی اور کوئی بہاری پورہ کا ماموں بخشی پکارنے لگا ۔ سب کی زبان پر آفرین و مرحبا کے الفاظ تھے ۔ اور جذبات بھرے لہجہ میں کہتے تھے کہ واقعی یہ نوجوان لڑکپن سے بہادر اور نڈر تھا ۔ آج بھی غازیوں کی طرح ظالموں اور جابروں کو للکار رہا ہے ۔ اس کے بعد "گاندھی" اور دوسرے تمام نام حذف ہوئے اور خوش بخشی کے لئے لفظ بخشی عام ہوا ۔ (ادارہ)

۱۳؎ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں آل جموں و کشمیر مسلم پولیٹکل کانفرنس کے قیام کے بعد اس کے پہلے سالانہ اجلاس کا اہتمام، ہزاروں ڈیلیگیٹوں کے لئے طعام و قیام کا انتظام، جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام، اطلاعات اور طبی سہولیات کا انصرام ۔ یہ سب بخشی صاحب نے کچھ اس طرح انجام دیا کہ سبھی عش عش کر اٹھے ۔ ایم اے رینہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ جب بھی تحریک کو کسی مشکل سے دوچار ہونا پڑا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تو اس وقت بخشی سینہ سپر ہو جاتا۔ اس نے مزدور تحریک منظم کی کشمیر لیبر یونین کی داغ بیل ڈالی، کشمیر موٹر ڈرائیورس ایسوسی ایشن، ٹانگہ ڈرائیورس ایسوسی ایشن کے موجد بھی بخشی صاحب ہی تھے۔

۱۴؎ بخشی صاحب نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کے تحت انقلابی تحریک کی قیادت کی تھی اور انہیں دو سال کی سزا ہو گئی تھی۔ رہائی کے بعد سری نگر میں اُن کا پرتپاک استقبال ہوا اور سپاسنامہ میں انہیں پہلی بار "خالد کشمیر" کہا گیا۔ (ادارہ)

۱۵؎ ایم۔ اے رینہ کے مطابق بخشی صاحب کو گانا سننے کا بہت شوق تھا اور گانے کی محفلوں میں اکثر ان کے ساتھ جایا کرتے۔ ایک ایسی ہی محفل کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"مشہور صوفی شاعر احمد بٹہ واری مرحوم نے عرس خواجہ غریب نواز اجمیری کی تقریب پر حیدر پورہ میں مجلس سماع منعقد کی تھی۔ وہ خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاتے تھے۔ رباب اور سارنگی میں یگانگت نہ تھی۔ بخشی صاحب نے کسی کے کان میں یہ بات کہہ دی۔ بٹہ واری صاحب نے فرمایا کہ یہ نوجوان کیا کہتا ہے۔ ایک شخص جس کا نام کبیر کچلو تھا نے عرض کی: "یہ کہتا ہے کہ سارنگی اور رباب ناراض ہیں" بٹہ واری صاحب نے بخشی صاحب کو اپنے پاس بلایا، اس کے ماتھے کو چوما۔ اور فرمایا جب زیر و بم الگ ہوں تو دم فضول ہے۔ ایک وقت آئیگا جب تمہارا زیر و بم ایک ساتھ چلے گا مگر سرگم کو قائم رکھنا"

کلام محمود گامی میں لفظ "وصل" کی تکرار پر بٹہ واری صاحب کی آنکھوں سے اشک جاری ہوئے۔ میں نے دیکھا کہ بخشی صاحب بھی رو رہے ہیں۔ جب پوچھا تم کیوں رو رہے تھے؟ جواب دیا کہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ عجیب رقت طاری ہوئی۔ ویسے بخشی صاحب بے حد رقیق القلب تھے اور معمولی فسانہ فراق و

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہجر سننے کے بعد آنکھیں پُرنم ہوتی تھیں۔

○

کتابیات:

"کشمکش" - چودھری غلام عباس خان

"مائی ڈیز ود نہرو" - بی۔ این ملک

"داستان حیات" - سید میر قاسم

"آتش چنار" سوانح حیات شیخ محمد عبداللہ - محمد یوسف ٹینگ

"تحریک حریت کشمیر" اول۔ دوم۔ سوئم - رشید تاثیر

"نوائے کشمیر" - غلام سرور نگار

"ولیعہد" ڈاکٹر کرن سنگھ

روزنامہ آفتاب، روزنامہ ہمدرد، روزنامہ کشمیر ٹائمز جموں، روزنامہ مارتنڈ، ہفت روزہ محافظ، ہفت روزہ کاروان، ہفت روزہ رنبیر جموں، ہفت روزہ عوامی دور جموں، ہفت روزہ کشمیر ٹرانسپورٹ جموں

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غلام محمد شاد

مولوی محمدؐ انور شوپیانی

کشمیر کی مذہبی، سماجی اور ادبی تاریخ میں مولوی محمد انور صاحب مرحوم ایک اہم ترین مقام رکھتے ہیں۔ گروہی تعصب اور کٹھ ملاؤں کی ہٹ دھرمی اور نفاق نے انور صاحب کی عبقری شخصیت کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی کوشش تو بہت کی لیکن آخر کار یہ پردہ سرکنے لگا۔ صوفی احمد مسلم صاحب نے تاریخ اہلحدیث جموں و کشمیر لکھ کر واقعات کو قلم بند کر کے ان کو لوحِ قلب و ذہن سے محو ہونے سے بچایا۔ لیکن اپنی تاریخ میں وہ بھی مرحوم انور صاحب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ حقیقتاً "تاریخ اہل حدیث" مولوی محمد انور صاحب کی زندگی کی تاریخ ہونی چاہئے تھی جبکہ انور صاحب پر نبسزار شاہ اور سید حسین بلطخو حاوی اور مسلط ہوئے لگتے ہیں۔ ان ہر دو موخر الذکر اصحاب کا کارنامہ کیا ہے، سوائے اس کے وہ حکمت عملی اور احسن طریقہ پر مسلک کی دعوت نہیں دے سکتے تھے، نہ دے سکے جبکہ ایک ایسے پُر آشوب زمانے میں، جب اندھیروں کے اجارہ دار دین کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے، انور صاحب مرحوم نے ان قدیم اندھیروں میں اُجالا کرنے کا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عزمِ مصمم کیا۔ اندھیروں میں اُجالا کرنے والے بار بار پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ انور صاحب انہی نایاب شخصیتوں میں سے تھے کہ کشمیر میں معدودے چند ہی سماجی مصلحین پیدا ہوگئے ہیں۔ میرواعظ رسول شاہ صاحب ناخواندگی کی جہالت کو دور کرنے اور تعلیمی انقلاب برپا کرنے کے سلسلے میں' انسدادِ قحبہ گری کے سلسلے میں مرحوم خواجہ محمد سُبحان حجام دیکھائے رسوم و اعتقادات کی بیخ کنی اور عقیدہُ توحید کی ہمہ گیر نشر و اشاعت میں مولوی محمد انور شوپیانی صاحب اور عام دینی' تعلیمی اور سیاسی بیداری میں مرحوم میرواعظ مولوی محمد یوسف شاہ صاحب کے نام ہمیشہ درخشندہ' تابندہ' پائندہ اور زندہ و جاودان رہیں گے۔

مولوی محمد انور صاحب شوپیانیؒ کا اصلی نام محمد انور بٹ عرف شیر خان تھا۔ وہ ذات کے بٹ زمیندار تھے۔ بعد میں اسلام کی پُر خلوص خدمت انجام دیتے دیتے لوگ ان کو مولوی اور شاہ کہنے لگے اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے اپنے ایک عدالتی بیان کے مطابق ۱۲۷۴ھ (مطابق ۱۸۵۸ء) ان کا سالِ ولادت ہے۔ؔ وہ شوپیان کے ایک نزدیکی گاؤں کنی پورہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ محمد مختار بٹ تھا۔ ان کا آبائی پیشہ کاشتکاری اور مزدوری تھا۔ عیال دار ہونے کی وجہ سے نہایت عُسرت کی اور مفلوک الحال زندگی گذارتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ بذاتِ خود اپنے بچوں کی کوئی خاص تعلیم و تربیت نہیں کر سکے۔

مولوی محمد انور کے بڑے فرزند مرحوم مولوی عبدالغنی کا بیان ہے کہ انور صاحب کے جدِ اعلیٰ ایک برہمن پنڈت تھے جو مائیسمہ بازار سرینگر کے باشندے تھے مولوی عبدالغنی صاحب نے اپنے خاندان کے ابتدائی حالات نظم میں اس طرح بیان کئے

ؔ تاریخ اہلِ حدیث جموں و کشمیر از صوفی احمد مسلم صفحہ ۲۶۵۔ محمد ایوب بیتاب شوپیانی نے "نیری پوشش" نامی کتابچے میں انور صاحب کا سالِ ولادت ۱۲۶۹ھ لکھا ہے جو غلط ہے۔ "نیری پوشش" صفحہ ۱۲٬۱۱٬۱۰

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیں :-

چھہ نومسلم سیٹھاہ اقوام کشمیر ۔۔۔ تمے گئے شیخ، بٹ، پنڈت، وانی، ریشی، میر
یتھے کنی سانہ قومکی اُسے تکو تام ۔۔۔ چھُ واتن رشتہ نومسلم جدس تام
سُہ برہمن قومہ سِتے پنڈت زمہ اوس ۔۔۔ بسن ورکو چھِ مالیسمہ اوس
بہ وقت شیخ اُنمت تمی چھُ ایمان ۔۔۔ بصدق دِل سپنمت رُت مسلمان!
عطا فرزندہ اکھ تس گو ورزدرگاہ ۔۔۔ رسُل بٹ ناو کورنس یا رسول شاہ
حق تس آسی دِلی متی نور الابصار ۔۔۔ ترے فرزند سنخی، صالح تہ مختار
سنخی، صالح سپنی در طفلگی فوت ۔۔۔ مگر مختار تا پیری زبر ووت
ژِ فرزندہ منزم احسن تہ اکبر ۔۔۔ محمد زیٹھ چھہ کنس ناو انور
سپاہا اکھ محمد خان سُہ ناشاد ۔۔۔ نہ تس صلبی پنن کینہہ اوس اولاد
تمی زارہ کرتھ انور منگتھ نیُو ۔۔۔ کورُن تس شیر خان ناوا پنن ہیُوٗ

(مفہوم :- کشمیر کی اکثر قومیں نومسلم ہیں جنمیں شیخ، بٹ، پنڈت، وانی، ریشی اور میر شامل ہیں ۔ اسی طرح ہماری قوم کا رشتہ بھی نومسلم جد تک پہنچتا ہے ۔ وہ برہمن پنڈت تھا اور مالیسمہ میں رہتا تھا، حضرت شیخ نورالدین نورانی رح کے وقت میں اس نے اسلام قبول کیا - اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام رسول بٹ یا رسول شاہ رکھا گیا - اس کے تین بیٹے تھے سنخی، صالح اور مختار ۔ سنخی اور صالح بچپن میں وفات پا گئے ۔ مختار کے چار بیٹے ہوئے احسن، اکبر، محمد اور انور ۔ انور کو ایک سپاہی محمد خان نے لے پالک بیٹا بنایا اور شیر خان نام رکھا) ۔

تاریخی لحاظ سے یہ بیان پایہ ثقاہت اور استناد سے بہت دور اور متضاد ہے ۔ اس میں کوئی ربط و تسلسل اور تاریخی صداقت نہیں ہے ۔ شیخ العالم رح کے وقت میں کوئی (نامعلوم) برہمن مسلمان ہو گئے ۔ اس کا نام نامعلوم ہے ۔ اس کے بیٹے رسول بٹ کے بیٹے کا بیٹا انور ہے ۔ گویا پانچسو سال کے زیادہ عرصہ میں صرف تین پشتیں گذر

رشتہ نامہ لوشو ؛ صہ ۱۱، ۱۲، ۱۳ -

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جاتی ہیں۔ یہ بات عقل و منطق کے دائرہ میں کسی بھی صورت میں نہیں آتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ برہمن اگر بٹ تھا تو مسلمان ہونے کے بعد شاہ کیسے بن گیا؟ ہمیں شیخ نورالدین نورانیؒ کے عہد میں "شاہ" نامی کوئی ذات نہیں ملتی ہے نہ اس کا کوئی نشان۔ برہمن کو نومسلم ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ شیخ کہہ سکتے تھے۔ تیسری بات یہ ہے کہ "میر" ذات نومسلم قوموں میں کبھی شامل نہیں رہی۔ ذات "میر" سادات کرام کی آمد سے صرف سادات کے ساتھ ہی مختص رہی۔ بہت بعد میں باقی لوگ اسے استعمال کرنے لگے۔[1]

محمد مختار بٹ غریب کاشتکار تھے ہی جب کسی گمنام سپاہ محمد خان نے انور کو لے پالک بنانا چاہا۔ تو مختار بٹ نے انور کو بخوشی سپاہ کے حوالے کیا۔ محمد خان نے انور کا نام شیر خان رکھ دیا۔ اس لئے بعد میں انور صاحب کو اس کے دشمن حقارت سے "شیر بٹ"[2] کہتے تھے۔

دراصل انور صاحب کی پوری ابتدائی زندگی گمنامی کے اندھیروں میں چھپی رہی۔ انکی ابتدائی زندگی کے بارے میں کوئی واضح شہادت اور یقینی بات نہیں کہی جاسکتی ہے۔ انور صاحب بچپن میں بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کا کام بھی کرتے تھے۔ تاریخ اہلحدیث جموں و کشمیر کے فاضل مولف صوفی احمد مسلم صاحب بھی اس بارے میں مبہم بیانات کے علاوہ کوئی واضح واقفیت بہم نہیں پہنچا سکے ہیں۔[3] مزید برآں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ محمد خان کہاں کا تھا؟ فوج میں سپاہ تھا، یا پولیس میں؟ اور بعد میں اس کا کیا ہوا؟ کہاں گیا؟ قدرتی بات ہے کہ انور کو لے پالک بنانے کے بعد اس نے انور کو بھی اپنی ہی ڈگر پہ چلایا ہوگا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ انور صاحب اس کے ہاں کتنا عرصہ

---

[1] مغلوں کے نظام سلطنت میں بہت سے عہدے تھے جن میں میر آخور، میر منشی، میر عدل، میر آب وغیرہ بھی تھے انکے لاحقے دورِ زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئے۔ بعد میں صرف "میر" رہا۔ اب اسی قسم کی ذاتیں کشمیر میں نظر آتی ہیں۔ [2] نیری پوش ص ۱۴ [3] تاریخ اہل حدیث ص ۲۰۴

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رہے اور بعد میں وہاں سے کیسے اور کیوں کر واپس اپنے گھر آگئے؟ اس دوران بہت عرصہ گذرا ہوگا۔ بہرحال ان کی ساری ابتدائی زندگی گمنامی اور عسرت میں بسر ہوئی۔ اُن کے مشہور ہوجانے کے بعد جیسا کہ ہر ایک عبقری اور نامور شخصیت کے ساتھ ہوا ہے، شجرہ بنانے کی فکر پیدا ہوگئی اور اس کے لئے "تحقیقیں" تراشی گئیں (حتیٰ کہ جناب علامہ اقبالؒ بھی اس کمزوری کے شکار ہوگئے اور تو اور علامہ انور شاہ لولابی کے بارے میں بعد میں بتایا گیا کہ وہ سید تھے)۔

اسلام نے انسانی فضیلت اور قدر و منزلت کی بنیاد صرف تقویٰ کو قرار دیا ہے[1]۔ انور صاحب نہایت متقی اور پرہیزگار عالم دین اور مبلغ پیغام رسالت تھے۔ یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی وجہ سے وہ اللہ کے ہاں معزز بن گئے اور اس کی مخلوق میں بھی انہوں نے عزت پائی۔

زبانی روایت کے مطابق انور صاحب نے مقامی آخون صاحبان اور ملاؤں کے "ژانٹہ ہال" (گھریلو مدرسہ) میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ صوفی احمد مسلم صاحب کا بیان ہے کہ تفسیر و حدیث کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انور صاحب نے پنجاب کے ایک مولوی محمد یعقوب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی محمد یعقوب متواتر کشمیر آتے رہے اور یہیں پر انور صاحب نے اُن سے کسب علم کیا[2]۔ یہ بیان محل نظر ہے۔ انور صاحب کا بچپن اور جوانی کے ابتدائی ایام عالم گمنامی میں گذرے۔ انہیں کہاں سے مولوی محمد یعقوب ملتا؟ اور وہ مولوی صاحب خواہ مخواہ متواتر کیوں کشمیر آتے؟ حقیقت یہ ہے کہ انور صاحب بچپن میں سیاہ محمد خان کے ہاں کچھ عرصہ رہ کر عہد شباب میں قدم رکھتے ہی پنجاب مزدوری کرنے کے خیال سے بھاگ گئے۔ چونکہ وہ ذاتی طور پر ذہین تھے اور قدرت نے ان کی بہتر رہنمائی

---

[1] ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (القرآن) [2] تاریخ اہلحدیث ص ۲۶۴

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کی ۔ وہ اہلِ حدیث مسلک کے علماء کے حلقے میں لغفتہ "چلے گئے" اور وہیں سے انہوں
نے جوانی کے آٹھ طویل سال گذارے اور یہیں پر انہوں نے علم تفسیر و حدیث حاصل
کیا ۔ اس زمانے میں پنجاب میں خصوصاً امرتسر اور لاہور ان خصوصیات کے لئے
مشہور تھے ۔ امرتسر تو علمی بحث و مباحثہ (خصوصاً مناظرہ بازی کے لئے) خاص
مشہور تھا جہاں حضرت مولانا ثناء اللہ ابن خضر جو (کشمیری الاصل) امرتسری
مسلک اہلِ حدیث کے زبردست عالم و مبلغ تھے ۔ ان سب حالات نے انور صاحب
کی علمی تشنگی کو دور کیا اور ان کے ذہن و قلب کو علم قرآن و حدیث سے جلا بخشی ۔

پنجاب سے واپسی کے بعد انور صاحب شوپیاں واپس آگئے اور یہاں
شوپیاں میں وہ مسلک اہلِ حدیث کی تبلیغ و ترویج میں ہمہ تن مصروف ہو گئے ۔
اس کے بعد حادثاتی طور پر انور صاحب کو سید حسین بلخی صاحب سے مزید
استفادہ کا موقعہ مل گیا ۔ موخر الذکر کو اہلِ حدیث مسلک کے خیالات رکھنے کی
بنا پر ایک سرکاری حکم کے ذریعہ شہر بدر کیا گیا تھا ۔ اس دوران انور صاحب
کی شہرت سرینگر تک سفر کر چکی تھی ، بلخی صاحب نے ہم خیال ہونے کی وجہ سے
شوپیاں جا کر انور صاحب کے ہاں پناہ لی [1]

انور صاحب بذاتہ فطرتاً بے انتہا ذہین و فطین اور زیرک و دراک تھے ۔
انہوں نے خود اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ کوئی عالم متبحر نہیں تھے [2] لیکن
علم قرآن اور حدیث کے ساتھ گہرے شغف اور عشق رسول ؐ نے ان کے لئے دین
فہمی کی راہیں آسان بنا دیں ۔ یہی شغف اور بحر علمائے کی صحبت کیمیا اثر ہی اُن
کے لئے راہ بر بن گئے ۔

اس بات کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اہلِ حدیث مسلک کا زیادہ تر

---

[1] تاریخ اہلِ حدیث صفحہ ۹۷ اور صفحہ ۲۶۴ [2] تاریخ اہلِ حدیث صفحہ ۱۸۱

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

زور عقیدۂ توحید پر مضبوطی کے ساتھ جم جانے پہ رہا ہے۔ کشمیر میں اس مسلک کی آمد سے بہت پہلے ہی میرواعظ خاندان نے عقیدۂ توحید اور ترویج سنت کو کشمیر میں ہمہ گیر تحریک کے طور پر اپنی مسلسل اور بے لوث تبلیغ سے عام مسلمانوں کے دلوں میں راسخ کرنا شروع کیا تھا۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولوی صدیق اللہ (ترالی) سے لے کر مولوی محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم تک عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور رسومات شرکیہ و قبیحہ کی بیخ کنی میرواعظین کی تبلیغی مساعی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ دراصل ان ہی اصحاب کی تبلیغی مساعی نے اہل حدیث مسلک کی آبیاری کے لیے زمین ہموار کی۔ البتہ یہ بات بلا خوف و تردد کہی جا سکتی ہے کہ کشمیر، لداخ، کرگل، ڈوڈہ اور کشتواڑ کے علاقوں میں مسلک توحید و سنت کو پہنچانے والے مولوی محمد انور شوپیانی ہی تھے۔ وادی میں وہی اس کے اولین بانی کار ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے پنجاب سے اپنی واپسی کے بعد اولاً شوپیان اور اس کے ملحق علاقوں میں دین خالص کی تبلیغ و ترویج کے لئے اپنی انتھک کوششیں شروع کیں۔ اور اس کے بعد انور صاحب نے ہی طول و طویل سفر کر کے لداخ، ڈوڈہ، کشتواڑ اور کرگل وغیرہ میں توحید کا ڈنکا بجایا۔ ان کا خلوص اور جذبۂ للہیت آخر کار بار آور ثابت ہوا۔ اسی دوران شہر سرینگر میں سید حسین لسطخو صاحب اور مرحوم سبزار شاہ صاحب نے اس مسلک کی تبلیغ و تشہیر شروع کر دی تھی۔ سبزار شاہ صاحب مرحوم تو منیاری کی چیزیں گلی کوچوں میں پھیری لگا کے بیچتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تبلیغ بھی کرتے تھے۔ سید حسین لسطخو صاحب عالم تو ضرور تھے لیکن جوشیلے تھے اور اس وجہ سے وہ حکمت عملی کے ساتھ اپنی تبلیغی کوششیں جاری نہ رکھ سکے۔ مسلک توحید و سنت کو کشمیر میں مولوی محمد انور مرحوم نے ہی ایک systematic اور احسن طریقہ پر عام مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ ان کا اپروچ منطقی، نفسیاتی اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

استدلالی تھا۔

ابتدائی دور میں انور صاحب شوپیان، منز گام (ناروائو) کولگام، کچھ ڈورو، ناسنور، پاری پورہ، حسن پورہ اور لوٹہ کوٹ وغیرہ علاقوں میں تبلیغی دورے کرتے رہے۔ منز گام میں وہ دو سال تک تسلسل کے ساتھ رہے۔ ان علاقوں میں وہ اللہ کے فضل و کرم سے خاصے کامیاب رہے۔ بعد ازاں وہ سرینگر بھی آتے رہے۔ اسی عرصہ میں وہ لداخ کے دشوار گذار تبلیغی سفر پر گئے۔ وہاں پر سرینگر کے نامور تاجر محمد شہداد صاحب کو اپنے مسلک کا پیرو بنایا۔ لداخ میں مخالفوں نے غلط الزام لگا کر انور صاحب کو جیل بھی بھجوادیا۔ لیکن انور صاحب بفضل تعالیٰ باعزت بری ہو گئے۔ لداخ میں دو سال تک رہنے کے بعد وہ سری نگر سے ہوتے ہوئے شوپیان واپس آگئے اور تبلیغی سرگرمیوں میں زور و شور سے منہمک رہ گئے۔

اب مخالفین بھی کمربستہ ہو گئے تھے اور اکثر زدوکوب کرنے لگے تھے۔

غلط الزامات کے تحت ایک بار پھر آپ کو اپنے چند ساتھیوں سمیت حکومت کے کارندوں کے ذریعہ گرفتار کروایا اور اس کے بعد آپ پر مقدمہ دائر کیا گیا لیکن اس میں بھی آپ باعزت بری ہو گئے اور مستقلاً سری نگر منتقل ہو گئے۔ اسی دور میں جب اہل حدیث مسلک کے ساتھ وابستہ حضرات نے خواجہ عبدالعزیز ڈانی صاحب[ؒ] مرحوم ساکن اردو بازار تاشوان کے مکان کے صحن میں نماز جمعہ کے قیام کا بندوبست کیا تو اولین خطیب، واعظ اور امام مولوی محمد انور مرحوم ہی مقرر ہوئے۔ ان کے بغیر یہ ذمہ داری اور کون نبھا سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے انجمن غرباء اہلحدیث کے نام سے ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد بھی ڈالدی جو اب تک قائم ہے۔ اس انجمن کے

ؒ تاریخ اہل حدیث ص ۱۱۱ — مرحوم علی محمد ہاری کے بیان کے مطابق مولوی انور صاحب صحن میں ایک کنشتر یعنی انگیٹھی پر کھڑا ہو کے خطبہ دیتے تھے مخالفین اس وجہ سے اس کو "کنشتر خطبہ" کہتے تھے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

انتظام کے تحت آپ کی اور آپ کے فرزند عبدالغنی صاحب کی تصانیف طبع ہوتی رہیں۔ اس پورے عرصے میں انور صاحب نے اپنی تقویٰ شعاری اور تبلیغی مساعی سے ہزارہا بندگان خدا کو صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔ ان کی پوری شعوری زندگی تبلیغی اور عملی جہاد کی زندہ و تابندہ تفسیر تھی اور مختلف خانوں میں بٹی ہوئی نہیں تھی۔ انکی زندگی میں یک سوئی اور یک رنگی تھی اور انکی ساری جدوجہد اور رنگ و تاز کا محور تبلیغ توحید اور اشاعتِ حدیث رسولؐ رہا۔ وہ صبغتہ اللّٰہی سے وہ بیک وقت مبلغ بھی تھے اور واعظ بھی، مناظر بھی اور مفتی بھی تھے اور شعر و شاعری سے بھی انہوں نے صرف قرآن و حدیث کی نشر و اشاعت کا کام لیا۔

مولوی انور مرحوم زیرک و دراک ہونے کے ساتھ ساتھ بے انتہا متحمل مزاج، خوش اخلاق اور انسانی فطرت کے نبض شناس بھی تھے۔ وہ کسی بھی صورت میں مغضوب الحال نہیں ہوتے تھے۔ احسن طریقہ پر افہام و تفہیم میں یقین رکھتے تھے۔ ظریف، حاضر جواب اور بذلہ سنج بھی تھے۔ اپنے مسلک کی وکالت کرتے وقت کٹ حجتی، ضد اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے تھے۔ میرے والد مرحوم خواجہ عبدالرحمان صاحب نے ایک دن انور صاحب سے استفسار کیا کہ جو لوگ مرحوم بزرگان دین اور اولیاء کرام سے سوءِ ظن رکھتے ہوں کیا وہ بھی اہل حدیث کہلائیں گے۔ انور صاحب نے فرمایا کہ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہوسکتے۔ والد صاحب نے ایک بار ایک واقعہ سنایا کہ انور صاحب جب بھی بہوری کدل سے جاتے تو ایک قصائی زور زور سے انور صاحب کا نام لے کر بدزبانی کرتا، لیکن انور صاحب برابر قصائی کو السلام علیکم کہہ کر گذر جاتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن قصائی اچانک دکان سے اٹھ کر انور صاحب کے قدموں پر آ گرا اور معافی مانگنے لگا۔ اس کے بعد لوگ اس قصائی سے ڈرتے تھے کیوں کہ وہ مسلکِ توحید و سنت میں شامل ہوگیا تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

انور صاحب نہایت ہی سادہ زندگی گذارتے تھے۔ روکھا سوکھا جو کچھ ملتا کھا لیتے۔ فاقہ مستی میں خوش رہتے۔ طویل تبلیغی سفروں میں ستو اور گڑ پر قناعت کرتے تھے۔ موٹا اور کھردرا لباس پسند خاطر تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کوٹ کے اوپر بہت بڑا اسکٹ پہنتے تھے۔ صفائی کو بہت پسند کرتے تھے اس لئے اکثر اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔ مفلوک الحال ہونے کے باوجود زبردست خوددار تھے۔ دل کے غنی اور متوکل علی اللہ تھے ؎

نیم نانے گر خورد مردِ خدا ئے — بذلِ درویشان کند نیمے دگر

اُن کی پُوری زندگی اسی شعر کی تفسیر تھی۔ حق بات کہنے سے نہ شرماتے تھے نہ ڈرتے تھے۔ سنت کی تبلیغ میں پرجوش تھے۔ لیکن سیاسی جھمیلوں اور طرفداریوں سے دور رہتے تھے۔

کشمیر کے واعظوں میں (بہ استثنائے میرواعظ خاندان۔ مولوی محمد یوسف شاہ تک) ایک اہم کمزوری یہ رہی ہے کہ وہ کسی خاص موضوع پر مسلسل تقریر نہیں کر سکتے ہیں۔ اُن کے وعظ مختلف مسائل کی توضیحات کی کھچڑی ہوتی ہے لیکن میرواعظین خصوصاً مولوی محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ وہ دین کے گوناگوں عناوین اور موضوعات پر باقاعدہ "وعظ مجلسیں" ترتیب دے کر انہیں دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے تھے۔ مولوی محمد انور مرحوم کی تبلیغ کے خاص موضوع توحید باری تعالیٰ، اہمیت احادیث رسولؐ اور مذمت تقلید جامد رہے ہیں۔ وہ پرجوش داعی تو تھے ہی، اس لئے انہوں نے بڑے جامع انداز میں مسلسل طور پر نئے نئے اسالیب اور طریقوں کے ساتھ انہی موضوعات پر اپنی ساری توجہ اور تمام قوٰی مرکوز کر دئے۔ ان موضوعات کے بارے میں انکی واقفیت اور علم وسیع تھا اگرچہ وہ انکساری کی وجہ سے اپنے آپ کو معمولی وعظ خواں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کہتے تھے۔ انور صاحب کی تبلیغ میں کشمیری مسلمانوں کی سماجی برائیوں کا خاتمہ ایک لازمی جُز کے طور پر شامل تھا۔ دو خامیاں تو بہت بڑی تھیں۔ ایک عقیدۂ توحید کے فہم کی کمی اور پھر سمجھ کر اس پر مضبوطی سے جم جانا، دوم ہنود کی تقلید میں مقابر اور اکابر پرستی۔ اس ضمن میں وہ اوہام پرستی، غیر اسلامی رسم و رواج، عرائس کے موقعوں پر اختلاطِ مرد و زن کے خلاف بھی مسلسل تحریری، تقریری اور عملی جہاد کرتے رہے۔ اس میدان میں انور صاحب کو سماجی اور مذہبی مُصلح کی حیثیت میں ایک ہمہ گیر اولیت حاصل ہے۔ اسی کام میں انور صاحب نے شعر و شاعری کو بھی خوب استعمال کیا۔ وہ کشمیر کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری کو ایک نظریہ، ایک مسلک اور ایک عقیدہ کے پرچار کے لئے اپنی جولان گاہ بنایا۔ انور صاحب کی تقلید میں بعد میں بہت سے شعراء نے ادب کو نظریاتی پروپگنڈہ کے لئے استعمال کیا۔ انور صاحب نے صحیح اسلامی انداز میں قرآنی قصص پر مبنی مثنوی یوسف زلیخا، معراج نامہ اور پھر خالص تاریخی حیثیت میں، جنگ نامہ بدر اور جنگ نامہ احد وغیرہ لکھ کر کشمیری مسلمانوں کی مجلسی تفریحات میں بھی توحید و سُنّت کی تبلیغ کا کام انجام دیا۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کشمیری عورتیں جو "وَنہ وُن" (شادی بیاہ کے گیت) گاتی ہیں وہ بھی تحریر کیا اور اس "وَنہ وُن" کو طبقہ اناث میں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اس طرح یہ اَن پڑھ، جاہل اور اوہام پرست طبقہ توحید اور محبت سُنّت رسول صلعم سے سرشار ہو گیا۔ سماج کے بُرے رسم و رواج اور اوہام پرستی، قبر پرستی، پیر پرستی، بے پردگی اور دیگر بدعات پہ کڑی تعمیری تنقید کر کے انور صاحب نے اسلامی شعائر کو واضح کیا۔ عقیدۂ توحید اور سنت رسول صلعم کی نشر و اشاعت کے لئے انور صاحب نے سب سے زیادہ مؤثر کام اپنے خداداد ملکۂ شعر و شاعری سے لیا ہے۔ اپنی پُر آشوب اور مصروف ترین زندگی میں انہوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے زبان و قلم سے جتنا کام لیا ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابلِ رشک بھی۔ وہ قادر الکلام اور برجستہ گو شاعر تھے۔ فارسی اور عربی زبان پر انہیں ماہرانہ عبور حاصل تھا۔ اس کی جھلک ان کے فارسی کلام میں کبھی کبھی ہماری نظروں کو خیرہ شکار کر کے رہتی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کشمیری زبان کو ہی (یعنی عام لوگوں کی زبان) اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کا یہی کلام ہزاروں عام اَن پڑھ اور دین سے بے بہرہ لوگوں کی ہدایت کا سبب بن گیا۔ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے میں انور صاحب کی مندرجہ ذیل کتب موجود ہیں۔ جن لوگوں نے یہ تصانیف نہیں دیکھی ہیں اُن کی اطلاع اور معلومات میں اضافے کے لئے ان کے بارے میں مختصراً کچھ کہہ دینا مناسب لگتا ہے:۔

- مثنوی تعلیم و سُنّت (سہ حصص):

۔ حصۂ اوّل: تعداد اشعار ۶۳۶، باب ۴۷، صفحات ۴۰، تقطیع بڑی۔
اختتام پر پندرہ اشعار کی غزل در مدح اہل حدیث

۔ حصۂ دوم: تعداد اشعار ۷۵۸، جو ۴۲ ابواب میں منقسم ہیں۔ تین نعتیں (۶۰ اشعار کی) اور ایک قصیدہ در بیانِ توحید و سنّت۔ ۲۲ شعروں پر مشتمل ہے۔ صفحات ۴۸

۔ حصۂ سیوم: تعداد اشعار ۲۷۰ کے لگ بھگ۔ ۱۷ باب، صفحات ۱۶، تینوں حصّے کے۔ پی سٹیم پریس سرینگر میں طبع ہوئے ہیں۔ دو حصّے انور صاحب کے فرزند مولوی عبد الغنی صاحب نے شائع کئے ہیں اور تیسرا حصّہ انجمن غرباء اہل حدیث کی فرمائش پر شائع ہوا ہے۔

یہ تینوں مثنویاں مسائل و احکامِ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور وضو، غسل، مسح، تیمم، ناقصات وضو، اوقاتِ نمازِ پنجگانہ، شرائط و مفسدات نماز، صلوٰۃ الجمعہ،

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نمازِ عیدین، نماز و مسائل جنازہ، نجاست و پاکی، آداب زیارت قبور، صیام و صوم، اعتکاف، صدقۂ فطر وغیرہ فقہی مسائل کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں۔ ان سب مسائل پر عام لوگوں کی خاطر نسبتاً سہل زبان اختیار کی گئی ہے۔ ان مسائل کو شعر و شاعری میں بیان کرنا کشمیری شعراء کو حضرت شیخ نورالدین نورانیؒ سے تواتر کے ساتھ وراثت میں ملا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شیخؒ کی "صد و سی مسئلہ" والی کتاب اور حضرت میر عبداللہؒ کی "عقاید زان" اور اس کے بعد "نام حق" کا کشمیری ترجمہ قابلِ ذکر ہیں۔

انور صاحب چونکہ مسلک توحید و سنت کے پُرجوش داعی تھے اس لئے انہوں نے اسی مسلک کے مطابق فقہی مسائل کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ مولوی صاحب اپنے نیک مقصد کے حصول میں کامیاب رہے۔

آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے تک انور صاحب کی دیگر تصنیفات کی طرح یہ مثنویاں بھی سینکڑوں لوگ ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے اور پڑھوا کر سنتے خواتین تک ان فقہی مسائل سے واقفیت حاصل کر لیتی تھیں۔ انور صاحب کی ان مثنویوں نے ترویج مسلک توحید و سنت کو آسان بنا دیا۔

حصہ اول میں وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے انور صاحب فرماتے ہیں ؎

طریق بندگی، مومنہ زِ ہتس تھاہ — رسول اللہؐ سنجا پیچ ناو ہیتھ آہ
یمے تتھ منز ہِن بے شک لبن تار — مخالف یم چھ تس لس جائے چھ کھ نار
چھ خدمتگار ساری اُتھ جہادس — یہی وُتھ منگ خدالس بے نیازس
امامن، عالمن ہُندی چھ دستور — یہ فرماو یکھ نبی اللہ تہ منظور
صحابہ پیروِ سنت سراسر — بتھے گئے تابعینن ہنز چھ لشکر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیتھٕ کیٚنہٕ جُملہ تبع تابعین بوز — تمن پیٹھ رحمت اللہ سیٹھاہ سوز

امامن دینہٕ کیٚن سارِن یہے وَتھ — بہ فرمان آواز قرآنٔ وسنت

مُحدِّث ہم چھ تمہ غم خوار دِتِنہٕ کی — نشانہ تم چھ زِلن راہ یقینہٕ کی

تمن لِتہٕ گویہ ثابت تی وُنُن چھُم — مثے بیتھ شخص اندر اظہار اَنُن چھُم

مولوی انور صاحب مسائل و احکام کو سلجھے ہوئے انداز میں سمجھاتے ہیں غرض ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔

عنوان:- نماز کا پڑھنا کن جگہوں پر منع ہے:

ستن جاین نمازہٕ منع پرُن چھ — ڈرن مومن خلاف شرع کرُن چھ

نجاست آسہ یتھ جایہ ہیوٚ آنی (۱) — (۲) دوہم یتھ آسہ گھش کرنہ یوٚ آنی

مزارس منز ترٛیم (۳) ژورم حمامس (۴) — ژتھاوُن آس کن شرعی کلامس

(۵) چھ یتھ بعاون گندھ یتھ جایہ اُنٹھن — شیٚیم (۶) گوو درمیان راہ تھوکن

(۷) پتس پیٹھ کعبہٕ کس چھُے منع تی مان — ہوا چھُنہ قبلہٕ اے مرد مسلمان

پیٚمے گیٚے جایہ ستھہٕ (۸) اے ساٹکے راہ — چُھکھ کرجاینہٕ یمن پیٹھ پرُن سا آزاہ

طرف قبلک اگر ہیکہ نہ وُنُس تل — رُتھ طرفا پرُن تیتھ کُن سیٚن حل

• تفسیر سورۃ یوسف (یا مثنوی یوسف زلیخا): یہ مثنوی نیو کشمیر پریس (دی بنڈ) سری نگر سے طبع ہوئی ہے۔ اس کے بھی تین حصے ہیں اور سال ۱۳۲۵ھ میں اسے انور صاحب نے مکمل کیا۔ حصہ اول میں تین سو سات اشعار اور دو غزلیں، حصہ دوم میں آٹھ سو پینتالیس اشعار کے علاوہ ایک مناجاتیہ غزل اور ایک غزل اور حصہ سوم میں آٹھ سو تراسی اشعار کے علاوہ دو غزلیں ہیں۔ پہلے اور تیسرے حصے کی بحر ایک ہے جبکہ دوسرے حصے کی بحر دوسری ہے۔ انور صاحب نے اس

؎ تعلیم سنت حصہ اول صفحہ ۲-۳

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مثنوی کو موضع بوٹہ کوٹ (پہلگام) ضلع اسلام آباد میں اپنے ایک تبلیغی سفر کے دوران شروع کیا تھا، لیکن "۱۵۴" اشعار تصنیف کرکے اسے چھوڑ دیا تھا۔ پھر ۱۳۲۵ھ میں بوٹہ کوٹ ہی میں باقی ساری مثنوی (ہر سہ حصص) مکمل کرلی۔

کشمیری ادب اور شاعری میں انور صاحب سے پہلے روایت ہی کا غلبہ تھا۔ انور صاحب نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر روایت، اور رجعت سے بغاوت کا اعلان کیا۔ اُن کا سارا کلام "چیزے دیگر" ہے۔ یوسف اور زلیخا کے قصے میں شعراء نے نہ صرف رنگ آمیزی کی ہے بلکہ اسے دل کو لبھانے والی چیز بنانے کے لئے نہ صرف مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے بلکہ اس قرآنی قصے کو بھی بہتان اور رطب و یابس کا پشتارہ بنا کے رکھ دیا۔ قصہ قرآن حکیم میں بیان ہوا ہے اور احادیث میں اس کی کچھ کچھ توضیح ملتی ہے۔ لیکن شعرائے کرام نے (جو مسلمان ہی تھے) قصہ کو منظوم کرتے وقت قرآن و حدیث کو اکثر نظر انداز کر دیا ہے اور ایک پیغمبرؑ کی زندگی کے سبق اور حکمت آموز واقعے کو، جسے قرآن میں "احسن القصص" کہا گیا ہے، عام عشق و عاشقی کا پشتارہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ اس کے برعکس انور صاحب نے اجتہاد سے کام لے کر قصہ کو تفسیر کا قالب بخشا۔ پہلے آیات دی گئی ہیں، پھر ان کا نثری ترجمہ۔ اس کے بعد منظوم ترجمہ، تشریح اور تفسیر بیان ہوتی ہے۔ عوام کی مجلسی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، صحیح واقعہ پیش کرنا بھی ضروری تھا تاکہ عوام میں غلط راسخ شدہ باتوں کی نشاندہی کرکے اصل واقعہ کو صرف حقیقی رنگ میں پیش کیا جائے۔ مولوی انور صاحب اس بارے میں فرماتے ہیں ؎

نہ ہاوُنی شاعری دانش وری چھم   مگر کُنہ سنز وہنہ بالاتری چھم

یہاں بھی انور صاحب تبلیغ دین توحید اور سنت احسن طریقہ پر انجام دے رہے ہیں۔ ان کے دل میں قصہ کو منظوم کرنے کا خیال اسی لئے پیدا ہوا کہ اسے اسرائیلی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خرافات اور ہر قسم کے رطب و یابس سے پاک کر کے بیان کیا جائے۔ قصے کو بے انتہا پاکیزہ زبان اور اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی بھی واقعہ یا واقعہ کا جزو فحش اور مذموم طریقہ پر بیان نہیں کیا گیا ہے جبکہ اس میدان میں حضرت مولانا جامی رح جیسے عبقری بھی بڑھ کر کھلے گئے ہیں ؏

انور صاحب نے زلیخا کے ابتدائی خواب کو جس میں اُس نے حضرت یوسف ع کو دیکھا تھا، حضرت یوسف کا حلیہ اس شائستہ انداز میں بیان کرتے ہوئے پیش کیا ہے ؎

بہ جاہِ حُسن باسامانہ ڈلیو ٹھُن — مُنوّرہ جلوہ گرِ شاہانہ ڈلیو ٹھُن
جمالا باکمالا پائے تا سر — برائے نور لاگتھ اوس ذرِ بر
سرس پیٹھ تاج حُسنک تس شہانی — انن حیرت نٙن رازہ نہانی
جبینس پیٹھ شُبن نورا لاہی — خدایِن پاک تھوٚومُت از سیاہی
زِ ابرو زَن دو شمشیرن کڈتھ کش — بہ یک جنبش کرن نازک دلن کھش
زِ اچھ آب حیاتکی زَن زِ چشمہ — زِ عصمت زاہ تہ کرہاوَن کرِشمہ
زِ مژگان تیر ہرگاہ نراوہَن زور — ہزارن عاقلن واتن قضا پوٚر
اَلِف مینی زِ رخسارِ مبارک — نٙن زال عصمت ذاتِ مبارک
دہانش غنچۂ گلزارِ جنت — سخن یُس کُن کرال تُس زَن چھ منت
زِ مُحکمہ مالہ زن اندر دہانس — شُبن کیاہ آسہ تس شیرین بیانس
سوٚ تھز گرزن بناز و ناز شوبن — بہ سینہ اُسو چھکی راز شوبن !
دوہ بازوِش برائے مُلک داری — کرن گروا' بٙن شیداتہ یاری
زِ سر تا پا قدسے زیباش روشن — وتے ووٚلی مختصر تھوٚوا ے پیرہن

؎ مولانا جامی نے حضرت یوسف ع اور زلیخا کی شادی کے بعد شبِ زفاف کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ذوقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے بلکہ عامیانہ حد تک وہ کریہہ المنظر ہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یہ بیان شدہ سراپا قاری کے ذہن کو ایک جلیل القدر پیغمبر زادہ کے سراپا سے پاکیزہ انداز میں متعارف کرتا ہے۔ شعر نمبر ۴، ۶، ۱۱ اور ۱۲ اس سلسلے میں توجہ کے قابل ہیں۔ زلیخا جب بیدار ہوتی ہے تو وہ ہجرانِ حبیب میں گریہ وزاری شروع کرتی ہے۔ اس بارے میں جو غزلیں مثنوی کی زیب و زینت ہیں وہ بھی سنجیدگی اور پاکیزگی میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ ان غزلوں میں بھی انور صاحب نے مسلکِ توحید کو لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ زلیخا کی پہلی فراقیہ غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بیا اے دل نگارس وَن   مےٚ زاگجم لولہ نارن تن
نگس نیاوس ژٕ یارس وَن   مےٚ زاگجم لولہ نارن تن
سمندر کیاہ چھُ لولک سوّن   ہےٚمس زالگے دِمس تتھ وِوّن
چھُکر اتھ داستانس ژھین   مےٚ زاگجم لولہ نارن تن
شنو اے انورِ شیدا   کوٚرُکھ ییٚمی خالقن پیدا
وُتس آلو پرٕین وتتن   مےٚ زاگجم لولہ نارن تن

مثنوی میں پہلے سورہ یوسف ؑ کی آیات کریمہ درج کی گئی ہیں، پھر اُن کا نثری ترجمہ، اس کے بعد ان کی منظوم تشریح اور ترجمانی۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں نثر و نظم کا خوبصورت سنگم نظر آتا ہے جو کشمیری ادب میں ایک منفرد اور خاص انداز لئے ہوئے ہے۔ خوفِ طوالت سے نثر کی مثالیں پیش نہیں کی جاسکتی ہیں۔

انور صاحب نے حضرت یوسف ؑ کے ساتھ سوتیلے بھائیوں کے سلوک اور ان روح فرسا حالات کی عکاسی جن میں حضرت یوسف ؑ کو گرفتار کیا گیا' اس طرح کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عکاسی بڑی ہی متاثر کرنے والی اور اقرب الی الحقیقت

ہے۔ کوئی بھی دل والا قاری جذبات کو قابو میں نہیں رکھ سکتا ہے ؎

بۆڈکھ دوٗرِ منزل تہٕ زونِکھ محل	تمن وۄدربایِن گییِس تمی بدل
تُلِکھ تھوٗدٕ تہٕ دارِتھ دِتُکھ بزرین	کرن گریہ آلِ یوسفؑ نازنین
سپدٕ لوٗتیس آکھ نہٕ کینہہ تہٕ عار	نہ بوزِکھ تہ ند گریہ تے زارِ پار
تمُس گوو سُرخ روٗے زیبا تمام	علیہ الصلوٰۃ وعلیہ السلام
یہ ہیرُن تمس کھین تہٕ چَن از پدر	تہٕ ہیوت تَس شاہ ژھنکھ دوٗرِ تراوِتھ ہیتھر
ہیوان گھش کران گاہ اسِس رٹن	تمس اوس جسمِ مبارک ٹٹن
کھیوان لرزِ بالس نہ وان کیا ندا	مگر زندہ روزُن بہ فضلِ خدا

حضرت یوسفؑ اور زلیخا کی شادی کی تقریب کا بیان نہایت ہی شائستہ اور مہذب انداز میں کیا گیا ہے ؎

بہ رحمات یوٗرِھ یہ ربّ العالمین	دیان گوٗ نِکھ نکاح روٗح الامین
بہ الطافِ خداوندِ الٰہی!	زلیخا یافتہ از غم رہائی
شُکھا ندر گوو تیتھے امنہ وار یِتھو کن	چھُ تیتھ کھاندرِ شبن واحد پرستن
تیتھے کنی اوس تیتھ آئینِ یعقوبؑ	بہ تعلیمِ خدا ترتیبِ مرغوب
مبارک ہر طرف دوہ نوٗلی چھ سوزن	زلیخا شادمان وادِن لوٗگُس ژھین

انور صاحب کی مثنوی اور دیگر شعرا کی مثنوی یوسف زلیخا میں دیگر اہم باتوں کے علاوہ یہ فرق بھی ہے کہ انور صاحب نے از روئے تفسیر و حدیث اس میں زلیخا کا حضرت یوسفؑ سے پہلے فوت ہونا بھی ثابت کیا ہے۔ اس لحاظ سے محمود گامی کا زلیخا کی زبان سے کہلوایا ہوا مرثیہ (حضرت یوسفؑ کی وفات پر) پایۂ اعتبار سے گر جاتا ہے۔ حضرت یوسفؑ زلیخا کی وفات کے بعد ایک ماہ دس روز تک زندہ رہ کر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یہ مثنوی اپنی چستی، ترکیبوں، بامحاورہ اور سلیس ہونے کی وجہ سے اپنے اندر بہت سے فنی محاسن رکھتی ہے۔ پاکیزہ اور شستہ اتنی ہے کہ کسی بھی مہذب اور شریف مجلس میں اعتماد اور اعتبار کے ساتھ پڑھی جا سکتی ہے۔ مثنوی میں اچھی خاصی تعداد ایسے اشعار کی ہے جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں:

س حسد لُس کرن لبس سہ پانس پھرن   چھ بآزی گرن بآزی واتن گرن

○

ت خداین یہ دیُت تمہ چھنہ کانہہ ژوان   یہ نیو تمو یہ کرکانہہ چھ بیسرتھ دوان

انور صاحب کے زمانے میں جو نئے الفاظ کشمیری زبان میں رواج پا رہے تھے وہ بھی مثنوی میں در آئے ہیں مثلاً "ہتھکڑی، بیڑیاں، ڈر۔"

مجموعی طور پر مثنوی ایک شاہکار ہے اور ہمارے شعری ادب میں ایک بیش بہا اضافہ بھی۔ کئی غزلیں بہت خوب ہیں۔ تبرکاً ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:-

اے خالقِ جن و پری کیاہ رژ کرتھ صورت گری!
حیران چھ تمہ منز جوہری کیاہ رژ کرتھ صورت گری
حُسنک اثر ترِ و تھ نبر و تھ منز جہانس شور و شر
کرِ غافلو تمہ چاکری کیاہ رژ کرتھ صورت گری
بلبل گلن وُچھ روان نامے دِ ہکی یارس ژوان
ژیپے اوت شوبی سروری کیاہ رژ کرتھ صورت گری
ناوس کرے چشمہ فدا از شہر دل بوزم صدا
خوشس رُو چو ماہ انوری کیاہ رژ کرُتھ صورت گری

• القول المقبول فی معراج الرسول: مطبوعہ کے پی سٹیم پریس صفحات ۴۲

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تعداد اشعار ۵۳۱، ایک نعت شریف ۴۱ اشعار۔ کل ۵۷۲ اشعار، اس کے علاوہ اس میں لگ بھگ ستر اشعار ایسے بھی شامل ہیں جو معراج نامہ ہذا کی توضیح و تائید حسب الحکم النور صاحب، ان کے فرزند مولوی عبدالغنی صاحب نے تحریر کئے ہیں۔ اس مثنوی میں بھی ان ہی خصوصیات کا التزام کیا گیا ہے جو تفسیر سورہ یوسفؑ میں مدنظر رکھی گئی ہیں۔

حضرت پیغمبر اکرمؐ کی ذات والا صفات کے ساتھ وابستہ واقعہ معراج اسلامی تاریخ میں اہم ترین اور عظیم بالشان حیثیت کا حامل ہے۔ مگر اس قرآنی واقعہ کو جس انداز میں دیگر کشمیری شعرائے نے بیان کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ بہت سی بے سروپا من گھڑت باتیں اس واقعہ کے ساتھ منسوب کی گئی ہیں۔ اسی لئے النور صاحب نے مسلمانوں کے اذہان کو شک و ریب اور افسانہ طرازی سے صاف کرنے کے لئے واقعہ معراج کو قرآن و حدیث کے مطابق منظوم صورت میں بیان کرنا وقت کی اہم ضرورت کو مدنظر رکھ کر مناسب سمجھا۔ اس میں بھی پہلے قرآنی آیات دی گئی ہیں اور بعد میں اُن کی منظوم تشریح و ترجمہ دیا گیا ہے۔ (اس میں نثری ترجمہ نہیں دیا گیا ہے) واقعات کی وضاحت کے لئے احادیث شریفہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔

یہ مثنوی مذہبی شعری ادب کا بہترین سرمایہ ہے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا پایۂ اعتبار بہت بلند اور ارفع ہے۔ یہ ایک عالمانہ کوشش ہے اور بالکل کامیاب ہے۔ مثنوی کے آخر میں النور صاحب نے ایک عالمانہ اور پُر تاثیر نعت سنگلاخ قافیوں کے التزام کے ساتھ حضور رسالتمآبؐ میں پیش کی ہے۔ پیغمبر رحمتؐ سے اُن کی فراہانہ محبت، نعت کے ہر شعر سے ظاہر ہوتی ہے۔ النور صاحب نے یہ مثنوی عمر کے آخری حصے میں تصنیف فرمائی ہے۔

● دیوانِ النوری: مطبوعہ برونکا زبریس سرینگر۔ جمید الثانی ۱۳۶۰ھ صفحات؟

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اُس میں ۹۸ غزلیں اور ۲۴ رباعیات ہیں جو دراصل چہارتیتی ہیں۔ اس دیوان کو مولوی عبدالغنی صاحب نے انور صاحب کی وفات کے بعد زیورِ طباعت سے آراستہ کرا کے شائع کرایا۔

دیوان میں شامل تمام غزلیات میں توحید و سنّت کے فضائل اور شرک و بدعات کے نقائص بیان کیے گئے ہیں۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے ان میں یکجہتی اور یک رنگی ہے۔ لیکن اس یک رنگی کو نئے نئے الفاظ اور اسالیب کا پیکر بخشا گیا ہے جس کی وجہ سے قاری کو تکرار کی بوریت کا شکار نہیں ہونا پڑتا ہے۔ دیوان میں عربی کے اشعار فارسی اور اردو غزلیں بھی نظر آتی ہیں جو انور صاحب کی سخن دانی اور ان زبانوں پر ماہرانہ عبور کا ثبوت ہے۔ اس دیوان کی اکثر غزلیں ان کی دوسری کتاب "اصلاح و بشارت المومنین" میں بھی شامل ہیں۔ الف سے لے کر یا تک اس دیوان میں ہر ردیف پر غزلیں ملتی ہیں لیکن اکثر پُر تکلف اور نامانوس ردیفوں کی وجہ سے بہت سے اشعار بلکہ پوری غزلیں کرخت اور ثقیل بن گئی ہیں جو ذوقِ لطیفہ اور وسیع ادیب کے لئے بارِ گراں محسوس ہوتی ہیں۔

انور صاحب نے دیوان سے تبلیغ مسلک توحید و سنّت کے لئے زبردست کام لیا ہے۔ اس میں ہلکے پھلکے روؤی گیت بھی شامل ہیں جو بہت ہی سہل اور فصیح ہونے کی وجہ سے بلیغ بھی ہیں۔ کانوں میں توحید و سنّت کا مدھر رس گھولنے والے روؤ گیت کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

لاشریکس ایمان اَنتہٖ لولو — شرک ترأوتھ مومن بنتہٖ لولو
باغ شرعس منز بلبل زن — نقش وعدۂ سینس کھنتہٖ لولو
شاد روزتھ سنتک گلزار چھاو — ہیتہٖ مُشرک برنے گنتہٖ لولو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نوٗرِ وحدت ماراں گرایہ لولو | اُسی چھِہ وُلی امتی کُنُز پرچھ مایہ لولو
عالمینن مالک باری سون | راج تمی رٔٹ مند چھُس ہر جایہ لولو
سون مرشد چھُہ شوبہِ مُرن پیغمبر | سُہ چھُہ رہبر سُے چھُہ مدد پایہ لولو

○

کُنہ مُرک سہ چوٗلتہ لولو | کُنہ سُند مشے چھُہ ماوسہ لولو
تئیُ کُن شُجد رسی وسہ لولو | رسہ رسہ ناد لالیہ لولو

○

انور صاحب کی ساری غزلیں اُن کے مسلک کا اعلان و اظہار ہیں اور اصطلاح کے ساتھ بند معنی میں ان میں تغزل اور غزل کا ڈکشن تلاش کرنا لاحاصل ہے۔
انور صاحب بدیہہ گو تھے۔ وہ وقت اور فرصت کے پابند نہیں تھے۔ انور صاحب کے زمانہ ہی میں مہجور کشمیری کا مشہور گیت "باغِ نشاط کے گلو تاز کراں کراں وہ لو" زبان زدِ خاص و عوام ہوا تھا۔ میرے والد محترم خواجہ عبد الرحمان نے بتایا کہ ایک دن مولوی انور صاحب صفاکدل میں مرحوم عبد الرحیم آہنگر کے ہاں تشریف فرما تھے۔ عبد الرحیم مرحوم نے انور صاحب سے عرض کیا کہ "ان دنوں مہجور کا گیت زبردست مشہور ہے، اگر اسی طرز پر کوئی گیت آپ تصنیف فرمائیں تو اچھا رہے گا"۔ انور صاحب نے عبد الرحیم کے کہنے پر ہی اسی وقت فی البدیہہ یہ گیت تحریر فرمایا ہے ؎

باغِ یقینہ کے گلو | کُلمہ پران پران وٕتہ لو
مینز اندر ژُ سُنبلو | شُجدٕ کران کران وٕتہ لو
غرق دریاو گئے کِشتی گندرر | لاۂ الا سانگ ژھار بندر
شریعتہ چھے اتھ ناو اندر | تار تران تران وٕتہ لو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

قُل ھو اللہ آمنتُ باللہ   یادُ دران دران ندہ بو

بات انور صاحب کی غزل گوئی کی چل رہی ہے، مناسب ہوگا کہ ان کی فارسی اور اُردو غزل گوئی پر بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔ انور صاحب کی فارسی غزل، مناجات اور نعت کی زبان چُست، فصیح، بلیغ اور بامحاورہ ہے۔ دراصل اُن پر فارسی زبان کا غلبہ تھا۔ اگر وہ صرف فارسی تک اپنی مشقِ سخن محدود رکھتے تو اس میں ایک خاص مقام حاصل کرتے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

نقشے است ایں دُنیا برآب   روزے شوی اے دل خراب
تا چند می مانی در آب   روزے شوی اے دل خراب

○

اے دل ز جور ہجراں نالاں چرا نباشم   دیدار شاہ خوباں خواہاں چرا نباشم
در گلشنِ نبوّت چوں بلبلِ محبت   در ہر زماں غزل خواں یاراں چرا نباشم

○

سو بسو دیدم کہ صنع صانع زیبا است ایں   از ید قدرت ہویدا سر بسر پیرا است ایں
قامت سرو و صنوبر گلشن و گل ہائے ناز   بلبل خوش رو ست شیدا جذبہ بالا ست ایں
روزن دل وا چو کردم از صدائے جاں فزا   مژدۂ نیکو رسیدہ معنیش پیدا است ایں

○

• مخطوطہ غزلیات قلمی؛ صفحات بارہ، تقطیع کلاں۔ زیر بحث مخطوطہ میری والدہ محترمہ کی ملکیت رہا ہے اس میں ۲۸ غزلیں ہیں اور لگ بھگ ۱۳۵۶ھ تک

سے دیوان انور میں ۴۳ چہار بیتی (رباعیات) بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ حصہ بیت بحث ہی رہا ہے۔ انہیں اکثر تو رباعیات کے وزن اور بحر سے خالی ہیں کچھ نا تمام غزلوں کے مطلعے، مقطعے اور شعر ہیں اور کئی ایک تک بندی کی مثالیں ہیں اور مضمون اور قافیہ بندی کے لحاظ سے بہت ہی کم درخورِ اعتنا ہو سکتی ہیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

وقتاً فوقتاً سیاہ اور لاجوردی سیاہی سے تحریر کیا گیا ہے (میری والدہ زبردست اہل حدیث تھی، لیکن بزرگانِ دین کے لئے بھی بے انتہا احترام کا جذبہ رکھتی تھی) اس میں شامل غزلوں کے علاوہ فارسی اور کشمیری میں نعت اور مناجات بھی ہیں اور یہ دیوانِ انوری میں موجود نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے یہ اہم ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں؎

از نامِ تو اے جانِ جاں انوارِ تاباں دیدہ ام
سازم بیاں رازِ نہاں اسرارِ قرآں دیدہ ام
بودم اگر اندر سفر، دیدم جمالت جلوہ گر
گاہے چنیں گاہے چناں اسرارِ قرآں دیدہ ام

○

دیدم شبے اے دوستاں نورِ نگارِ خویشتن
بر چشمِ جانم شد عیاں نورِ نگارِ خویشتن

○

بخواہم گر نمائی رو چنیں بس آرزو دارم
شود پس بختِ من نیکو چنیں بس آرزو دارم
فروغِ نورِ تابانت چو اُفتد بر حسنِ شیدا
نماند ظلمتِ یکمو چنیں بس آرزو دارم

○

اے دل بہ حسنِ خوباں نظرے چرا نکردی؟
در وادیٔ گلستاں سفرے چرا نکردی؟
ایں بلبلانِ شیدا از عشقِ تو بنالند
خود راز سوزِ جاناں خبرے چرا نکردی؟

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہر کس بہ صانع خود شاہد بود ہُویدا
انورؔ بہ منزلِ جاں گذرے چرا نکردی؟

○

شربتِ عشق گر ہمی نوشی		در صفِ ناکساں چہ کار اے دل

○

ایک کشمیری شعر ؎

نامِ اللہ جام بہ وحدت از کرم بیٚایہ چاوِ نئے
محرمِ اسرارِ قرآن در شریعت نماوِ نئے

○

انورؔ صاحب کا اُردو کلام کسی خاص بات کا حامل نہیں ہے۔ بس منظوم خیالات ہیں۔ اُس میں مضمون آفرینی اور جدت نہیں ہے۔ اکثر شعر بالکل سپاٹ اور بے مزہ ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ انور صاحب نے کشمیری اور فارسی میں بہت سی نعتیں لکھی ہیں۔ ان کی اکثر ابتدائی نعتیں عشق و وارفتگی کی تپش سے بالکل خالی نظر آتی ہیں اور وہ محض منظوم نثر کی مثالیں بن گئی ہیں۔ پھر بھی انورؔ صاحب کی چند نعتیں اچھی ہیں اور بڑی جاندار ہیں۔ یہ نعتیں اُن کی آخری تصنیف "سلام انور کلام

؎ دو نعتیں انور صاحب نے کشمیری زبان میں مرحوم عبد الاحد ناظمؔ (بجبہاڑی) کی مشہور نعت "چھُس وُفِر رسول مُت گرِ ہتہ یارِ دم یار مدینس" کو مدِ نظر رکھ کر تحریر کی ہیں۔ ناظمؔ کی نعت عشقِ رسولؐ کی دولت سے مالامال ہے جبکہ انور صاحب کی نعتیں اس کے مسلک کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی فرمایہ کر رہی ہیں۔ ایک دو شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

رحمت بوٚنی از یارِ صد بار مدینس		پھول رحمتک گلزار اظہار مدینس
پھول باغِ سنت آب پاشی کرِ رحیمن		نزول کفر و شرکک سر لبِ سر زنگار مدینس

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

انور" میں موجود ہیں اور ان کی بستر مرگ پہ کہی ہوئی ہیں۔ اسی لئے ان میں بہت حد تک درد و سوز ہے ؎

تمنائے جگر مے چھم بہ وُچھ ہا روئے آں حضرت
دِیم دادِن دوا اللہ یِیم خوشبوئے آں حضرتؐ

ہزاراں خستہ دل نالن وِین سینن کھسن بالن
وِدن ہن ہن بدن گالن نظر چھکھ سوئے آں حضرتؐ

وُچھن عالم کتابن منز رِوِن صوفی چھہ خوابن منز
فراقس اضطرابس منز چھیت وُچھوئے آں حضرتؐ

○

ارمان از دل چھم پنہِ نیرانی — سردار عالم ڈیشن کر
تصدیق دل چھم دنیا چھہ فانی — سردار عالم ڈیشن کر
جبریلؑ سوزُس حق سبحانی — سبحٰن الذی اسریٰ پر
مایہ ستی حورِ ذرایہ ونہ نادِ آئی — سردارِ عالم ڈیشن کر
طٰہٰ، یاسین کیاہ چھہ شوبانی — انا اعطینٰک الکوثر
مازاغ البصر چشمہ نورانی — سردارِ عالم ڈیشن کر

● گُل دستۂ انور۔ اس میں انور صاحب کی ۶۶ غزلیں ہیں اور اس لحاظ سے اچھا خاصا مجموعۂ غزلیات ہے۔ ان میں مضامین کی یکسانیت، موضوعات کی یک رنگی موجود ہے۔ اس کی اکثر غزلیں دیوان میں بھی شامل ہیں۔

ان کتب کے علاوہ انور صاحب مرحوم کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں لیکن خاکسار کی نظر سے نہیں گذری ہیں۔ اس لئے ان پہ تبصرہ تو کجا، اُن کا سرسری تعارف بھی پیش نہیں کر سکتا، البتہ نام گنوا سکتا ہوں:

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

(۱) بشارۃ المومنین مع اشارۃ الیقین ۔ منظوم کشمیری ۔ در بیان مسائل توحید و سنّت ۔

(۲) وِرد الموحدین بزبان فارسی منظوم

(۳) حلیما ۔ بروزن کریما ۔ در ردّ شرک بزبان فارسی (منظوم)

(۴) نصیحۃ النسوان منظوم کشمیری، بطرز غزلیات و وَنہ وُن

(۵) اصول حدیث، منظوم کشمیری

(۶) مُفصّل حالات جنگ بدر ۔ منظوم کشمیری

انور صاحب کی وہ کتاب جن کا اشتہار دیا گیا تھا، لیکن معلوم نہیں کہ بعد میں وہ کیا ہوئیں اور کہاں گئیں :۔

(۱) تفسیر پارۂ الٓم، نظم و نثر ۔ کشمیری

(۲) گلشن نعت ۔ کشمیری فارسی

(۳) مُفصّل حالات جنگِ اُحد، منظوم کشمیری ۔

(۴) مثنوی حال، فارسی

(۵) قصۂ شیخ صنعان، مثنوی (بقول بے تاب صاحب اس میں انور صاحب بالکل ایک رومان پسند شاعر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں) ۔

انور صاحب کے زمانے میں ہی مرزا غلام احمد قادیانی کا نبوت کا دعویٰ سامنے آیا ۔ جہاں غیر منقسم برِّصغیر کے تمام علماء اہل سنّت والجماعت اور شیعہ علمائے مرزا صاحب کی نبوت کی تردید اور تغلیط کی، وہاں انور صاحب نے بھی اس میدان میں وعظ و تبلیغ کے علاوہ ردیف و قافیہ کے ساز و سامان کے ساتھ لشکرِ شعر کو بھی اُتارا ۔ انہوں نے مرزا صاحب کی صرف کتابیں ہی نہ پڑھیں، بلکہ وہ قادیان جاکر مرزا صاحب کے ہاں دو ہفتہ تک رہے اور مرزا صاحب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کو بہت نزدیک سے دیکھا۔ فرماتے ہیں ؎

قادیانی را بہ چشم خود بدیدم بارہا ہست در علم فلاسف منہمک شام و سحر

مولوی انور کا تجزیہ کتنا درست تھا، بعد کے واقعات اور مرزا صاحب کی تحریروں سے وہ اور صحیح ثابت ہو گیا۔ قادیانیوں سے بحث و مناظرہ کرنے میں انور صاحب کبھی بھی نہیں ہچکچائے۔ موضع پاسنور کے محمد عبداللہ شال المعروف بکیل (قادیانی) کو انور صاحب نے بارہا اپنے مدلل مباحث سے نہ صرف زیر کر دیا بلکہ ہمیشہ کے لئے خاموش رہنے پر مجبور کیا (محمد عبداللہ شال صاحب بعد میں مرزائی بھی نہ رہے)۔

انور صاحب نے اپنی عمر کے آخری سال میں جب وہ اکثر بیمار رہے اور پھر مرض الموت کے ایام میں بھی چند نعتیں، مناجات، کچھ اشعار اور گیارہ غزلیں کہی ہیں۔ ان میں اُن کی آخری مناجات بھی شامل ہے جو انہوں نے اپنی وفات کے روز بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لکھی ہے۔ اس مجموعہ کا نام "سلام انور و کلام انور" ہے جسے مرحوم کے فرزند مولوی عبدالغنی صاحب نے انور صاحب کی وفات کے بالکل بعد ہی طبع کرایا۔

دیکھئے انور صاحب ایک سچے مومن ہونے کے ناطے اللہ ربّ العزّت کی بارگاہ میں کس درد و سوز اور ایمان افروز جذبے سے محو کلام ہیں ؎

وفادارس، مددگارس بہ چھُس تس انتظارس منز
میٲنے آمُت لول چھُم پیارس بہ چھُس تس انتظارس منز
ژٕمی پیدا کورُس یامت کوٗرُن سیٹھو میون قدوقامت
ژٕمی روٗژھ نُس بہ از تامت بہ چھُس تس انتظارس منز
ژٕمی کھیوٗوُس ژٕمی چوٗوُس ژٕمی لوکُن ہدا دیوٗوُس

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تمی بہ راہِ حق ہھوِوس   بہ چھُس تس انتظارس منز
دِیس چھم فرحت و شادی   سُہ بخشم پوُز آزادی
یِلن ساری مےٚ اُز دِ آدی   بہ چھُس تس انتظارس منز
کُنفے چھُم شاہد یکتا   شفاخانن اندر دوٚلکیا
وفا چھا پیٚتھ دُنیا   بہ چھُس تس انتظارس منز
یہو بنو منت سیٹھا تھاوِہم   بہ رحمت یان شیٚہہ لادِہم
یِہُن دیدار بیٚیلہ ہاوِہم   بہ چھُس تس انتظارس منز
یِتھم کتھ انورنی بوزِو   کنُس کُن منتظر روزِو
دِرۂ دہ برِ بُنی سُوزِو   بہ چھُس تس انتظارس منز

یہ مناجاتیہ غزل انور صاحب نے ۲۳ ر ماہ ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ کو تصنیف فرمائی اور اُسی دن وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ انور صاحب ۸۵ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ صوفی احمد مسلم مصنّف تاریخ اہلحدیث اور محمد ایوب بیتاب نے رسالہ "نیری پوش" میں انور صاحب کا سال وفات و تاریخ غلط تحریر کیا ہے۔ "سلام انور" پر انکی "تاریخ وفات ۲۳، ذی قعدہ ۱۳۵۹ھ درج ہے۔ سلام انور ۱۳۵۹ھ ہی میں طبع ہوئی ہے اس لئے سند اعتبار اسی کو حاصل رہے گی۔

انور صاحب کنی پورہ شوپیان میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہیں۔
؎ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔ شوپیان کے ایک معزز شاعر (جو انور صاحب کا برخوردار تھا) لسہ فلک مُلہم نے انور صاحب کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا ہے۔ اقتباس نذر قارئین ہے ؎

ہے ہات چہ شور و غوغا شُد   مخلوق بہ حسرت و بُکا شد
چوں حور فلک ز نور توحید   آں واعظ شیخ وقت ما شد

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آں ناصح یگانہ عصر — آں صاحب زہد و اتقا شد
آں قاصد بارگاہ اسلام — و آں قائد لشکر وفا شد
آں وارث ارث انبیائی — و آں قدوۂ وقت و پیشوا شد
با شرع و حیا و بُرد باری — با صوم و صلوٰۃ و با صفا شد
بر داد خدائے بود قانع — بے زار بہ حرص و ہم ہوا شد

○

اے زینت عیش و شاد مانی — وے فخر رموز نکتہ دانی
اے شبلیؒ وقت و رومیٔ عصر — وے جامیؒ و سعدیؒ زمانی
در فہم قرآں و ہم احادیث — نے بود ترا نظیر و ثانی

○

سال انتقالش ز روئے ہجراں — "آہ عالم بے نظیر ما" شد
۱۳۵۹ھ

○

انور صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے آپ کو اولاد عطا کئے۔ پہلی بیوی سے جو رنبیر گڈھ کی تھیں، مولوی عبد الغنی صاحب پیدا ہوئے۔ دوسری بیوی سے مولوی عبد الرشید اور مولوی عبد الحمید ہیں۔ مولوی عبد الغنی صاحب کب کے مرحوم ہو چکے ہیں۔

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

موتی لال ساقی

پنڈت گوپی کرشن

وہ شروع سے کوئی غیر معمولی شخص نہیں تھا۔ بس آپ مجھ جیسا ایک عام آدمی مگر ایک بات ضرور تھی۔ اُسے امتحان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا جس نے اسے اپنے اندر۔ اپنے باطن میں جھانکنے پر مجبور کیا کیونکہ خارجی دنیا میں جس ہستی نے اُسے سہارا دیا تھا وہ ناکامی کی وجہ سے اُسے مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہ ہستی کوئی اور نہیں اس کی اپنی ماں تھی جس کے نازک کندھوں پر معصوم بچّوں کی پرورش کا بوجھ آن پڑا تھا۔ اپنے اندرون۔ اپنے باطن کو سمجھنے کے لئے۔ پانے کے لئے اس نے یوگ کا راستہ اپنا لیا اور سالہا سال تک اس دنیا کی سیر کرتا رہا، ایک ایسی دنیا کی سیر جو نظروں سے اوجھل تھی مگر سادھنا کی ضوفشانی نے اس نگری میں چراغاں کر رکھا تھا اور اس میں موجود ایک ایک ذرہ تک اُسے پکار پکار کر اپنی اور بلاتا تھا۔

اپنے آپ کو تلاش کرنے اور پا لینے کی سعی کے دوران اس نے دنیا کو تیاگ نہیں دیا۔ وہ دنیاداری اور گھر گرہستی کے کام میں مصروف رہا۔ باطن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے اس نے ظاہر سے کنارہ نہیں کیا۔ اس نے کلرکی بھی کی۔ ایک ایسے محکمے میں جہاں پیسے کی کھنکھناہٹ ہر ایک شخص کی زندگی کا محور تھی۔ اور اب بھی ہے۔ وہ کافی دیر تک رفاہ عامہ کے محکمے سے وابستہ رہا مگر وہاں ہر کوئی اُسے شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ قناعت پسند اور صبر کرنے والے گوپی کرشن کو روپے پیسے کی جھنکار کبھی بھی لُبھا نہیں سکی۔ محکمے میں اس کا وجود دوسرے لوگوں کے راستے کا کانٹا تھا۔ پھول کو کانٹا سمجھنے والے آخرکار اپنے راہ کے پتھر کو ہٹا لینے میں کامیاب ہو گئے اور اسے تبدیل کرکے محکمۂ تعلیم میں متعین کر دیا گیا۔ حق کے متوالے گوپی کرشن نے اطمینان کا سانس لیا کیوں کہ یہاں رشوت کی ہوا اس قدر تیز نہیں تھی جتنی کہ محکمۂ رفاہ عامہ میں۔

لوگ ۔ سہج یوگ کے راستے پر چلتے چلتے دن ہفتوں، ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ وقت کا سفر برابر جاری تھا اور اس دنیا کا راہی برابر محوِ سفر تھا اور پھر ـــ اور پھر یوگ ابھیاس نے اپنا اعجاز دکھایا۔

وہ جو اپنے گھر میں گمنامی کی زندگی جیا اس کی شہرت کا ڈنکا دور دراز ملکوں اور شہروں میں بجنے لگا۔

وہ جس نے کبھی جرمن سیکھی نہیں تھی وہی شخص جرمن زبان میں شعر کہنے لگا۔

اطالوی سے نابلد گوپی کرشن نے اطالوی لوک طرز میں اطالوی گیت لکھے۔

وہ شعر کی موزونیت سے بھی آگاہ نہیں تھا پر اُس نے کشمیری، فارسی اور اُردو میں شاعری کی۔ کشمیری تو خیر اس کی مادری زبان تھی اور اُردو سے بھی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

وہ آگاہ تھا مگر فارسی کا اُسے کوئی گیان نہیں تھا۔

میں جانتا ہوں کہ پڑھنے والوں کو میرے لکھے پر اعتبار نہیں آئے گا کیوں کہ آج کے دور میں جب ہر طرف معقولیت کا بول بالا ہے ایسی باتوں پر اعتبار کرنا عام دانش مندی کی کسوٹی پر کھرا اترنے والا نہیں مگر اعتبار نہ آنے پر ان چیزوں کا بہ نفسِ نفیس مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسے سورگباش ہوئے صدیاں تو گذر نہیں گئیں۔ کل تک تو میرے آپ کے ساتھ تھا۔ اسکی تحریریں اس کے احباب کے پاس محفوظ ہیں اور بہت کچھ چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔ اس کے اکثر احباب تو بہ فضل خدا ابھی تک ہمارے درمیان موجود ہیں۔

گوپی کرشن کے نام سے ہمارے ملک کے ایک فیصد لوگ بھی آشنا نہیں ہوں گے۔ مادیت کے اس دور میں اس کی شخصیت ایک ماورائی شخصیت تھی، ایک ایسی شخصیت جو سالہا سال ہمارے درمیان موجود تھا مگر ہماری آنکھیں بینا نہیں تھیں اس لئے اسے پہچان نہیں سکیں۔

رواں صدی میں کشمیر نے دو "گوپی" دیکھے۔ ایک بھگوان گوپی ناتھ اور دوسرا یوگی راج گوپی کرشن۔ دونوں نے آتم گیان کے چراغ روشن کئے اور چلدئے مگر فیضان حاصل کرنے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہی اور ایسا ہونا مناسب بھی ہے کیوں کہ بقول مصطفٰے زیدی ؎

ہر پیمبر پہ ہنسا ہے زمانہ لیکن
ہر پیمبر نے جھکائی ہے زمانے کی جبیں

زمانے کی جبیں جھک تو جاتی ہے مگر تب جب پیمبر اپنا مشن پورا کر کے رختِ سفر باندھ کے چل دیا ہوتا ہے۔ آج جب میں یوگی راج پنڈت گوپی کرشن کی زندگی کی روئیداد قلم بند کرنے کی سعی کر رہا ہوں، مجھے اس حقیقت کا بھرپور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

احساس ہے کہ میں انصاف کر نہیں پاؤں گا کیوں کہ یوگی راج کی زندگی کے اسرار و رموز کو کوئی یوگی راج ہی قلم بند کر سکتا ہے اور میں اُس دنیا۔ اس لطیف اور پُر کشش دنیا سے کوسوں دور ہوں۔ پھر بھی قلم اٹھانے پر اس لئے مجبور ہوا کہ جو لوگ یہ فریضہ انجام دے سکتے ہیں وہ اپنے عالم میں اتنے محو ہیں کہ کوشش کر کے بھی وہ قلم اٹھانے کے لیئے فرصت نہیں نکال سکتے، اس لئے میں انکی زندگی اور کارناموں کو اپنی بساط کے مطابق ضابطہ تحریر میں لانے کی جسارت کرتا ہوں تاکہ مستقبل اور آنے والی نسلیں ہم پر بے التفاتی کا الزام نہ دھریں۔ اس عالم میں میرا دھیان ساتویں دہائی کی طرف جاتا ہے، جب میں جوانی کی آگ میں سلگتا جا رہا تھا اور گوپی کرشن جی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ہٹھ یوگ کی آخری منزل پر پہنچ کنڈلنی (Serpent Power) کو جگا چکے تھے میں ہوا میں لہراتا جا رہا تھا اور وہ ہر قدم پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ اٹھانے کے عادی ہو چکے تھے۔ جوانی سد راہ ثابت ہوئی ورنہ میں نے بھی ضرور یوگی راج سے کسب فیض کیا ہوتا جس کے مواقع بھی موجود تھے۔

سر پر پگڑی باندھے اور آنکھوں پر چشمہ جمائے گوپی کرشن جی سے آشنائی کا دعوای تو میں کر نہیں سکتا ہاں اسے دیکھا ضرور ہے۔ اس شخص کے چہرے بشرے میں ایک مخصوص قسم کی جاذبیت اور مقناطیسی کشش تھی۔ اس کی ہر بات تہہ در تہہ معنویت کی حامل ہوتی تھی۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے میں نے کئی بار اُسے شوالہ مندر کے احاطے میں ٹہلتے دیکھا ہے۔

مشرق والے تو مُردوں کی پوجا کرنے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہیں مگر یوگی راج کے ضمن میں یہ ریت بھی غلط ثابت ہوئی۔ اس کی موت پر ہمارے اخبار یک آدھ کالم کو بھی اس کے لئے وقف نہیں کر سکے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے تو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایسے چپ سادھ لی کہ لگتا تھا دونوں اداروں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ حالانکہ آسٹریلیا کے گڈرئے کے لئے ہمارا میڈیا ایک آدھ گھنٹہ ضرور وقف کر سکتا ہے۔ اپنی مرغی تو دال برابر ہی ہوتی ہے مگر گوپی کرشن مرغی نہیں تھا۔ اُس نے تو شاردا پیٹھ اور ایران عجم کے جھنڈے دور دراز ملکوں میں گاڑے تھے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو اندرون کی ضیا پاشی سے بیرون کی دنیا کو منور کرنے کا متلاشی تھا۔ اس کے روحانی پنگھٹ پر آ کر کتنے ہی لوگوں کی پیاس بجھ گئی مگر اپنوں نے اسے قابل التفات نہیں سمجھا۔ آخر سمجھتے بھی کیوں؟ دولت اور عارضی شہرت کی چاہ نے آج کل کے دانشوروں کو اُن اصولوں اور قدروں سے دور کر دیا ہے جن کی بدولت کسی زمانے میں یہ قطعۂ ارضی رشی بھومی کہلاتا تھا۔ پنڈت گوپی کرشن کے ساتھ جو برتاؤ روا رکھا گیا اُس سے ڈاکٹر کرن سنگھ کا دل بھی پسیج گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے :-

"یہ بات بلاشبہ اس زوال پذیر نظام اقدار کی نشاندہی کرتی ہے جس نے ہمارے ملک میں فروغ پایا ہے کہ پنڈت گوپی کرشن کے سورگباش ہونے کو ہمارے قومی پریس نے محض ایک خبر کے طور پر مشتہر کر دیا۔ ایسا اس حقیقت کے باوصف کیا گیا کہ وہ ایک ممتاز شخصیت تھا جس کے کارناموں نے گذشتہ تین دہائیوں میں نہ صرف ہندوستان کو متاثر کیا بلکہ ہندوستان سے باہر ممالک کو بھی"۔

اس ممتاز شخصیت کی شان ہی نرالی تھی۔ دیکھنے والے تو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے کہ گوپی کرشن جی کے اندر کا یوگی راج کہاں چھپا بیٹھا ہے کیوں کہ اس کی شکل و صورت میں ایک عجیب سی معصومیت تھی۔ اس میں نہ تو کسی قسم کا بانکپن تھا اور نہ ہی کسی قسم کی سج دھج۔ وہ تو ایک عام سا آدمی تھا۔ جو لوگ اُس کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، ان کو کبھی گمان نہیں گذرتا تھا کہ یہی وہ گوپی کرشن ہے جس کے دیدار کو مشرق اور مغرب سے لوگ ترستے ہیں۔ اسکی شخصیت کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے جسٹس جانکی ناتھ بٹ رقمطراز ہے:۔

"وہ لوگ جنہوں نے صرف اس کی تحریروں کو پڑھا اور اُس کے بھاشن کو سنا ہے اس بات سے انکار کریں گے کہ یہ وہی درویش ہے جس نے ساری دنیا میں روحانیت اور سائینس کے میدان میں انقلاب بپا کیا ہے۔ دوسری جانب وہ افراد جو اس سے ایک فرد کے طور پر آشنا ہیں، خواب میں بھی سوچ نہیں سکتے کہ عالمی سطح پر نمائشیں آراستہ کر کے اور تحریروں اور تقریروں سے اس شخص نے کتنی شہرت اور منزلت پائی ہے۔ یہاں نہ تو کسی قسم کی شان و شوکت ہے اور نہ کسی قسم کا غلغلہ، نہ تو دربارداری ہے اور نہ چیلے چانٹے، نہ ہی ارد گرد خوشامدیوں کا غول ہے، نہ ہی کوئی کارندے ہیں جیسا کہ ایسے ممتاز اشخاص کا ہوتا ہے۔ یہاں تو ایک سادہ، حلیم اور تیج وان شخص کے درشن ہوتے ہیں جس کے حضور میں آپ کو ایک لطیف خاموشی اور شانتی کا احساس ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ ایک انسان ہے۔ اس کا سادہ اسلوب قابل فہم ہے، زبان اس کی شخصیت کی عظمت کی ترجمان ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ رہ کر وہ ایک عام گھر گرہستی کی طرح معمول کی زندگی بسر کرتا ہے سوائے ان لمحات کے جب آگاہی کے دروازے اس پر وا ہوجاتے ہیں اور وجدانی کیفیت سے سرشار ہوکر وہ روحانیت کے اسرار و رموز شاعری کے قالب میں ڈھال کر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اُن زبانوں میں بیان کرتا ہے جن زبانوں کا اُسے کبھی بھی علم نہیں تھا۔ وہ ہر اعتبار اور ہر لحاظ سے ایک گرہستی ہے ۔ اگرچہ اس کا جنم ۱۹۰۳ء میں ہوا ہے مگر شکل و صورت سے وہ زیادہ سے زیادہ پچاس سال کا لگتا ہے۔"[1]

اور ڈاکٹر کرن سنگھ نے لکھا ہے :۔

"میں تیس سال پہلے اُس وقت پہلی بار پنڈت گوپی کرشن سے ملا جب میں جموں و کشمیر کا صدر ریاست تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ باقاعدگی کے ساتھ رابطہ بنائے رکھا۔ ہم آخری بار گذشتہ سال سوئیٹزرلینڈ کے صحت افزا مقام داوس کے ایک خوبصورت بنگلے میں ملے جہاں ہم دونوں انٹرنیشنل ٹرانس پرسنل ایسوسی ایشن کی سالانہ کانفرنس میں بطور مقرر مدعو تھے ۔ اس نے کچھ وقت پہلے آٹھ دہائیوں کی سرحد پار کی تھی ۔ کشمیری پنڈت کی روایتی پگڑی باندھے وہ حسب دستور شگفتہ اور داخلی طور پر مضبوط اور مستحکم تھا۔"

پنڈت گوپی کرشن جی جوانی کی شروعات سے ہی یوگ ابھیاس کر رہا تھا۔ پراس کے اندر کنڈلنی کا جاگ جانا اس کی زندگی کا ایک ایسا موڑ تھا جس نے ہر لحاظ سے اس کی کایا پلٹ کے رکھ دی ۔ کنڈلنی جس کا استھان مولادھار ہے کا جاگرن کس طرح ہوا اس کا بیان پنڈت گوپی کرشن جی کی زبانی سنانا ہی بہتر رہے گا۔

"اعصابی دھماکے کی صورت کڑک کے ساتھ ایک آواز آئی اور اسی کے ساتھ تیز رفتار بل کھاتے ہوئے ناگ کی صورت ایک

۱۔ [illegible] ۱۹۷۸ء [illegible]

وہ پہلی لہر سی میرے مغز پشت میں سے گزر گئی جس نے ایک نورانی
آبشار کے روپ میں میرے دماغ پر روحانی قوت کی بارش کردی
اور میرے سر کو ایک مسرت آمیز چمک سے سرشار کر دیا۔"
یہ سنہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے، اس وقت گوپی کرشن جی کی عمر ۳۴ سال تھی۔
یہ اس کے یوگ ابھیاس کا ایک نیا پڑاؤ تھا۔ اس تجربے کے بعد اُسے ذہنی
اور جسمانی طور کافی دیر تک تکلیف کا سامنا رہا۔ یہ ایک امتحان تھا جس کے
نتیجے میں اس کا اعصابی نظام درہم برہم ہو کے رہ گیا۔ وہ زندگی اور موت
کے درمیان لٹکتا رہا اور کبھی کبھی سوچنے لگا کہ کہیں وہ دیوانہ تو نہیں ہو گیا
ہے۔ کچھ لوگ تو اُسے دیوانہ تک سمجھ بیٹھے۔ آخر کار وہ اس تجربے سے سرخرو
ہو کے نکل آیا۔

کنڈلنی کے سرگرم ہونے کی بدولت یوگی راج ایک نئی قوت، ایک نئی
شکتی سے ہم کنار ہو گیا۔ پردے ہٹ گئے اور ایک پُر مسرت دنیا تک اُسے
رسائی حاصل ہو گئی۔ مگر کنڈلنی کے جاگرن کی نسبت خود یوگی راج کو ابتدائی
دور میں کوئی آگاہی نہیں تھی، کیوں کہ یہ سب کچھ یکایک ہو گیا تھا۔ کوئی اشارہ،
کوئی بشارت اُسے مل نہیں سکی تھی۔ چھٹی حس کے بیدار ہونے سے اس کے
اندر کی تمام تر صلاحیتیں متحرک اور سرگرم ہو گئیں، من میں بہت نئی چیزوں کا
احساس گھر کرنے لگا۔ شاعری کے احساس نے بھی انجانے میں اس کے اندر
انگڑائیاں لینا شروع کیں۔ "دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء کے دن تھے اور ......:

تیسرے ہفتے میں مجھے اس حقیقت سے آشنائی ہوئی کہ دھیان
اور سمادھی میں کافی دیر تک ڈوبے رہنے کے بعد جب بھی مجھے
ہوش آتا تھا اور میں عملی دنیا کی طرف لوٹ آتا تھا اس وقت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میرے ہونٹوں پر اپنے محبوب بھگت شاعروں کے اشعار کھیلتے ہوتے تھے۔ تنہائی کے لمحات میں ایسا کرنا میری عادت میں شامل ہو گیا تھا۔ دھیان میں ڈوبے نہ رہنے کے دوران شاعری کرنے کا مجھے ذرہ بھر بھی خیال نہیں آیا مگر میں نے کوششیں کیں۔ ان کوششوں کے دوران میرے سامنے وہی نمونے رہے جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھے۔ اس امر کے علاوہ کہ میں نے متبرک کتابوں میں سے چند درجن سنسکرت اشعار حفظ کئے تھے اس کے علاوہ مجھے اپنے چہیتے بھگت شاعروں کے چند درجن اشعار بھی یاد تھے۔ یہی میری کائنات تھی۔ اس سے آگے مجھے شاعری کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ چند روز تک اشعار لکھنے کی بچگانہ مشق کرنے کے بعد میں مضطرب ہو گیا اور زندگی میں پہلی بار میرے اندر اشعار لکھنے کی خواہش بیدار ہو گئی۔ میں نے اس کا کوئی گہرا اثر یہ محسوس کر کے نہیں دیا کہ یہ ایک وقتی ابال ہے میں نے کچھ اشعار کافی وقت صرف کر کے کاغذ پر لکھ دیئے۔

میں نے ابتدا کشمیری سے کی مگر ایک پندرھواڑے تک روزانہ کوشش کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کوئی بہتری نہیں ہو رہی ہے۔ شاعری کی کوششوں کے باوجود بھی نے میرے جذبے کو کمزور نہیں کیا بلکہ مجھے زیادہ کوشش کرنے پر اکسایا اور اب اس شعبے پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگا اور یہ چیز میرا روزمرہ کا پرکشش مشغلہ بن گیا تھا، مگر منظومات کا معیار رتی بھر بھی بہتر نہیں ہوا۔ مجھے اکثر ایک سطر کو مکمل کرنے میں گھنٹوں لگتے تھے اور اس سے زیادہ وقت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

شعر کو مکمل کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ میں نے اپنے اندر کے اس اُبال کو اس ماورائی قوت کے ساتھ کبھی بھی وابستہ نہیں کیا جو کہ میرے جسم کے اندر سرگرم تھی مگر منظوم لکھنے کی یہ ناکام کوششیں اصل میں اُن حیرت انگیز واقعات کا سوچا سمجھا پیش خیمہ تھیں جو ساتھ ہی وقوع پذیر ہوئے مجھے اندر ہی اندر اس نئے جوہر کو بروئے کار لانے کی تربیت دی جا رہی تھی جو میرے اندر پیدا ہوا تھا جس کے وجود کے بارے میں میں آگاہ نہیں تھا ورنہ میرے اندر کوئی ابال نہیں آتا۔ میری کھردری کوششیں تربیت کے ابتدائی نقوش تھے۔

اُن دنوں کشمیر میں ہمارے چھوٹے سے گروہ کی ایک سرگرم کارکن جموں آئی ہوئی تھیں۔ وہ اکثر ہمارے ہاں سرینگر کی سرگرمیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لئے آتی تھیں۔ سرینگر کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلات مجھے خزانچی اور سکریٹری سے باقاعدگی سے حاصل ہوتی تھیں۔ ایک دن میں نے اُسے گھر تک ساتھ دینے کی پیشکش کی، کیوں کہ میرا خیال تھا کہ لمبی سیر سے میں اُس بے دلی کی فضا سے باہر نکل آؤں گا جس کا ہلکا سا اثر مجھ پر ہوا تھا۔ ہم لوگ اپنے کام کی باتیں کرتے ہوئے خراماں خراماں چل رہے تھے جب توی پل کو پار کرتے ہوئے مجھ پر بے خودی کی کیفیت طاری ہو گئی، یہ بے خودی اس قدر گہری تھی کہ میرا اپنے گرد و نواح سے رابطہ ہی کٹ گیا۔ میں اپنی ساتھی کی آواز بھی سُن نہیں پا رہا تھا، اگرچہ وہ میرے ساتھ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہی چل رہی تھی مگر مجھے لگا کہ وہ کافی دور چلی گئی ہے ۔ اپنے نزدیک لہراتی روشنی میں مجھے اچانک ایسا لگا کہ کہیں سے جس کا کوئی اتا پتا نہیں، ایک طاقتور شعوری قوت ابھر آئی ہے جس نے مجھے گھیر لیا اور ارد گرد بکھری ہوئی دوسری چیزوں پر پردہ گرا دیا ہے ۔ اس روشنی میں سے دو خوبصورت کشمیری اشعار پھوٹ پڑے جو ظہور کی اس حالت میں لہرا رہے تھے جیسے ہوا میں ایک نورانی تحریر ہو جو کہ اتنی جلدی کے ساتھ غائب ہو گئی جتنی جلدی سے یہ منظر پر چھا گئی تھی ۔

ہوش میں آنے پر میں نے دیکھا کہ لڑکی حیرانگی کے عالم میں مجھے دیکھ رہی تھی ۔ اسے تعجب اس بات پر تھا کہ میں نے ایکدم چپ کیوں سادھ لی اور میرے چہرے پر لاتعلقی کیوں کھیل رہی ہے ۔ جو کچھ ہوا تھا اس کا اظہار کئے بغیر میں نے شعر کو دہرایا اور کہا کہ اپنے آپ سے بے خبر ہونے کے باوصف بھی میرے من میں یہ شعر موزوں ہوا، اور یہی چیز ہماری بات چیت میں رکاوٹ کا باعث بن گئی ۔ وہ تعجب کے ساتھ سنتی رہی اور شعر کے حسن سے محظوظ ہوئی ہر لفظ کی تُلنا کر کے وہ بول اٹھی کہ اس شخص کے لئے جس نے پہلے ایک بھی خوبصورت شعر موزوں نہیں کیا ہو، ایسا ہونا ایک معجزے سے کم نہیں، اور پھر اتنی پھرتی کے ساتھ ۔ میں نے خاموشی سے اگلی باتیں سنیں کیوں کہ میں ابھی تک تجربے کی اس شدت میں ڈوبا ہوا تھا جسے گذرے ابھی بہت کم وقت گزرا تھا ۔ اس وقت تک بالا شعور کا جو بھی تجربہ مجھے ہوا تھا وہ بالکل داخلی تھا، جس کو نہ تو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

دکھایا جاسکتا تھا اور نہ ہی دوسرے اس کا تجزیہ کر سکتے تھے۔ مگر اب میرے سامنے پہلی بار ایک قابل قدر تبدیلی کا ثبوت تھا۔۔۔ پندرھواڑہ گزرنے کے بعد زبان تبدیل ہو گئی۔ اب کشمیری کی جگہ اشعار انگریزی میں نازل ہو گئے..... چند دن بعد انگریزی کی جگہ اردو نے لی۔ اردو کے بعد پنجابی میں اشعار کہے..... مجھے اس وقت زبردست حیرانی ہوئی جب کچھ دنوں کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ میں اپنے آپ کو فارسی اشعار کے نزول کے لئے تیار کر لوں۔ میں نے فارسی کبھی پڑھی نہیں تھی اور اس لئے میں یہ زبان سمجھتا بھی نہیں تھا۔ میں بے تابی کے ساتھ منتظر رہا اور ایک اشارے کے ساتھ کچھ فارسی اشعار میرے سامنے لہرانے لگے"۔

اس کے بعد وجدانی حالات میں گوپی کرشن جی پر جرمن، فرانسیسی، اطالوی، سنسکرت اور عربی میں اشعار کا نزول ہوا۔ اپنے تجربات کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

"زبان اس وقت میرا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جب میں ان تجربات کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو وقفے وقفے کے بعد اس وقت سے میرے وجود کی ارفع اور ممتاز خصوصیات میں شامل رہے ہیں"۔

یہ بات بھی نہیں کہ جو شاعری گوپی کرشن جی نے غیر ملکی زبانوں میں کی ہے وہ ابھی تک صیغہ راز ہے اور کسی نے دیکھی یا پڑھی نہیں ہے۔ ان کی غیر ملکی زبانوں میں لکھی گئی نظموں پر بات کرتے ہوئے کارل۔ فریڈرچ فریحا ہرڈان وزسکر لکھتے ہیں:۔

"جس طرح جرمن نظم جرمن لوک گیت کی طرح ہے اسی طرح اطالوی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نظم بھی اطالوی لوک گیتوں سے لگّا کھاتی ہے۔ اسکی بندش cuore کے ساتھ amore ہے۔ قافیہ بندی کی سادگی کے باوجود انگریزی نظم دنیا کی قوموں کے لئے اخلاقی ضابطوں کا بیان ہے اور یہ بیان پیغمبرانہ شان لئے ہوئے ہے۔

ہتھ یوگ کا ابھیاس کرنے والے گوپی کرشن کی دین یہی ہے کہ کنڈلنی جو کہ زمانہ قدیم سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے اور جس کا ابھیاس صرف روایتی گرو کے سامنے زانوئے ادب کو تہہ کر کے ہی کیا جاسکتا تھا کو اس یوگی راج نے تجربہ گاہ میں تجزیہ کا موضوع اور بنیاد بنا دیا۔ یہ شاید پہلی بار ہوا ہے کہ ایک داخلی تجربے ایک ماورائی کیفیت کو تجربہ گاہ میں تحقیق اور تجزئے کی بنیاد بنایا گیا ہو۔ چنانچہ گوپی کرشن جی کی ایما پر حکومت ہند نے ڈاکٹر کرن سنگھ کے وزیر صحت ہونے کے دوران ایک منصوبہ ترتیب دیا تھا۔ اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لئے یوگی راج کی خواہش کیمطابق کچھ میڈیکل سائینسدانوں، ماہرین نفسیات، فلسفیوں اور یوگیوں کا انتخاب ہوا تھا۔ منصوبے کا نام Project Concious-ness تھا۔ اس منصوبے کے لئے بنگلور کے انسٹی چیوٹ آف مینٹل ہیلتھ اور نیرو سائینس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ الیکٹرانک ساز و سامان کی مدد سے پہلی بار اُن تبدیلیوں کا پتہ لگایا جائے جو تبدیلیاں اُس وقت رونما ہوتی ہیں جب کنڈلنی شکتی کا جاگرن ہو۔"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں کنڈلنی مراکز کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ جن مقامات پر یہ مراکز سرگرم عمل ہیں اُن کے نام اس طرح ہیں: کینیڈا، نیویارک، لاس اینجلز (کیلی فورنیا)، سوئٹزرلینڈ، سٹانزبرگ، برلن، فلورنس (اٹلی) لنڈن اور پیرس۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں بھی ایسے مراکز کی خاصی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ سبھی مراکز گوپی کرشن جی کی ذاتی کاوش کی مدد سے قائم ہوئے تھے۔

اگرچہ گوپی کرشن جی انگریزی کی اتنی ہی شُد بُد رکھتے تھے جتنی کہ ایک عام پڑھا لکھا آدمی رکھتا تھا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے کہ نامساعد حالات نے اسے ڈگری تک رسائی حاصل کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا تھا مگر کنڈلنی جاگرن کے بعد اس کا قلم جلال کے ساتھ متحرک ہوا اور اس نے ہٹھ یوگ اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر کئی ایک کتابیں لکھیں اور اپنی تحریروں کا لوہا ہر جگہ منوایا۔ اس کی لکھی ہوئی کتابوں پر تبصرہ کرنا اس مختصر مضمون کے دائرے سے باہر ہے مگر کتابوں کا ذکر مناسب رہے گا تاکہ آنے والے کل کے محققین کے لئے راستہ بنا رہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس کی لکھی ہوئی ساری کی ساری کتابیں انگریزی میں ہیں۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے:

(1) Kundalini – 1968
(2) Biological Basis of Religion and genius – 1971-72.
(3) The secret of Yoga:
(4) What is and what is not higher consciousness.
(5) Awakening of kudalini
(6) Dawn of new science Vol. I
(7) Riddle of consciousness – verse

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

(8) Secret of Kundalini in Panchastavi
(9) Yog a vision of its future.
(10) Kundalini — the Custodian of human Evolution.
(11) Shape of events to come — verse — 2 vol.
(12) Dawn of new Science — vol II
(13) Autobiography before awakening
(14) From Humanity to transcedental consciousness.

پنڈت گوپی کرشن کی پہلی کتاب 'کنڈلنی' کا ترجمہ اب تک جرمن، فرانسیسی، ہسپینی، جاپانی، ہندی، بنگالی، تیلگو، ملیالم، تامل، اطالوی، ڈچ، گجراتی، مراٹھی اور چینی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کی دوسری کتابوں کے ترجمے بھی دوسری زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں۔ کشمیری اور اردو میں ابھی تک انکی کوئی بھی چیز اشاعت پذیر نہیں ہوئی ہے۔

گوپی کرشن کو اپنے نہیں جانتے تھے مگر کشمیر سے باہر اُن کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ اکثر عالمی دوروں پر ہوتے تھے ان کو عالمی اور قومی سطح کی کانفرنسوں میں غور سے سنا جاتا تھا۔ سائینس اور روحانیت کے درمیان ہم آہنگی کی جو طرح اُنہوں نے ڈالی ہے وہ کافی دور تک مختلف ذہنی اور روحانی مسائل کو سلجھانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کی باتوں اور تجربات کی صداقت ہی لوگوں کو ان کے پاس مغرب کے دور دراز علاقوں سے کھینچ لاتی تھی اور اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ سرچشمے کو ہی اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ سنہ ۱۹۶۸ء کے بعد گوپی کرشن جی اکثر مغربی ممالک کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اور کبھی کبھار ہی انہیں کشمیر میں کافی دیر تک قیام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ متعدد بار مغربی دنیا کا دورہ کرنے کے بعد بھی انہیں ممتاز شخصیات کی طرف سے دعوت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نام ملتے تھے کہ وہ دوبارہ وہاں آجائیں، ایسے ممالک اور جگہوں میں نیویارک، زورک،
مونٹینا، کیلیفورنیا، ٹورنٹو، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی وغیرہ شامل ہیں۔

پنڈت گوپی کرشن کی زندگی الجھاؤ اور گورکھ دھندے سے کافی دور تھی۔ سادگی پسند یوگی راج کی تحریروں میں بھی اُنکی شخصیت اسی آب و تاب سے نمایاں ہے جس طرح عملی زندگی میں لوگ اُن کی زندگی کا مشاہدہ کرتے تھے۔ وہ بڑی سے بڑی اور مشکل سے مشکل حقیقت کو سادہ اور الجھاؤ سے کوسوں دور جملوں میں بیان کرتے ہیں۔ اور اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایک عام قاری بھی مستفید ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کنڈلنی پر یوں تو ہزاروں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ اکثر کتابیں اصطلاحوں سے اتنی مزین اور مرصع ہیں کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی انسان کے پلے کچھ نہیں پڑتا ___ الفاظ کا گورکھ دھندا اور جملوں کا الجھاؤ ___ اب دیکھیے کس آسان انداز میں وہ کنڈلنی کی وضاحت کرتے ہیں:۔

" ذہنی اور جسمانی کسرت کا مشکل نظام جس کا خصوصی تعلق کنڈلنی کے ساتھ ہے اصطلاحی طور پر یوگ کے دوسرے طور طریقوں کے مقابلے میں جو کہ زمانہ قدیم سے ہندوستان میں مروّج ہیں ہتھ یوگ کہلاتا ہے۔ ہتھ سنسکرت میں دو لفظوں کا مرکب ہے ___ "ہا" اور "تھ" جس کے معنی چندرما اور سورج کے ہیں۔ اس طرح سے ہتھ یوگ اس طریقہ کار کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ان دو دوروں کے اتصال سے معرض وجود میں آتا ہے۔ مختصراً یہ کہ جس طرح یہاں پر سورج اور چندرما کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا مدعا وہ لہریں ہیں جو مقرلیشت کے بائیں اور دائیں دو ناڑیوں کے ذریعے چلتی ہیں جن کا نام اِڑا اور پینگلا ہے۔ اولین ناڑی ٹھنڈک کا ذریعہ ہے اور اس

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کو چاند کی زرد روشنی سے مشابہت دی گئی ہے اور اسے سورج کی گرمی کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔ یوگ کے تمام نظام اس مفروضے پر قائم ہیں کہ زندہ چیزوں کی زندگی کا دارومدار ایک ایسے ذریعے کے ساتھ ہے جو غیر مادی ہے اور ساری کائنات میں جاری وساری ہے اس ذریعے کو 'پران' کہا گیا ہے۔"

کنڈلنی جاگرن کرنے والے گوپی کرشن جی عملی زندگی سے کبھی بھاگے نہیں بلکہ اس میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ہندوؤں میں تقاریب کے مواقع پر اقتصادی سدھار کی تحریک شروع کی کیوں کہ انہیں ان لوگوں کی بدحالی کا زبردست احساس ہو چلا تھا جو اقتصادی طور پر کمزور ہونے کے باوجود رسومات بد کی چکی میں پسے جا رہے تھے۔ اس غرض سے جو تنظیم وجود میں آگئی اسے سماج سدھار سمتی کا نام دیا گیا اور پنڈت گوپی کرشن اس کے کافی دیر تک صدر رہے۔ اس تنظیم نے خاصا اچھا کام کیا اگرچہ لوگوں کی عدم توجہی نے اسے زیادہ پھیلنے کا موقع نہیں دیا۔ یہ تنظیم "جیوتی" کے نام سے ایک اخبار کا اجرا بھی کرتی تھی۔ گوپی کرشن جی نے سماج سدھار کی ٹھان لی تھی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے موسم گرما میں انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی بالکل سادگی کے ساتھ کی اور دکھایا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ ۱۹۴۸ء میں دیہات اور دور دراز علاقوں سے اکھڑے ہوئے ہزاروں لوگوں کو راحت پہنچانے میں پنڈت گوپی کرشن نے کافی اہم کام کیا۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں آپ سماج سدھار سمتی کے کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے کافی مصروف رہے۔ اس سال افراتفری کی وجہ سے اور وقتی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر وہ رخصت لینے پر بھی تیار تھے کیوں کہ انہیں قاعدے کے مطابق

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جموں جانا تھا مگر اس سال کسی طرح اُن کا جموں جانا ٹل گیا اور وہ رفیو جیوں کی بہتری کو یقینی بنانے کے کام میں دل و جان سے لگے رہے۔

اس کے علاوہ آپ ۱۹۴۶ء میں کم تنخواہ پانے والے ملازموں کی تنظیم کے صدر بھی رہے اور اپنا فرض اچھی طرح انجام دیا۔ آپ ۱۹۶۷ء میں ایکشن کمیٹی کے صدر بھی رہے مگر بعد میں اس سے کنارہ کر لیا۔ آپ ۱۹۶۷ء میں مرکزی یورپی ممالک کے دورے پر گئے اور ۱۹۶۹ء میں آپ نے جرمنی کا دورہ بھی کیا۔

"کنڈلنی" یوگ کے سلسلے میں آپ نے نشاط (سرینگر) میں ایک تجربہ گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا تھا۔ گوپی کرشن جی کا جنم جون ۱۹۰۳ء میں ترال کے پاس پہاڑی گبورہ اور آج کل کے نور آباد میں ہوا تھا جہاں آپ کا ننھیال تھا۔

آپ کے پتاجی اگرچہ نسلاً کشمیری تھے مگر وہ امرتسر میں آباد تھے۔ بقول گوپی کرشن لاقانونیت اور سلامتی کے عدم احساس نے اُن کے اجداد کو کشمیر چھوڑنے اور پنجاب میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے پتاجی ایک صوفی منش شخص تھے۔ ترنگ میں آکر انہوں نے امرتسر کو چھوڑ کر اپنے آبائی وطن میں بسیرا کرنے کی ٹھان لی جس سے انہوں نے کشمیر کا رخ کیا اس وقت انہوں نے کم و بیش جوانی کی سرحدوں کو پار کیا تھا مگر تو بھی انہوں نے شادی کرنے کی ٹھان لی اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی سے جو عمر میں اس سے کافی چھوٹی تھی۔ گھر گرہستی کے دوران بھی وہ اکثر سادھوؤں سنیاسیوں اور یوگیوں کی صحبت میں رہنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ بنیادی طور پر اُن کا رجحان مذہبیات اور یوگ کی طرف تھا۔ سچ پوچھئے تو وہ گھر میں رہ کر بھی سنیاسی کا جیون بتا رہے تھے۔ آخر کار انہوں کا میلان طبع رنگ لایا۔ شادی کے بارہ سال بعد انہوں نے مکمل تیاگ کا راستہ اپنالیا۔ اس ضمن میں ان کے پانچ سالہ بچے کی موت محرک ثابت ہوئی۔ پچاس کی سرحد

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے اس پار ہی انہوں نے ایک اچھے خاصے عہدے سے قبل از وقت فراغت حاصل کی اور ایک کمرے میں ڈیرا جما کر بیٹھ گئے۔ جہاں اُن کی جلیس صرف کتابیں تھیں۔

جس وقت گوپی کرشن جی کے والد نے سنسار سے کنارہ کیا اس وقت انکی والدہ کی عمر اٹھائیس کے آس پاس تھی۔ ایک کمزور اور ناتواں عورت اور تین کمسن بچے۔ ایک لڑکی اور دو لڑکے۔ ایک بار گراں تھا مگر اعتماد اور استقلال کے سہارے اس نے بچوں کی پرورش کی اور اس کے ساتھ ہی شوہر کے ناز بھی اٹھاتی رہی۔ ستی ساوتری کی طرح اس نے اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو انجام دیا۔ اس پر طرہ یہ کہ سنیاس لینے کے بعد والد صاحب بچوں کے ساتھ بات تک نہیں کرتے تھے۔

یوگ کے ساتھ گوپی کرشن جی کو بچپن ہی سے لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ انہیں چھوٹی عمر میں ہی فالتو کتابیں پڑھنے کا چسکہ بھی پڑا تھا جس نے انہیں نصاب کی کتابوں سے دور کر دیا۔ ایک ذہین طالب علم ہونے کے باوجود وہ امتحان پاس نہیں کر سکے۔ ماں کی مشکلات کا علم ہونے کی وجہ سے وہ حقیقت بیانی سے اس کے دل کو دکھانا نہیں چاہتے تھے جس نے بالآخر انہیں یوگ کے اس راستے پر لا کھڑا کیا جو کافی دور تک جاتا ہے۔ چنانچہ جن دنوں وہ لاہور میں اپنے والدین کے ساتھ زیر تعلیم تھے اُن ہی دنوں انہوں نے دھیان (مراقبہ) کو اپنا معمول بنا دیا۔ پہلے تو وہ تھوڑی دیر دھیان کرتے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ گھنٹوں دھیان میں محو رہتے تھے اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ مگر ان حالات میں بھی وہ گھر سے وابستہ رہے اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس ان کے دل میں موجزن رہا۔ یوگ کی راہ پر پڑنے کے بعد وہ ڈگری کا امتحان پاس نہیں کر سکے۔ کشمیر آ کر آپ ۱۹۲۳ء میں آبپاشی کے محکمے میں کلرک

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تعینات ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں شادی کی۔ پنڈت گوپی کرشن کم و بیش ۲۷ سال تک سرکاری ملازم رہے اور آخر میں پتاجی کے نقش قدم پر چل کر آپ نے ۱۹۵۰ء میں قبل از وقت نوکری سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جتنی دیر زندہ رہے ہٹھ یوگ کی سادھنا اور اس کے پرچار میں مصروف رہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری سماجی ذمہ داریاں بھی سنبھالتے رہے۔ آخر کار ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء کو آپ نے جسم کو تیاگ کر اُس نگری کی اور پرواز کیا جہاں سے کسی کو لوٹ کے آتے دیکھا نہیں گیا۔ اُن کے آخری سفر کی روئیداد ڈاکٹر کرن سنگھ کی زبانی سننا زیادہ مناسب رہے گا۔

"ہم نے اس سال دوبارہ کشمیر میں ملنے سے اتفاق کیا تھا۔ جون میں اگرچہ میں وہاں ہی تھا مگر مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کرن نگر میں اپنے گھر رہیں۔ میں جولائی کے آخر میں امرناتھ پوجا کے سلسلے میں دوبارہ وہاں تھا اور جبھی مجھے پتہ چلا کہ وہ ۳۱ کو سورگباش ہوئے ہیں۔ یکم اگست کو میں اُن کے گھر گیا اور اپنے ساتھ ڈل سے لائے گئے بارہ کنول لے گیا جو کہ اتفاق سے اس صبح نذر کئے گئے تھے۔ وہاں مشکل سے پچاس کے قریب لوگ موجود تھے۔ ہم نے اُن کی ارتھی کو گیارہ کنولوں سے سجایا اور بارھویں کنول کو اُن کے سینے پر رکھ دیا۔ کنڈلنی شاستروں میں بارہ پنکھڑیوں والا کنول ایک اہم علامت ہے۔ اس سے میری کچھ کچھ تشفی ہوئی کہ میں انہیں اس طرح سے خراجِ عقیدت نذر کر سکا"۔

کتابیات:

(1) VITASTA (BAHARI KASHMIR Number) 1978

(2) Kundalini — Pt. Gopi Krishen

(3) The BIOLOGICAL BASIS OF RELIGION & GENIUS — Pt. Gopi Krishen

(4) Pandit Gopi Krishen — A remarkable Figure — Dr. Karan Singh 1984.

(5) J&K Year Book C.E. Mulk Raj Saraf — 1978.

—O—

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سیدہ جبینہ احمد اندرابی

مولانا سیّد میرک شاہ اندرابی

کئی سال پہلے کی بات ہے ایک مشاعرے میں علامہ انور صابری کو سننے کا اتفاق ہوا۔ اس مشاعرے میں ملک کے نامی گرامی شعراء موجود تھے لیکن جو واہ واہ اور تعریف علامہ انور صابری کو ملی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ مشاعرے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی اور باتوں باتوں میں میرے خاندان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں مولانا سیّد میرک شاہ اندرابی کا پوتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ علامہ سنجیدہ ہو گئے اور چند لمحے تک بالکل سکوت اختیار کر لیا۔ انہوں نے اپنا سر بھی کسی حد تک جھکا لیا۔ پھر جب انہوں نے اپنا سر اوپر کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انہوں نے ایک کاغذ ہاتھ میں لیا اور اس پر کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد کاغذ کو میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے دیکھا تو اس پر ایک شعر لکھا ہوا تھا جو علامہ نے فی البدیہہ کہا تھا ؎

دل پہ کیا گذری کہوں کیا دیکھ کر شکل و جبیں
یاد آئی مقتدر اُستاد میرک شاہ کی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تعینات ہوئے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں شادی کی۔ پنڈت گوپی کرشن کم و بیش ۲۷ سال
تک سرکاری ملازم رہے اور آخر میں پتاجی کے نقشِ قدم پر چل کر آپ نے سنہ ۱۹۵۰ء میں قبل
از وقت نوکری سے فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ جتنی دیر زندہ رہے ہمیشہ یوگ
کی سادھنا اور اس کے پرچار میں مصروف رہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسری سماجی
ذمہ داریاں بھی سنبھالتے رہے۔ آخرکار ۳۱ جولائی سنہ ۱۹۸۴ء کو آپ نے جسم کو تیاگ
کر اُس نگری کی اور پرواز کیا جہاں سے کسی کو لوٹ کے آتے دیکھا نہیں گیا۔ اُن
کے آخری سفر کی روئیداد ڈاکٹر کرن سنگھ کی زبانی سننا زیادہ مناسب رہے گا۔

"ہم نے اس سال دوبارہ کشمیر میں ملنے سے اتفاق کیا تھا۔ جون میں اگرچہ
میں وہاں ہی تھا مگر مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کرن نگر میں اپنے گھر رہے ہیں۔
میں جولائی کے آخر میں امرناتھ پوجا کے سلسلے میں دوبارہ وہاں تھا اور
جبھی مجھے پتہ چلا کہ وہ ۳۱ کو سورگباش ہوئے ہیں۔ یکم اگست کو میں
اُن کے گھر گیا اور اپنے ساتھ ڈل سے لائے گئے بارہ ۱۲ کنول لے گیا جو کہ
اتفاق سے اس صبح نذر کئے گئے تھے۔ وہاں مشکل سے پچاس کے قریب
لوگ موجود تھے۔ ہم نے اُن کی ارتھی کو گیارہ کنولوں سے سجایا اور بارھویں
کنول کو اُن کے سینے پر رکھ دیا۔ کنڈلنی شاستروں میں بارہ پنکھڑیوں
والا کنول ایک اہم علامت ہے۔ اس سے میری کچھ تشفی ہوئی کہ میں
انہیں اس طرح سے خراجِ عقیدت نذر کر سکا۔"

کتابیات:

(1) VITASTA (BAHARI KASHMIR Number) 1978
(2) Kundalini — Pt. Gopi Krishen
(3) The BIOLOGICAL BASIS OF RELIGION & GENIUS — Pt. Gopi Krishen
(4) Pandit Gopi Krishen — A remarkable Figure — Dr. Karan Singh 1984.
(5) J&K Year Book C.E. Mulk Raj Saraf — 1978.

—o—

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سیّدہ وجیہہ احمد اندرابی

مولانا سیّد میرک شاہ اندرابی

کئی سال پہلے کی بات ہے ایک مشاعرے میں علامہ انور صابری کو سننے کا اتّفاق ہوا۔ اس مشاعرے میں ملک کے نامی گرامی شعراء موجود تھے لیکن جو داد و تعریف علامہ انور صابری کو ملی کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ مشاعرے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی اور باتوں باتوں میں میرے خاندان کا ذکر چل نکلا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں مولانا سیّد میرک شاہ اندرابی کا پوتا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ علامہ سنجیدہ ہوگئے اور چند لمحے تک بالکل سکوت اختیار کرلیا۔ انہوں نے اپنا سر بھی کسی حد تک جھکا لیا۔ پھر جب انہوں نے اپنا سر اوپر کیا تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انہوں نے ایک کاغذ ہاتھ میں لیا اور اس پر کچھ لکھنے لگے۔ اس کے بعد کاغذ کو میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے دیکھا تو اس پر ایک شعر لکھا ہوا تھا جو علامہ نے فی البدیہہ کہا تھا ؎

دل پہ کیا گذری کہوں کیا دیکھ کر شکلِ وجیہہ
یاد آئی مقتدر اُستاد میرک شاہ کی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اب میری سمجھ میں علامہ کے سنجیدہ ہونے کی بات آئی۔ پھر وہ مجھے میرے دادا کے متعلق بتاتے رہے۔ انہیں اس بات کا فخر تھا کہ وہ مولانا میرک شاہ اندرابی جیسے عالم و فاضل اُستاد سے فیض یاب ہوئے ہیں۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی مولانا میرک شاہ اندرابی سے میرا تعلق سن کر میری بڑی عزت افزائی کی اور بڑے فخر سے مولانا کے شاگردِ رشید ہونے کا ذکر کیا۔ اسی دوران مولانا مفتی عتیق الرحمٰن تشریف لائے تو اکبر آبادی صاحب نے میرا تعارف اس طرح کرایا "تمہارے اُستاد زادے ہیں حضرت مولانا میرک شاہ اندرابی کے پوتے۔۔!"

دنیائے علم و ادب کی اتنی مقتدر ہستیوں کی زبان سے اپنے دادا کی عظمت اور بزرگی کی داستان سنی تو ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے شوق نے دل میں چٹکی لی کیونکہ دیکھنے کا تو انہیں اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے کہ سنہ ۱۹۳۶ء میں وہ آخری بار سرینگر آئے تھے اور میں اُن دنوں کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش میں مصروف تھا اس لئے ان کی شکل و صورت کا دھندلا سا عکس بھی میرے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ نہیں تھا۔

سنہ ۱۹۶۷ء میں اپنی نظر بندی کے دوران مجھے سری نگر کے سنٹرل جیل میں مولانا محمد سعید مسعودی کے ساتھ چند مہینے گزارنے کا موقعہ ملا اور اسی مدت کے دوران مجھے اپنے دادا کے متعلق صحیح جانکاری حاصل ہوئی ۔۔ ان کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے کارنامے سننے کا اتفاق ہوا کیونکہ مولانا محمد سعید مسعودی بھی میرے دادا کے شاگرد رہ چکے ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف علم و ادب کے میدان میں بلکہ سیاست کے ریگزار میں بھی قدم سے قدم

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ملا کر سفر کر چکے ہیں۔

مولانا میرک شاہ اندرابیؒ کے جد اعلیٰ حضرت سید احمد اندرابیؒ جو علم و عرفان کا مجسمہ تھے، اپنے ماموں حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ وارد کشمیر ہوئے اور یہاں کے لوگوں کو علمی و روحانی فیوض سے مالا مال کیا۔ اور پھر مستقل طور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ کا تذکرہ کشمیر کی تواریخ میں نمایاں طور موجود ہے۔ کشمیر کے ایک مشہور مورخ شیخ عبد الوہاب شائق نے اپنی تاریخ میں آپ کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

حسینیؓ نسب سید احمد بنام — کہ بود است از اولیائے کرام
ز یاران امیر کبیرؒ است او — بزہد و ورع بے نظیر است او
حسینیؓ نسب بود آن پاک تن — حسب داشتن چوں امام حسنؓ
ز سید چہ گویم کہ چوں بودہ است — کمالاتش از حد بیروں بودہ است

حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ نے وادی کشمیر میں تبلیغ اسلام کا فریضہ انجام دے کر واپسی کا ارادہ کیا تو کئی خدا پرست بزرگوں کے ساتھ اپنے بھانجے سید احمد اندرابیؒ کو بھی خصوصی طور اپنے پاکیزہ مشن اور اصلاح معاشرے کی تکمیل کے لئے کشمیر میں مستقل طور سکونت کی تلقین فرمائی جسے برخوردار اور سعادت مند بھانجے نے خندہ پیشانی سے قبول کیا اور یہیں کے ہو کر رہ گئے چنانچہ میرہ محلہ ملارٹہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے علم و فضل اور ولایت کے اعلیٰ مقام سے متاثر ہو کر سلطان سکندر نے اسی محلے میں آپ کیلئے ایک خانقاہ

---

* اندراب ایران کی سرحد کے قریب افغانستان کی ایک سرسبز وادی کا نام ہے۔ آب و ہوا معتدل اور خوشگوار ہے۔ یہاں کے لوگ انتہائی شریف، سخی اور بہادر ہیں اور فارسی زبان بولتے ہیں۔ مساجد کے علاوہ علمی مراکز بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور تشنگان علم یہاں اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے دور دور سے آتے ہیں۔ اس وادی کے لوگوں کو جھوٹ سے سخت نفرت ہے اور اپنے نسب کے بارے میں جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں +

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تعمیر کرائی جو تواریخ میں خانقاہ اندرابیہ کے نام سے مشہور ہے آج بھی یہاں باقاعدگی کے ساتھ نماز پنجگانہ ادا کی جاتی ہے۔ مولانا سید میرک شاہ اندرابیؒ حضرت سید احمد اندرابی رحمتہ اللہ علیہ کی سترھویں پشت سے پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد سید مصطفیٰ شاہؒ اپنے وقت کے مشائخ کرام میں شمار ہوتے تھے۔ مولانا میرک شاہ اندرابی سنہ ۱۳۰۶ ہجری کے ماہ صفر میں تولد ہوئے۔ اسی ماہ کی پانچ تاریخ کو آپ کے جدِ امجد سند العارفین حضرت شیخ وسید محمد میرک اندرابیؒ کا یوم وصال بھی ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے آپ کے والد ماجد نے آپ کا نام میرک شاہ رکھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد اور بہنوئی سے حاصل کی اور اس دوران پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد مولانا مفتی محی الدین صاحب فتحکدلی اور مولانا محمد حسین وفائی سے صرف ونحو، منطق، فلسفہ، اصول فقہ، حدیث وتفسیر اور معانی بیان کی کچھ بنیادی کتابیں کمال شوق سے پڑھیں۔ درمیانی درجہ کی اس تعلیم میں امتیازی درجہ حاصل کیا تو ماہی بے آب کی طرح اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر تڑپنے لگے۔ حسن اتفاق سے ان ہی دنوں شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمتہ اللہ علیہ دار العلوم دیوبند سے اپنے آبائی گاؤں ورنو، لولاب تشریف لائے۔ مولانا سید میرک شاہ اندرابی ملاقات کی خاطر ان کی خدمت میں جا پہنچے۔ حضرت علامہ نے ان کی امتیازی علمی استعداد اور عملاحیتوں کو فوری طور پر بھانپ لیا اور دار العلوم میں حاضر ہونے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سرینگر سے باہر قدم رکھنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ اس زمانے میں سید گھرانوں یا ایسے گھرانوں میں جہاں مذہبی ماحول میں بچے سانس لے کر شباب کی حدوں کو چھوتے تھے انگریزی پڑھنے کا تصور تک کرنا بھی گناہ کبیرہ کے مترادف تھا لیکن مولانا میرک شاہ انگریزی کی بھی تھوڑی بہت شدھ بدھ

ٹ سالِ ولادت (۱۳۰۶ھ) کی مناسبت سے اُن کا نام "مختار اللہ" تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رکھنا چاہتے تھے اس لئے رات کے وقت اپنے کمرے کی کھڑکی سے صحن میں آجاتے اور ڈیوڑھی کھول کے رات کے اندھیرے میں انگریزی پڑھنے رعنا واری چلے جایا کرتے اور نصف شب کو واپس آجاتے۔ اپنے ہم درسوں میں وہ شاید فرد واحد تھے جو انگریزی پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے۔ خیر میں بات کر رہا تھا اُنکے حصولِ علم کی۔ حصولِ علم کے شوق نے آپ کے لئے یہ سفر آسان بنا دیا اور آپ نہایت مستعدی کے ساتھ اس کی تیاری میں لگ گئے۔ اس سفر میں آپ کے ساتھی مرحوم میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ بھی تھے۔ مولانا انور شاہ کشمیری رح اور دوسرے علمائے کرام کی خصوصی توجہ اور التفات سے تقریباً سات سال تک اس عظیم درسگاہ میں کوثرِ علم کے جام لنڈھاتے رہے۔ مولانا عبدالکبیر ریشہ سابق پرنسپل جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل بھی اسی زمانے دارالعلوم کے طالب علموں میں شامل تھے۔ ایک ملاقات میں انہوں نے میرے سامنے کھلے ذہن سے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ مولانا سید میرک شاہ ہم سے کہیں زیادہ ذہین اور ممتاز طالب علم تھے جس کی بنا پر شیخ الحدیث حضرت علامہ انور شاہ رح انہیں میرک شاہ کے بجائے "زیرک شاہ" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا نے دورہ حدیث کی تکمیل کے بعد دارالعلوم سے امتیازی پوزیشن کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ اس دوران اساتذہ کرام کے مشورے سے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل (آنرز ان عربک) کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آنے کے نتیجے میں گولڈ میڈل کے حقدار قرار دیئے گئے۔ اگلے سال منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کا امتحان دے رہے تھے کہ والد محترم کے انتقال پُر ملال کی خبر تار کے ذریعہ موصول ہوئی لیکن اس رنج والم اور بے چینی کے عالم میں بھی امتحان دیتے رہے اور کامیابی حاصل کی۔ آپ کی علمی زندگی کا آغاز ۱۹۲۲ء میں اُس وقت ہوا جب اپنے اساتذہ

کرام اور دارالعلوم کے ارباب اہتمام کی تجویز سے دارالعلوم ہی میں مدرّس اور نائب مفتی کی حیثیت سے علمی خدمات انجام دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ جامعہ امدادیہ مرادآباد میں تدریسی خدمات کے علاوہ صدر مفتی کے طور پر بھی کام کیا۔ آپ کی رہائش گاہ کے قریب مفتی ٹولہ کی عالی شان مسجد میں روزانہ آپ کا درس قرآن ایسے علمی حقائق و معارف پر مشتمل ہوتا کہ بڑے بڑے فضلاء، اہل علم حضرات شوق و ذوق کے ساتھ حلقۂ درس میں شامل ہو کر فیض یاب ہوتے۔ مولانا نے اس کے علاوہ بھی ملک کے کئی اہم علمی اداروں میں بہ حیثیت مدرّس اور صدر مدرس خدمات انجام دیں خاص کر فتنۂ ارتداد کے زمانے میں آپ نے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا اور اپنے ساتھ علماء اور طالب علموں کی ایک جماعت لے کر ان شہروں اور دیہات تک پہنچے جہاں یہ فتنہ شباب پر پہنچ چکا تھا۔ اللہ نے آپ کو ہر جگہ سرخروئی اور کامیابی عطا کی اور یوں یہ فتنہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

مولانا سنہ ۱۹۳۳ء تک دیوبند آتے جاتے رہے جب کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ہی وہ اس عظیم دانش گاہ سے فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ ایک طرف وہ دارالعلوم میں مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور دوسری طرف انہیں دل ہی دل میں اپنے مادرِ وطن کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اخلاقی بدحالی کی زبردست فکر نے بے چین کر رکھا تھا چنانچہ سنہ ۱۹۲۴ء میں کشمیر آئے تو خلافت کمیٹی کی تحریک کا بیج بھی یہاں بو دیا۔ کمیٹی کے اہتمام سے کئی جلسے بھی ہوئے جن میں اخوت اسلامی اور انسانی بھائی چارے کی قدروں کی آبیاری پر زور دیا تھا۔ اسی دوران انہوں نے سیاست میں باضابطہ طور پر حصہ لینا شروع کر دیا۔ انجمن حمایت بیکساں قائم کی۔ اس کا مقصد یتیم اور بے کس بچوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش تھا۔ چنانچہ اپنے گھر میں بھی کئی یتیم بچوں کو رکھا اور ان کی تعلیم و تربیت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کا انتظام کیا۔ شخصی حکومت کیخلاف تحریک نے شدت اختیار کی توڈوگرہ حکومت تشدد پر آتر آئی اور اس نے تحریک کے قائد شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کو ہاری پربت۔ کے قلعہ میں نظر بند کردیا۔ عوام پر ظلم وجبر کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور اس طرح تحریک دم توڑنے لگی۔ اس موقعہ پر مولانا نے نیچے لکھے کارکنوں سے مشورہ کرکے شاہی مسجد میں وعظ و تبلیغ کی مجالس شروع کیں۔ یہ سلسلہ انہوں نے تقریباً دو مہینے جاری رکھا۔ لوگ جوق در جوق ان مجلسوں میں شریک ہوتے اور مولانا زور خطابت کے ایسے دریا بہاتے کہ لوگوں کے دل و دماغ سیراب ہو جاتے اور سیاسی شعور ایسی انگڑائیاں لیتا کہ پژمردہ چہرے کھل اٹھتے۔ جموں و کشمیر مسلم کانفرنس ۱۹۴۷ء تک قائم رہی اور مولانا اس کے سرگرم ممبر رہے۔ تقسیم ملک کے وقت مولانا لاہور پاکستان میں قیام پذیر تھے اور سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرکے علمی مصروفیات میں منہمک ہو گئے تھے۔ چنانچہ مرحوم لیاقت علی خان اور خواجہ ناظم الدین نے آپ کو کئی اعلیٰ مناصب پر کام کرنے کی پیشکش کی جسے آپ نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کردیا کہ مجھے ایک خالص اسلامی مملکت میں ادنیٰ خادم کی حیثیت سے کام کرنے میں فخر محسوس ہوگا۔!

مولانا مرحوم نے برصغیر ہند و پاک کے بہت سے علمی اداروں میں ممتاز مناصب پر کام کیا۔ دارالعلوم دیوبند کے علاوہ آپ نے مراد آباد، ڈھابیل اور سہارنپور کی درسگاہوں میں بحیثیت مدرس اور مفتی خدمات انجام دیں اور پاکستان کے قیام سے کچھ عرصہ پہلے آپ اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد میں سکھر میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بھی کام کیا اور کچھ عرصہ پاک پنجاب کے وقف بورڈ کے صدر بھی رہے۔

مولانا کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی دراز ہے۔ لیکن عمر کے آخری دور میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

چونکہ آپ کی صحت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی اس لئے بہت سی تصنیفات تکمیل کے مراحل میں داخل نہ ہو سکیں۔ نظام حیدرآباد نے عربی فلسفہ کی مشہور تصنیف "اسفار اربعہ" کی چار جلدوں کا ترجمہ کرنے کے لئے اپنے وقت کے چار مشہور علماء کا انتخاب کیا تو ان میں ایک مولانا میرک شاہ کی ذات گرامی بھی تھی چنانچہ مولانا نے ترجمہ مکمل کر کے بھیجا تو نظام کو اس قدر پسند آیا کہ اس زمانے میں تین ہزار روپے کی گراں قدر رقم بطور انعام مولانا کی خدمت میں بھیج دی۔ مولانا نے عربی میں جو کتابیں لکھیں اُنکے نام درج ذیل ہیں: شرح موطا امام مالکؒ، شرح سبعہ معلقہ، حاشیہ محیط الدائرہ، شرح جہل کاف وغیرہ۔ اُردو میں انکی جو تصنیفات ہیں اُن میں عقیدۃ المحدثین فی حیواۃ النبیین، اکفار الملحدین، رسالہ در تحقیق ناسخ، رسالہ در تحقیق طلاق، ترجمہ کشف الاسرار اور ترجمہ کشف المحجوب شامل ہیں۔ اُردو عربی کی ایک لغت بھی لغات جدیدہ کے نام سے موسوم ہوئی ہے اور سب سے اہم تصنیف جو مولانا کی ہے وہ قرآن کریم کا کشمیری زبان میں ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس کے ساتھ اُردو کے کچھ حواشی بھی ہیں۔ کم و بیش آخری ۲ پاروں کا ترجمہ غالباً علالت کی وجہ سے رہ گیا ہے۔

مولانا نے شعر و سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آپ کے عربی قصائد ہند و پاک کے علمی رسالوں کی زینت بن چکے ہیں۔ فارسی میں بھی شعر لکھتے رہے ہیں اور ایک طویل نظم بعنوان "شب" ان کے شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔

مولانا کو ریاست کی سیاسی زندگی راس نہیں آئی اور وہ سب کچھ چھوڑ کر بیرون ریاست چلے گئے۔ اصل میں وہ سیاست میں اعلیٰ اقدار کے دلدادہ تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہاں کی سیاست ہر طرح سے آلودہ ہو چکی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہے تو وہ بددل ہو کر یہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے ریاست میں جو مختصر سا عرصہ گزارا، اُس میں انہوں نے عوام کی خدمت کیلئے وہ سب کچھ کیا جو اُن سے بن پڑا۔ سری نگر میں انجمن بیکساں، انجمن تبلیغ الاسلام اور کئی دوسری انجمنیں قائم کیں اور سوپور میں انجمن معین الاسلام کی داغ بیل ڈالی جو آج بھی علاقے میں تعلیمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہے۔

مولانا کو عمر کے آخری ایام میں اپنے وطن عزیز کو دیکھنے اور آخری لمحات گذارنے کا بہت شوق تھا لیکن ناتوانی اور سیاسی حالات کی وجہ سے یہ شوق پورا نہ ہو سکا اور آپ ۲۷ جولائی ۱۹۷۳ء کو ایک طویل بیماری کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ نماز جنازہ حضرت مولانا بہاؤ الحق قاسمی نے پڑھائی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا، اور آپکی وصیت کے مطابق قبر کچی بنائی گئی۔ خواجہ محمد امین دارابؔ نے سال ولادت اور سال وفات اور عمر گرامی کی نشاندہی ایک شعر میں کی ہے ؎

۱۳۰۶ھ ۱۳۹۲ھ

خاموش خدائے زادہ و مردہ چراغ بزم علم

زیست وفا نشد برین ختم حیات مستعار

۸۶

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سید قیصر قلندر

محمد عبداللہ تبت بقال

شروع شروع میں موسیقی فرصت کے لمحوں کی ساتھی رہی۔ کبھی کسی اُستاد کی محفل میں جا پہنچے تو کبھی کسی تکئے میں جا بیٹھے۔ اکثر گھر والوں سے اس مشغلے کے بارے میں بات کرنے سے احتراز کرتے۔ یار دوستوں کو بھی یہی ہدایت جاری کرتے کہ گھر والوں کے کان میں یہ بھنک نہ پڑے کہ میٹھے بول اور مدھر سُر دل چھین کے لے گئے ہیں۔

آباو اجداد کا پیشہ تجارت تھا، پشم کے جانے مانے تاجر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ خیال تھا کہ آبائی پیشہ اختیار کریں گے اور تر نوالہ کھاتے ہی نہیں رہیں گے بلکہ کھلاتے بھی رہیں گے۔ خاندانی روایات کے پیشِ نظر دستر خوان سب کیلئے بچھا رہتا۔ عزیز و اقارب، اپنے پرائے اس آسودہ حالی سے مستفید ہو جایا کرتے۔ اسراف بھی نہیں کرتے اور بخل سے بھی کام نہیں لیا جاتا۔ میانہ روی گھر بھر کا شعار بن گیا تھا۔ والد کا نام عبدالغنی تھا، مگر تھے دل کے غنی۔ والدہ فاطمہ بی بی بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں شرفائ کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابا جان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تو اپنے فرزندِ ارجمند کو آبائی پیشے کی طرف مائل کرتے رہے مگر چھوٹے میاں کچھ اور ہی خواب دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ جب پشم کی خرید و فروخت کے سلسلے میں لداخ، تبت، گلگت یا اسکردو جانے کی بات چلی تو چھوٹے میاں کے سارے حیلے بہانے بیکار ہوتے گئے۔ یہاں تجارتِ پشم کے سلسلے میں ذرا وضاحت کر دوں کہ یہ اس صدی کے اوائل کی بات ہے کہ اچھا پشم تبت اور لداخ یا گلگت ہی سے خریدا جاتا تھا۔ وہاں تو ایسے بھیڑ بکریوں کی افزائش ہوا کرتی تھی جن سے نرم و ملائم پشم اچھی مقدار میں حاصل کیا جاتا۔ اس پشم سے شال دوشالے، دھسے، شاہ توش اور جامہ شال بنائے جاتے تو گراں قدر اور گراں قیمت کے ہوتے۔ عبدالغنی اور ان کے دیگر اہلِ خانہ اس سلسلے میں کشمیر سے تبت تک پہنچ جاتے۔ چنانچہ اسی اعتبار سے ان کے ناموں کے ساتھ تبت بقال (یعنی تبت کے تاجر یا تبت سے تجارت کرنے والے لوگ۔ بقال کے معنی ہیں خوردہ فروش، بنیا، تاجر) اضافی نام کی طرح جڑ گیا ہے۔

لداخ یا تبت کا سفر اختیار کرنے والے کے بارے میں سنا ہے کہ روانگی سے پہلے "قُل" پڑھ کر رخصت کرتے۔ کیا عزیز، کیا ہمسائے، کیا دوست احباب، سب آبدیدہ آنکھوں سے الوداع کہہ لیتے اور بے شمار دعاؤں کے سائے میں راہِ سفر اختیار کیا کرتے اور اُمید کا سرمایہ لے کر منزل کی اور چل پڑتے۔ اور یہی سوچ کر کہ "سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے"۔ سفر کی سہولتیں کیا ہوتیں! نہ ہونے کے برابر! خچر یا گھوڑا یا گدھا اور مرکبان کی ہمراہی یا پیادہ میلوں اور کوسوں کی مسافت طے ہوا کرتی۔ اگر موسمِ بہار کے آغاز میں سرینگر سے روانہ ہو جایا کرتے تو برفیلی دشوار گذار رہ گذروں سے ہوتے ہوئے بلند قامت یخ بستہ پہاڑوں کے دروں کو پامال کرتے ہوئے پڑاؤ پڑاؤ، یا منزل منزل قیام کر کے سفر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جاری رکھتے۔ دن سفر کی صعوبتیں جھیلتے گزر جاتا اور رات پاؤں کے آبلوں کو سہلانے اور تھکن سے چور اعضا کو سنبھالنے میں گزر جایا کرتی۔ کبھی کبھی تو سرِ راہ بھی شب بیداری ہو جایا کرتی اور فلکِ نیلگوں کے نیچے تاروں کی روشنی میں جاگتے جاگتے سحر ہو جایا کرتی۔ خچر یا گھوڑا یا گدھا کبھی کبھی داغِ مفارقت دے جاتا تو اُس کا بوجھ بھی مسافروں کی پشت پر لاد دیا جاتا۔ چونکہ اس آسودہ حال تبت بقال خانوادہ کے چشم و چراغ لداخ اور تبت کا سفر اختیار کیا کرتے تو راہِ سفر میں اُن کی شناسائی مختلف دیہات کے لوگوں سے بھی ہو گئی تھی جو نقد و جنس کے بدلے میں مسافروں کے طعام و قیام اور شب گذاری کا انتظام بھی کیا کرتے۔ یہ سلسلہ سال کے سال جاری رہتا اور جب سری نگر میں گرمیاں لوٹ کر آتیں تو یہی "میزبان" خاندانِ تبت بقال کے مہمان بن جایا کرتے۔ اکثر و بیشتر خالی ہاتھ نہیں ہوتے، انڈے، دالیں، مکئی کا آٹا یا ستو یا کوئی سوکھی سبزی بھی تحفتاً ساتھ کشمیری میزبان کے لئے آیا کرتے۔ غرض "لین دین" کا سلسلہ یکطرفہ نہیں ہوا کرتا۔ اس خاندان نے لگ بھگ ساڑھے تین سو سال تک پشم کی خرید و فروخت اور تجارت کی ہے اور کیسے کیسے صوبیداروں، حاکموں، جاگیرداروں، رئیس زادوں اور حکم شاہی چلانے والے کارندوں کو دیکھا ہے! اس کا بیان بجائے خود دلچسپی سے خالی نہیں ہے مگر موضوع کے مطابق بھی نہیں ہے اس لئے یار زندہ صحبت باقی!

بچے کی ولادت پر عبدالغنی کے گھر میں شادیانے ہوئے، ضیافتیں اڑائی گئیں، شیرینی روٹیاں ہمسایوں اور عزیزوں میں بانٹی گئیں، شکرانے کے طور پر قرآن حکیم کی تلاوت کرائی گئی، خانقاہوں اور درگاہوں میں نذر و نیاز چڑھائے گئے۔ الغرض رب العالمین کی بارگاہ میں حمد گذاری اور ساتھ ہی خوشی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں عزیز و اقارب کو بھی شامل کیا گیا۔

خاندانی پیر سے نام رکھنے کی گذارش ہوئی تو ہفتہ بھر کے بعد نوزائیدہ کا نام "عبداللہ" یعنی اللہ کا بندہ طے پایا۔ اور جب اسی پیر صاحب یا آخون صاحب کے مکتب میں داخل کرنے کا وقت آیا تو نام یوں لکھا گیا۔ محمد عبداللہ۔ (آخون دراصل ترکی لفظ 'اخوند' کی کشمیری مخفف صورت ہے، معانی و مفہوم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اخوند استاد کو کہتے ہیں۔) اخون صاحب کا نام مقبول صاحب تھا جو ان کے گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر بٹہ محلہ میں سکونت پذیر تھے۔ حسب دستور قرآن مجید کے درس سے آغاز ہوا۔ پھر فارسی کتب، کریما، بوستان و گلستان سعدیؒ، دیوان حافظ شیرازی کے علاوہ کلاس یا عمر بڑھنے کے ساتھ دیگر فارسی کتب نصاب میں شامل ہو جاتیں۔ حدیث و دینیات بھی پڑھائی جاتی۔ اردو کا چلن ہوا تھا تو اردو بھی سکھلائی جاتی۔ مدرسوں اور مکتبوں یا پاٹھ شالاؤں میں انگریزی تعلیم مروج نہیں ہوئی تھی تو محمد عبداللہ نے بھی اپنی تعلیم و تربیت قرآن و حدیث اور کریما نام حق سے شروع کی اور اپنے ہم جماعتیوں سے کچھ زیادہ ہی پڑھائی لکھائی میں دلچسپی لینے لگا۔ چونکہ مکتب کی روزمرہ کی کارروائی حمد باری اور نعت نبیؐ سے ہوا کرتی تو اخون صاحب نے سب کی آوازوں کا ٹیسٹ لے کر یہ محسوس کیا کہ محمد عبداللہ کی ننھی سی آواز میں کافی زور اور کشش ہے اس لئے اسی سے کہا جائے کہ وہ دعائیہ مجلس کی قیادت کرے۔ اب محمد عبداللہ کے ذمے ایک نیا اور عمر کے اعتبار سے بڑا اہم کام ہوگیا تھا اور ہم عصر ہم جماعتیوں میں اس کا رتبہ بھی بڑھ گیا تھا۔ گھر والے اگر محمد عبداللہ کو مکتب نہ جانے کی کبھی صلاح بھی دیتے یا کوئی کسی امر مجبوری کے تحت اسے جانے سے روکا کرتے تو وہ پھر بھی دعائیہ مجلس کی وجہ سے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مکتب پہنچ جاتا اور لہک لہک کر دعا پڑھوتا اور عجب طرح کی فرحت محسوس کرتا تھا۔ کتابوں کے علاوہ اُسے کسی خاص کھیل کود میں دل چسپی نہیں تھی، کبھی کبھی گلی ڈنڈا کھیلتا اور کبھی کبھی "چھپن چھپائی" اور بس! ماں باپ کا یہ لاڈلا بیٹا بھی بڑے نذر و نیاز کے بعد اللہ نے ودیعت کیا تھا ــــ اولادِ نرینہ، عبدالغنی کے گھر میں پانچ نکاح کے بعد ــــ ابا چاچا، تایا، ماموں خالو اس بچے سے بہت پیار کرتے اور کوشش میں رہتے کہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے میں سبقت لے لیں۔ جب مولوی صاحب نے اس کے والدین سے ننھے محمد عبداللہ کی دل چسپیوں کے بارے میں بات کی اور بتلایا کہ اللہ نے اسے بڑی میٹھی آواز دی ہے، وہ صبح کی دعا، تلاوتِ قرآن حکیم اور نعت شریف بڑی خوش الحانی سے ادا کرتا ہے تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ مولوی صاحب اس ننھے بچے کے مستقبل کو روشن دیکھ رہے تھے!

پڑھائی کا سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا کیوں کہ مولوی صاحب کے مکتب سے فارغ التحصیل ہو کر وہ ایک سکول ــ اسلامیہ پرائمری سکول ــ جو نزدیک بھی تھا، میں پڑھائی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتا تھا مگر باپ کو تجارتِ پشم کے لئے ایک اور دستِ مزدآمیز کی ضرورت تھی۔ اب جبکہ محمد عبداللہ بچپن اور اور لڑکپن کے دور سے گذر کر نوجوانی کے عالم میں قدم رکھنے والا تھا، عبدالغنی نے سوچا کہ بیٹا آگے کیا پڑھ لکھ سکتا ہے تو اسی پر اکتفا کیا جائے۔ پھر وہی ہوا کہ خاندانی اور سماجی دستور کے مطابق محمد عبداللہ کی شادی خانہ آبادی کی فکر ہونے لگی۔ وہ تو اپنے حال میں مست تھا۔ اپنی خوش الحانی سے پاس پڑوس میں رہنے والوں اور اپنے چاچا غلام محمد کو محظوظ کیا کرتا۔ اس زمانے میں لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یوسف زلیخا کے تراجم کشمیری زبان میں ہو چکے تھے اور غلام محمد

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نور محمد کتب فروش، مہاراج گنج سرینگر نے شائع بھی کئے تھے اور چاچا نے محمد عبداللہ کے لئے خرید لئے تھے اب وہ ہی حال نا گرائے، اکہ نندن، گلریز اور دوسری داستانوں اور مثنویوں کے ساتھ نئے تراجم بھی حاصل کر چکا تھا تا کہ کبھی کبھی محمد عبداللہ سے رات رات بھر سنتا رہے۔ وہ تنہا نہیں سنتا تھا بلکہ آس پاس اور گھر کے دوسرے صاحب شوق اور صاحبات ذوق داستان سرائی سے لطف اٹھا لیتے۔ گھر میں ایک میلہ سا لگا رہتا۔ چائے، باقرخانی اور کلچوں کے دور چلتے۔ محمد عبداللہ کے والد عبدالغنی اپنے خوش الحان بیٹے کو تنبیہہ کرتا: "چاچا تمہیں غلط راہ پر ڈال رہا ہے۔ تم کیا دل لگا سکو گے تجارت میں؟ یہ بچپنا چھوڑ دو اور سنجیدگی سے گھر کے کاموں میں لگ جاؤ۔ اب تم شادی کے قابل بھی ہو گئے۔ باپ بننے کے بعد کیا یہی داستان سرائی کرتے رہو گے؟ کھاؤ گے کیا.....؟" مگر بیٹا اپنی میٹھی آواز کا جادو جگہ جگہ جگانے لگا تھا۔ محلے کی دکانوں پر بیٹھ کر اب غزلیں اور نعتیں بھی گانا شروع کر دی تھیں۔ شروع ہی سے محمود گامی، رسول میر، مقبول شاہ، حقانی، عبدالاحد نادم اور دوسرے شاعروں کے کلام سے بڑی رغبت تھی۔ ان میں وہ شعری حسن بھی پاتا اور نغمگی بھی، جو فارسی شعروں میں دیکھی تھی۔ آس پاس کے دکاندار ہی نہیں بلکہ راہ گیر بھی رک جاتے اور اس نئے نغمہ کار کی مدھر نے بے ساختگی اور بے باکی سے لطف اندوز ہو جایا کرتے۔ باپ برابر ملامت کرتا، اس شغل غنا پر کہتا "بانڈ پاتھر کرنا چھوڑ دو۔ یہ آوارگی ہے تمہیں زیب نہیں دیتی"۔ مگر یوں لگتا تھا کہ محمد عبداللہ کے دل و دماغ کو شوق نغمہ سرائی نے اپنے قابو میں کر لیا تھا اور اسے اس شغل میں عزت بھی ملتی، اور شہرت بھی۔ پاس پڑوس کے ہم عمر بچے اور نوجوان رشک کی نگاہ سے دیکھتے عبدالغنی کو بیٹے کے لچھن پسند نہیں تھے۔ وہ اب پوری کوشش کر رہے تھے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کہ بیٹے کے پاؤں میں شادی کی زنجیر ڈال دی جائے۔ زور و شور سے تلاش جاری ہوئی اور طے پایا کہ اپنے رشتہ داروں ہی میں کوئی مناسب لڑکی عقد نکاح میں لائی جائے چنانچہ چاچا احمداللہ کی بیٹی اور اس کی چچیری بہن سے اسکی شادی طے ہوئی۔ مشکل سے عمر سولہ سترہ سال تھی۔ والد صاحب نے سمجھا کہ ایک اہم فرض سے سبکدوش ہو گئے اور اب نوشہ کو تجارتِ پشم میں پوری طرح سے جُٹ جانا چاہیئے اور آبائی پیشہ کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ عبدالغنی نے ایک دن کہہ ہی دیا کہ محمد عبداللہ کو اب تبت اور لداخ جانا پڑے گا۔ اس دن نوجوان دُلہا میاں کا اس پاس کی ساری چیزوں سے دل اوب سا گیا۔ غصہ آیا تو ضرور مگر نکالتا کس پر؟ باپ بیٹے سے بہت سی توقعات وابستہ کر جاتا ہے یہ پوچھے بغیر کہ بیٹا کیا سوچ رہا ہے یا اس کے کیا ارادے ہیں؟ بہر حال باول نخواستہ محمد عبداللہ کو اپنے چاچا علی محمد اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ لداخ اور تبت کی راہ اختیار کرنا ہی پڑی۔ چند برس اسی طرح گذرے مگر شوقِ داستان سرائی بڑھتا گیا۔ سری نگر سے لداخ تک جہاں کہیں بھی چھوٹے سے قافلے کو رات کے قیام کا موقعہ ملتا' محمد عبداللہ کوئی نہ کوئی مثنوی یا داستان کھولتا تو خوش الحانی سے کچھ حصے سنایا کرتا۔ اس طرح سفر کی صعوبت بھی زیادہ گراں نہیں گزرتی۔ ایک سال یہ ہوا کہ اپنے والد کے ساتھ جب پشم' خوبانیاں اور کچھ چینی فنجان لے کر سرینگر لوٹ آیا' تو عبدالغنی بیمار پڑ گئے۔ بہتیرے علاج کئے' نامی گرامی حکیموں سے صلاح مشورے کئے' مگر ایک صبح بیمار کی نبض اور سانس مدہم ہوتے ہوتے اچانک رک گئی اور داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر محمد عبداللہ کے نہنے کاندھوں پر سارے کنبے کی ذمہ داری اور تجارت کا بوجھ ڈال کر عبدالغنی صاحب واصل بحق ہوئے۔ اناللہ وانا الیہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

راجعون۔

شوق تھا کہ ہر رنگ رقیب سروساماں نکلا، سُر سنگیت کی کشش نے دھیرے دھیرے ایک جنون کی صورت اختیار کرلی۔ اب تبت اور لداخ جانا چھوٹ ہی گیا۔ محمد عبداللہ کے عم بزرگوار علی محمد بدستور یہ سفر اختیار کرلیا کرتے اور ان کے دوسرے بھائی احمد اللہ بھی ان کا ساتھ دے دیتے۔ شہر سرینگر میں ان کی چار دکانیں بھی چل رہی تھیں جہاں تبتی اور لداخی پشم کی خرید و فروخت ہوا کرتی۔ محمد عبداللہ بھی ایک دکان سے منسلک ہوا مگر کچھ دکان کرنے کے بعد خیال آیا کہ پشم کی تجارت چھوڑ کر کوئی اور دھندا کیا جائے۔ چنانچہ اپنے ایک قریبی دوست کی شرکت میں کریانہ کی دکان کھولی۔ دونوں کو اس قسم کے بیوپار کا علم نہ تھا اور اس پر طرہ یہ کہ اُدھار مانگنے والوں کو منع نہیں کرپاتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دیر تک یہ دکانداری چلی اور پھر اصل زر کے ساتھ یہ کام ٹھپ ہوگیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک عجب طرح کی اداسی طاری ہوئی۔ اب محمد عبداللہ پھر موسیقی کیطرف مائل ہوگیا۔ خیال آیا کہ کسی نہ کسی صاحب نظر فقیر کی حضوری مل جاتی تو کام بن جاتا۔ خوش اعتقاد کینے سے تعلق تھا ہی تو دوست احباب نے کسی رہبر کامل کی تلاش شروع کی۔ یہ اس صدی کے دوسرے عشرے کی بات ہے۔ عبدالخالق صاحب جو خالہ صاحب کے نام سے معروف و مشہور تھے، ایک ایسے صوفی بزرگ تھے جنہیں موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور خود بھی صوفیانہ موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ گانے بھی خوب تھے۔ بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ وہ (خالہ صاحب) موسیقی خاص طور سے عارفانہ کلام کو اہل تصوف کی غذا سمجھتے تھے اور اُن کی محفل میں کوئی نہ کوئی موسیقار باریابی کا شرف پاتا۔ ان کی محفل کا دستور عجب سا تھا۔ موسیقار موجود ضرور ہوتے مگر از خود کوئی بھی گانا شروع نہیں کرسکتا تھا۔ جیسے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خالہ صاحب اشارہ کرتے یا اذن دیتے وہی موسیقار گا سکتا تھا۔ اس طرح کئی دنوں تک موسیقاروں کو حکم کی طلب رہتی اور اکثر و بیشتر بے نیل و مرام ہی اٹھ کر چلے جایا کرتے۔ یہ کہنا ضروری ہے کہ کشمیر میں ملک کے دوسرے علاقوں کی طرح اہلِ تصوف کے تکیے تھے جو ان کی قیام گاہ کے ساتھ ساتھ انجمن آرائی کی جگہ ہوتی۔ بڑے تواتر سے حقے گڑگڑاتے، افیون اور چرس سے بھی شغف رہتا۔ نمکین گلابی چائے کے دور پھر دور چلتے رہتے۔ موسیقی کی لہریں چلتی رہتیں اور ذکر ہو میں استغراق جاری رہتا۔ ایسے ہی ماحول میں محمد عبداللہ خالہ صاحب کی محفل سماع میں پہنچ گیا تھا۔ جوانی کا عالم تھا، کچھ دوست ساتھ تھے۔ زعم یہ تھا کہ جاندار آواز اور دلکش ترنم سے سب اس کی طرف کھنچ آئیں گے پہلے روز کسی نے گھاس تک نہیں ڈالی اس کے آگے۔ ساتھی دوست نے ڈھارس بندھائی۔ مگر رات گئے تک اس محفل کے آداب و اطوار دیکھتا رہا۔ دوسرے دن بھی یہی عمل رہا۔ کچھ دن اور گذر گئے تو خالہ صاحب موجود نہ تھے لیکن ان کا حلیہ اور انکی صورت اس نوجوان کو بار بار یاد آنے لگی۔ مخمور آنکھیں، جو شب بیداری سے ہمیشہ لال رہا کرتیں۔ بھرا بھرا کتابی چہرا، اُلجھے سُلجھے لمبے بال، کانوں میں بالیاں، مضبوط اعضاء، تنومند بدن اور درمیانہ قد (کشمیری پھرن پیرہن) اور سر پر دستارِ فضیلت، اور آواز مدہم مگر گرجدار تھا اس سے بھرپور۔ کم گو، کم سخن، مگر زود فہم و ذی ہوش۔ گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے، تخت پر مسند نشین اور مار پیچ کی نلی منہ میں تو کبھی کبھی کش کھینچتے تو تمباکو کا دھواں سانس سے مل جاتا اور پھر ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا غائب ہو جاتا۔ اس دن خالہ صاحب کا ایک شاگرد رشید سر محفل رہا۔ پھر ایک اور دن جب محمد عبداللہ اپنے دوست کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تو خالہ صاحب اپنے آپ سے کشمیری

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں کہہ رہے تھے "ہنگستہ منگس بیٹھ خوش اعتقاد" (ناحق خوش اعتقادی جتلا رہے ہیں!) نوجوان دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس سے شاید کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے۔ پھر ندامت کے پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اس کی نظر محفل میں صمد خان، پیر نظام الدین اور دوسرے موسیقاروں پر پڑی تو انہوں نے اشاروں میں حوصلہ رکھنے کی صلاح دی۔ اس دن محمد عبداللہ کا دوست درگجن مشن ہسپتال میں بعارضہ لغلک داخل ہوا تھا۔ محفل میں پہنچ کر اسے دوست کا خیال آیا تو خالہ صاحب نے محمد عبداللہ کو کچھ نبات اور تھوڑی سی مٹی دی اور کہا کہ جاؤ مشکل حل ہو جائے گی۔ خدا کا کرنا ایسا کہ مٹی پھوڑوں پر ملنے سے پیپ اور خون خارج ہونا شروع ہوئی اور آپریشن کی ضرورت نہ پڑی۔ وہ فوری طور سے صحت یاب ہوا۔ نبات خود بھی کھایا اور دوست کو بھی کھلایا۔ بلکہ بیوی اور گھر کے دوسرے افراد کو بھی کھلایا۔ ساتھ ہی جو مالی مشکلات کریانہ کے سودے کے گھاٹے سے پیدا ہو گئی تھیں، وہ بھی اس طرح سے دور ہو گئیں کہ قرضداروں کے پاس رُکے ہوئے پیسے وصول ہونے لگے۔ لیتھم کی تجارت پھر چل نکلی۔ اب وہ روزانہ بلا ناغہ پہنچ جاتا۔ یہ اس دن کی بات ہے جب وہ اکیلا نہ تھا بلکہ دوست احباب بھی ساتھ تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اچانک صاحب حال خالہ صاحب نے اس کے ایک دوست کی خوب پٹائی کی اور کہتا گیا کہ بھنوئی کی سفارش کرتا ہے۔ یہ جملہ دُہراتے رہے۔ نوجوان حاجتمند کے لئے یہ معمہ سے کم نہیں تھا۔ بہر حال، اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ آنے جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر ایک روز، نہ جانے کتنے دنوں کے بعد محمد عبداللہ کی طرف منہ کر کے صاحب وجد و حال نے کہا۔ "سناؤ گانا۔ صوفیانہ گاؤ..... گانا آتا ہے نا..... پھر سناتے کیوں نہیں؟..... " کچھ لمحوں کے لئے خاموشی رہی۔ شام رات میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ڈھل رہی تھی۔ محمد عبداللہ نے پاس میں پڑا ایک کشمیری ستار اٹھایا، تار چھیڑے جب اطمینان ہوا کہ سُر ٹھیک ہے تو محمود گامی کی یہ غزل چھیڑی :

مَتہ پیٹھ سر کرہ یبرٕ آلٕژ یے   کُوہ کرٕتھ ہرٕ سے بو
پانہٕ پٔدٕ لیہ پالس پیٹھ ژٕ ہے   کُوہ کرٕتھ ہرٕ سے بو

(مقام دوگاہ ۔ نیم وزر کشمیری)

محمد عبداللہ نے یہ غزل ایک محفل میں سنی تھی جہاں کسی صوفیانہ موسیقار نے رات بیتے ہوتے گائی تھی اور اسے یہ غزل پسند آئی تو اسی غزل کے کچھ شعر سنائے۔ اس رات خالہ صاحب نے ایک بھرپور نگاہ اس نوجوان پر ڈالی اور پھر محمد عبداللہ کا معمول بن گیا کہ دن بھر اپنے کام سے فارغ ہو کر خالہ صاحب کے پاس پہنچ جاتا۔ روز اس محفل میں وہ نت نئے چہرے اور موسیقار دیکھتا۔ امیر شاہ، محمد سلطان میر، غلام قادر مجاور، غلام نبی بٹ، محمد سلطان بٹ، پیر نظام الدین، اور دوسرے صاحبانِ فن کی ملاقاتیں یہیں ہوئیں اور تادمِ حیات قائم رہیں۔ کچھ موسیقار یعنی غلام قادر مجاور، پیر نظام الدین، غلام نبی بٹ اور محمد سلطان بٹ پہلے ہی اللہ کو پیارے ہوئے ہیں۔

اب جبکہ چھ ماہ کی مسلسل حاضری کے بعد اذنِ نغمہ سرائی ملا تھا تو اب کوئی ساز خریدنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو نوہٹہ میں کسی احمد شیر گجری نے اسے ایک گھر دکھایا اور کہا کہ وہاں ایک گائیک رہتا ہے شاید اس کے پاس کوئی زائد ساز ہو۔ وہاں جا کر ایک کشمیری ستار مل گیا اور محمد عبداللہ نے موسیقی کے بازار میں یہ پہلا سودا کیا۔ اور سوا دو روپے دے کر ستار خرید لیا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے سلطنتِ نغمہ و ترنم کا پہلا پڑاؤ طے کیا ہے۔ اب ایک اور مشکل آن پڑی، یہ ستار گھر میں پہنچایا کیسے جا سکتا تھا۔ بیوی اور دیگر اہلِ خانہ پہلے ہی اس کے شوق سے نالاں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تھے، ستار دیکھ کر وہ قیامت کا سامان پیدا کرتے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ گھر بھی خواجہ صاحب کا تکیہ بن جائے (بدھ گیر جہاں تبت بقال خاندان سکونت پذیر تھا وہیں کچھ دوری پر ایک خدا دوست کی رہائش گاہ بھی تھی جو اہل تصوف یا اہل غنا کی قیام گاہ کا کام بھی دیتی تھی اور خواجہ صاحب کے تکیہ سے جانی جاتی تھی) ایک واقف دکاندار محمد اسماعیل کی دکان پر ستار دن بھر پڑا رہتا اور رات بھر محمد عبداللہ کی انگلیوں کی پوروں کے لمس اور مضراب کے ارتعاش سے نغمے بکھیرتا۔ محمد اسماعیل کی ماں اس نوجوان کو اپنے بچوں کا سا پیار دیتی۔ کبھی کبھی دودھ گرم کر کے پلایا کرتی اور کہتی کہ وہ بڑی محنت کرتا ہے اور بڑے پیارے انداز سے داستان سناتا ہے۔ ستار تو مل گیا تھا مگر لے تال اور وزن و مقام کی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک اور پڑوسی عبدالخالق صوفی تک رسائی کی جو طبلہ پر دو دو ہاتھ کرتا تھا اور اب دونوں صوفی کے گھر پر یا تکیہ خواجہ صاحب میں جاکر آواز سے آواز ملاتے اور ستار اور طبلہ بجاتے رہتے۔ دیکھتے دیکھتے پاس پڑوس، دوست احباب اور عزیز و اقارب میں بات پھیل گئی کہ محمد عبداللہ گانے بجانے لگا ہے۔ محمد عبداللہ کے شوق میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا اور اب وہ پہلی جیسی بات نہیں رہی تھی کہ تار کھینچتے کھینچتے ستار کے تار ٹوٹ جایا کرتے یا ستار جواب دیتا۔ ہونہار نے سُر کا گیان کسی کے سکھائے بغیر ہی حاصل کر لیا تھا، کوئی کہتا کہ اس کے روحانی مرشد کی نظر کام کر گئی تو کوئی کہتا کہ کسی استاد سے ضرور تربیت حاصل کی ہے۔ مگر یہ صحیح ہے کہ اوروں کی دیکھا دیکھی میں اس کے شوق نے اسے یہ سب کچھ سیکھنے میں راہبری کی ہے۔ باپ کے جیتے جی ایک دن ناٸدہ عرس بتہ مالو صاحب میں کسی عزیز کے گھر گئے تھے وہاں پتہ چلا تھا کہ احمد بٹہ واری گا رہا ہے۔ باپ کو خیال آیا کہ اس محفل ذکر و تصوف میں نوجوان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بیٹے کو بھی لے جائیں۔ وہاں پہنچے تو احمد بٹواری کے قریب ہی جا کر بیٹھ گئے۔ تو احمد بٹواری نے اس کو دیکھا اور منہ پر ایک تھپیڑ رسید کیا۔ وہ زناٹے میں آگیا۔ باپ نے حوصلہ بڑھایا۔ اشک رواں ہوئے۔ احمد بٹواری نے بھی آنکھیں پونچھیں۔ جیب سے تھوڑی سی نبات نکال کر دے دی اور کہا "کھاؤ، آواز میں مٹھاس آئے گی"۔ کافی دیر تک محفل جمی رہی اور عبدالغنی اپنے بیٹے کو گھر (بُدھ گیر) کی طرف چل پڑے۔ اسے وہ واقعہ تاعمر یاد رہا۔

اب ہمایوں میں سے بعض ہم عمر نوجوانوں نے کبھی طنز کیا "یار، کیا ستار بجاتے ہو؟ اتنا چھوٹا ساز؟۔ یہ تو کوئی بھی شخص بجا سکتا ہے، اس میں تار ہی کتنے ہیں جو مشکل پیش آئے؟ ...... بجانا ہے تو سنتور بجایا کرو تب مانیں!......" یہ ہزل یا طنز کھٹک بن کر دل و دماغ پر چھا گیا اور کچوکے دینے لگا۔ اپنے کئی دوستوں سے دریافت کیا کہ سنتور کہیں مل سکتا ہے کیا؟ کئی پتے تو مل گئے مگر سنتور نہ مل سکا۔ بالآخر کچھ مہینوں کی تگ و دو کے بعد ناوہ پورہ کے ایک فن فہم اور علم دوست بزرگ لسہ صاحب (غلام رسول) تک نورالدین صاحب اور عبداللہ صاحب کی بدولت رسائی ہوئی۔ لسہ صاحب پیپرماشی کا کام کیا کرتے تھے اور موسیقی سے بھی خاصا شغف رکھتے تھے۔ ان ہی سے چند روپے کے عوض سنتور خریدا اور اب اس پر طبع آزمائی یا دست بازی ہونے لگی۔ اب بچارے سنتور کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ ۹۶ تاروں والے اس ضربی ساز کو کھینچتے کھینچتے تار جواب دینے لگے۔ قلم اٹھانے کی نوبت کئی روز تک نہیں آئی۔ اور جب قلم چلنے لگے تو سُر بھی کافی حد تک صحیح صحیح نکلنے لگے (قلم، سنتور بجانے والے نیم ترکش نما زخمہ کو کہتے ہیں) اور جب گانا شروع کیا تو اس شعر سے آغاز لطیف ہوا!

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

زیں بشارت جملہ دل ہا تازہ شُد
نغمۂ شادی بلند آوازہ شُد

اب موسیقار نے آہستہ آہستہ اپنا رُوپ محمد عبداللہ کی ذات میں پیش کرنا شروع کیا تھا۔ اب وہ اولین خلش بھی جوان ہو گئی تھی جو بتہ مالو کے عرس پر اُس وقت دل میں سر اٹھا چکی جب بچپن کا زمانہ تھا اور اپنے والد اور دوسرے عزیزوں کی سنگت میں ایک محفلِ سماع میں احمد صاحب بٹہ واری کا گانا سننے کا موقعہ نصیب ہوا تھا، تھپیڑ سے سیماب پائی تھم گئی تھی۔ محمد عبداللہ نے سنجیدگی سے اس حقیقت پر غور کیا کہ بے منت استاد کوئی فن حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ حروف آشنائی کبھی ممکن نہیں۔ اس لئے اس کے ایک دوست احمد اللہ کین (خانقاہ معلیٰ) کے مشورے سے صوفیانہ موسیقی کے استاد اور یگانۂ روزگار موسیقار اُستاد رمضان جُو اور اس کے بھائی استاد غنی جُو کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے اور مولانا شمس الدین حیرتؔ کاملی سے بھی صلاح و مشورہ کرتے رہے جو عربی، فارسی، کشمیری زبانوں میں دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ نامی گرامی موسیقی دان بھی تھے اور ستار بھی بجایا کرتے۔ حیرتؔ کاملی تال اور رائے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سب۔ اُستاد رمضان جو، استاد غنی جو اور مولانا حیرت کاملی۔ نے محمد عبداللہ میں ایک فرزانہ موسیقار کی روح بے قرار دیکھی تو بڑی فراخدلی سے سُر درست کیا، اس تربیت سے اس کے فن کی تعمیر ہوئی۔ اب محفلِ سماع میں صمد صاحب منرو (صراف کدل) جو صوفیانہ موسیقی کا عاشق تھا، بڑے فخر و اطمینان کے ساتھ نوجوان موسیقار محمد عبداللہ کی طرف سنتور بڑھاتا تھا تو استاد رمضان جو اور استاد غنی جو خوش ہو جایا کرتے۔ تین سال تک اس نے سنتور بجانے اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صوفیانہ موسیقی کی تعلیم و تربیت ان دو استاد ان فن بھائیوں (یعنی رمضان جو اور غنی جو) سے حاصل کی۔ اس سے پہلے کبھی بار محمد عبداللہ سے محافل موسیقی میں کوئی اگر پوچھتا کہ تم کس تال میں گاتے ہو؟ یک بنے تال گاتے ہو یا تال میں گاتے ہو تو اس کا یہی جواب ہوتا: "میں یکہ تال یا دو یکہ تال یا چپ انداز وغیرہ کچھ نہیں جانتا۔ میں صرف گانا جانتا ہوں۔ مجھے اندر سے آواز آتی ہے کہ گاؤ اور میں گانے لگتا ہوں اور بس..... !" لیکن اب وہ بات نہیں تھی۔ اب سُر کا گیان تھا اور لے کاری کی واقفیت ہونے لگی تھی۔ اب صوفیانہ موسیقی اور لوک گائیکی میں فرق محسوس ہو رہا تھا۔ اب ماں کی وہ لوری جس نے سب سے پہلے ننھے بچے کے دل و دماغ کو محیط کیا تھا، لوک ورثے کی واضح صنف لگتی تھی۔ نہ جانے لوری میں کیا جادو ہے کہ بچے کو سُلاتی ضرور ہے مگر اس کے احساس نغمہ کو بلاشک جگاتی بھی ہے۔ لوری کی زبان بڑی سُریلی اور میٹھی ہوتی ہے جو خوابوں کی رنگا رنگ دنیا کی سیر کراتی ہے۔ اب لوری سے چھکری تک کی منزلیں واضح اور صاف نظر آرہی تھیں۔

جب پہلی بار ایک تربیت یافتہ صوفیانہ موسیقار کی حیثیت میں استادان فن اور شائقین سماع کے سامنے گانے کا موقعہ نصیب ہوا تو محمد عبداللہ تبت بقال نے مقام آساوری سے ابتداء کی۔ یہ مقام اصل میں صبح سے نصف دن تک گایا جا سکتا ہے۔ محفل آراستہ تھی۔ ٹھیک دوپہر کا سماں تھا۔ اب کے وہ سنتور خود بجانے اور دوسرے ہمنواؤں کے ساتھ گانے لگا۔ جب مقام کی تشکیل سنتور، ستار اور ساز کشمیری (دکھا نچہ) پر پیش کی گئی تو سب کی آنکھوں میں حیرت و تجسس کی روشنی سی نظر آئی اور پھر نئے موسیقار نے کئی کشمیری بیت (شعر) پہلے دو ایک تالوں میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

گائے اور پھر کچھ فارسی اشعار بھی پیش کئے ؎

وَنہٕ کی تیٚہ رٔیشی تیٚہ کوٚہ وراجنٕے
تراؤ بتھ مٔے کور ژلوم شین زن گاجنٕے
یژھ کرِ نم ماز رٔیژے بوٚ ناربہٕ زاجنٕے
ڈنگ دت گور ژلوم پامن لاجنٕے

(دیکہ تال)

گر رہ وسر ہنگر دہ سر نوشت — این سخن باید بآب زر نوشت
سرنوشتِ ما بدستِ خود نوشت — خویش نویس است و نخواہد بد نوشت

چند روزے با تماشا کردہ ایم
سر بسر اعلائی اعلیٰ دیدہ ایم

(دیپ انداز)

یہ محفل کافی دیر تک جاری رہی اور آج نئے موسیقار کو یہ اعزاز دیا گیا تھا کہ صرف وہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا رہے اور جب اس مظاہرۂ فن کے ساتھ پہلی نشست برخاست ہوئی تو سب نے نئے صوفیانہ موسیقار کو مبارک دی اور تحسین و آفرین کے کلمے ہر طرف سنائی دیئے۔ بسم اللہ تو بڑے ہی شاندار انداز سے ہوئی۔ لیکن اب یہ ہوا کہ پشم کی تجارت کو ثانوی درجہ ملنے لگا اور صوفیانہ موسیقی نے سبقت لی۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں موسیقی کی لگن نے محمد عبداللہ کو بادام واری اور نہ جانے کہاں کہاں پہنچایا۔ جشن شگوفہ ہوتا یا تیل بل کا میلہ یا نشاط باغ یا شالیمار باغ کا جشن یا چار چناری میں قیام۔ موسیقی کی محفلیں آراستہ ہوا کرتیں۔ دوست احباب، شائقین اور صاحبانِ ذوق سب ان محفلوں سے لطف اندوز ہوا کرتے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایک طرف اگر عبد الغفار کا وہ ڈاری اپنے ہم نواؤں کے ساتھ رباب بدست ہوتا تو دوسرے کسی دور کے گوشے میں صوفیانہ موسیقار ساز و سنتور سے کر سنجیدہ موسیقی سے خود بھی مسرور ہو جایا کرتے اور دوسروں کو بھی خوش کیا کرتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب محمد عبد اللہ ستار بجایا کرتا کیوں کہ سنتور کی تلاش جاری تھی۔ یہ وہ سال کشمیر کی سماجی اور سیاسی زندگی کے بڑے ہی نازک اور اہم سال بھی تھے کہ انہیں کشمیریوں کے دلوں میں ایک جذبہ بیداری کروٹیں لے رہا تھا جنہیں چند کھنکتے ہوئے سکوں کے عوض اپنی خوبصورت دھرتی، نغمہ ریز بند جھومتے جھرنوں، حسین و جمیل جھیلوں اور نظاروں کے ساتھ ڈوگرہ فوجی جرنیل گلاب سنگھ نے انگریز شاطروں سے خریدا تھا۔ ایک نئے دور کی سیمیں لکیر تاریک افق سے ابھرنے ہی والی تھی۔ محمد عبد اللہ کے حساس دل کو اقبال کے شعروں نے چھو لیا تھا جو انہوں نے کشمیریوں کے بارے میں کہے تھے ؎

غمیرش تہی از خیالِ بلندے | خودی ناشناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او | نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے | نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری | کہ خاکسترش آفریند شرارے

یہ اشعار محمد عبد اللہ تبت بقال نے مولانا حیرت کاملی سے سن لئے تھے بلکہ پوری نظم "ساقی نامہ" سنی تھی کبھی کبھی اس طرح کے شعر وہ بلند آہنگ ترنم سے سنایا بھی کرتا۔ جو بھی شعر اس کے من کو بھا جاتے وہ یاد بھی رہتے۔ چونکہ خود بھی فارسی شاعروں کے کئی دیوان مکتب اور اس کے بعد پڑھ لئے تھے یادداشت اچھی تھی تو کئی غزلیں، نعتیں اور منقبت حفظ ہو گئے تھے۔ اب جبکہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

باقاعدہ طور پر صوفیانہ موسیقی کی تربیت مل چکی تھی تو خوب سے خوب تر ہونے کی لگن بڑھ رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ مقاماتِ فن سے آگاہی کی پیاس بڑھ رہی تھی تو یہی تڑپ یہی ذوق اور یہی شوق اہلِ تصوف کی مختلف صحبتوں اور سماعِ اذکار کی محفلوں تک رہبری کرتا رہا۔ یہ اُن ہفتہ وار نشستوں کے علاوہ ہوا کرتے جو ہر جمعہ کو احمد اللہ کین کے گھر پر ہوا کرتیں۔ ایسی ہی ایک ہفتہ وار نشست کی بات ہے کہ صوفیانہ موسیقی جمعہ کی نماز کے بعد شروع ہو گئی تھی۔ شام ہونے والی تھی، بتہ مالو صاحب کا عرس بھی تھا تو کشمیری کہاوت کے عین مطابق اُس دن تند و تیز آندھی چلی، گرد و غبار کے مرغولے ہوا کے دوش پر جگہیں بدل رہے تھے اور پھر ہلکی بارش شروع ہوئی۔ جب باد و باراں کا طوفان تھم گیا تو احمد اللہ کین کے پاس ان کا ایک اور عزیز اور موسیقی نواز احمد شاہ بانڈے آیا، اور اوّل الذکر صاحب سے کہا کہ میرک شاہ کاشانی پچھلے تین دن سے محلہ بتہ مالو میں ایک مرید کے ہاں مقیم ہیں اور وہاں ایک محفلِ سماع جاری ہے، خالق صاحب تین دن سے گا رہے ہیں، اب محمد عبداللہ تبت بقال کو بلایا گیا۔ کیوں کہ میرک شاہ صاحب نے اس نوجوان کا گانا کہیں سُن لیا تھا اور پسند کیا تھا۔ چنانچہ اس درویش صفت، صوفی منش بزرگ کی خدمت میں خانقاہِ معلیٰ سے سارا قافلۂ شوق بتہ مالو پہنچ گیا اور میرک صاحب کے ہاں حاضری دی اور پھر محفلِ سماع کئی راتیں جاری رہی اور یہ نوجوان موسیقار، دوسرے موسیقاروں کے ساتھ مقاماتِ وقت پیش کرتا گیا۔ فارسی شعر گائے گئے، کشمیری غزلیں سنائی گئیں، نعتیں اور منقبتیں ادا کی گئیں، وہ اشعار بھی گائے گئے جو احمد اللہ ہمدانی کی کتاب اصلی موسیقیٔ کشمیر میں موجود نہ تھے ــــ حال و قال کی کئی محفلیں آراستہ ہوئیں اور کسی توقف اور تردد کے بغیر جاری رہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے، بیچ میں صرف کھانا کھانے کے لئے ملتے رہے۔ اکثر و

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بیشتر شب بیداری ہوتی رہی۔ محمد عبداللہ کو ایسی کئی محفلوں کی روئیداد سنانے میں بڑا لطف آتا۔ اور جب ایسی بے پناہ اور دلکش محفلوں کی بساط اٹھنے لگی تو اسے بڑا رنج ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد لگتا ہے کہ ایسی محفلیں منعقد ہوا کرتیں۔ اُسے بڑا قلق تھا کہ لوگوں کے مشاغل بدل گئے ہیں، شوق بھی عنقا ہوا ہے، ذوق بھی نہیں رہا۔ دھیرے دھیرے تکیئے اُجڑ رہے تھے۔ کیا زمانہ آرہا تھا؟ یہ کیسی ہوا چلنے لگی تھی؟ مگر ان سوالوں کے جواب محمد عبداللہ تبت بقال کے پاس نہ تھے۔ اس کے پاس ایک خلش تھی، فن تھا، ذوق تھا، تجسس اور طلب تھی! اس کا دل مضطرب تھا، فن کار کا دل دھڑکتا تھا اور فن نئی منزلوں کی طرف گامزن تھا!

۱۹۴۶ء میں کشمیر میں ایک خاموش انقلاب آیا۔ شخصی اور مطلق العنان حکومت کے خلاف اُسی کشمیری نے آوازِ حق بلند کی جس نے چُپ چاپ سینکڑوں برس تک محکوم و مجبور ہو کر زندگی گزاری تھی۔ ڈوگرہ شاہی کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک چلائی گئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی ڈوگرہ فوج نے استبداد کی انتہا کر دی۔ اُن شہیدوں کی یاد تازہ ہونے لگی جو ۱۹۳۱ء میں اپنا نوجوان گرم گرم خون نہال آزادی کو پیش کر چکے تھے اور جن کی یاد ہر سال ۱۳ جولائی کو تازہ ہو جایا کرتی۔ اب کے بھی کتنے گبرو جوان، کتنی ماؤں کے دلارے اور کتنی دلھنوں کے سہاگ اُجڑ گئے؟ کسی کو نہیں معلوم! محمد عبداللہ تبت بقال اپنے محلے بڈھ گیر اور آس پاس میں مسجدوں میں نعت خوانی کرتا، اور حاضرین کو کہتا کہ بدلے ہوئے زمانہ کا ساتھ دیں۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کریں۔ وہ اس فن کا بے باک تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا اسے کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اندیشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں جیل نہ ہو جائے جیل کی صعوبتوں اور ایذا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رسانیوں سے وہ گھبراتا بھی تھا۔ دوست احباب نے یہ اندیشہ دیکھ کر اُسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک اور انقلاب آیا۔ ہندوستان دو مملکتوں میں بٹ گیا۔ انگریزوں نے برصغیر سے کوچ کرتے ہوئے ہندو مسلمان کے خون کی ہولی دیکھی۔ لہو سے تاریخ آزادی لکھی گئی اور کشمیر سے مہاراجہ ہری سنگھ اپنے اہل و عیال لاؤلشکر اور چیلے چانٹوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ حملہ آور قبائلی سرینگر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اور حکومت کی مشینری نابود ہو گئی تھی۔ پولیس، فوج اور دوسرے سرکاری کارندوں کا نام ونشان نہیں مل رہا تھا۔ مظفر آباد، کوہالہ اوڑی، کرناہ اور ہندوارہ سے سکھ رفیوجی سری نگر وارد ہو رہے تھے۔ بڈھ گیر جہاں کشمیری پنڈت جاتی کی اچھی تعداد آباد ہے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے بالکل اسی طرح سے جیسے فتحکدل، بھانہ محلہ، حبہ کدل، چینکرال محلہ زیندار محلہ یا ستھو بربرشاہ کے کشمیری پنڈت۔ تو محمد عبداللہ تبت بقال نے اپنے ہم عمر دوستوں اور ہمسائیوں کے ساتھ حفاظتی کمیٹی بنائی جو باقاعدگی سے رات بھر پاس پڑوس کے محلوں میں بھی گشت کیا کرتی اور لوگوں کو تلقین کیا کرتی کہ وہ پُرامن رہیں اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی ہدایات کا انتظار کریں۔ یہ فن کار کا ایک اور روپ تھا۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں پہلا ریڈیو سٹیشن جموں میں قائم ہوا۔ ابھی تک مہاراجہ ہری سنگھ کا سکہ رواں تھا اور اُس نے مرکزی سرکار کو زور دے کر کہا کہ اگر کوئی ریڈیو سٹیشن قائم کرنا ہے تو پہلے جموں میں ہی قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور "جموں و کشمیر براڈکاسٹنگ سروس" کا پہلا نشریاتی ادارہ رنبیر سنگھ ہائی سکول کے پچھواڑے میں قائم ہوا اور کلاس روم

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بیشتر شب بیداری ہوتی رہی۔ محمد عبداللہ کو ایسی کئی محفلوں کی روئیداد سنانے میں بڑا لطف آتا۔ اور جب ایسی بے پناہ اور دل کش محفلوں کی بساط اٹھنے لگی تو اسے بڑا رنج ہوا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد گلے گا ہے ایسی محفلیں منعقد ہوا کرتیں۔ اُسے بڑا قلق تھا کہ لوگوں کے مشاغل بدل گئے ہیں، شوق بھی عنقا ہوا ہے، ذوق بھی نہیں رہا۔ دھیرے دھیرے تکیے اُجڑ رہے تھے۔ کیا زمانہ آرہا تھا؟ یہ کیسی ہوا چلنے لگی تھی؟ مگر ان سوالوں کے جواب محمد عبداللہ تبت بقال کے پاس نہ تھے۔ اس کے پاس ایک خلش تھی، فن تھا، ذوق تھا، تجسس اور طلب تھی! اس کا دل مضطرب تھا، فن کار کا دل دھڑکتا تھا اور فن نئی منزلوں کی طرف گامزن تھا!

سنہ ۱۹۴۶ء میں کشمیر میں ایک خاموش انقلاب آیا۔ شخصی اور مطلق العنان حکومت کے خلاف اُسی کشمیری نے آوازِ حق بلند کی جس نے چپ چاپ سینکڑوں برس تک محکوم و مجبور ہو کر زندگی گزاری تھی۔ ڈوگرہ شاہی کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک چلائی گئی۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی ڈوگرہ فوج نے استبداد کی انتہا کر دی۔ اُن شہیدوں کی یاد تازہ ہونے لگی جو سنہ ۱۹۳۱ء میں اپنا نوجوان گرم گرم خون نہال آزادی کو پیش کر چکے تھے اور جن کی یاد ہر سال ۱۳ جولائی کو تازہ ہو جایا کرتی۔ اب کے بھی کتنے گبرو جوان، کتنی ماؤں کے دلارے اور کتنی دلہنوں کے سہاگ اُجڑ گئے؟ کسی کو نہیں معلوم! محمد عبداللہ تبت بقال اپنے محلے بدھ گیر اور آس پاس میں مسجدوں میں نعت خوانی کرتا، اور حاضرین کو کہتا کہ بدلے ہوئے زمانہ کا ساتھ دیں، ظلم کے خلاف آواز بلند کریں۔ حساس فن کار بے باک تھا اور جو کچھ ہو سکتا تھا اسے کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اندیشہ بھی لاحق تھا کہ کہیں جیل نہ ہو جائے جیل کی صعوبتوں اور ایذا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رسائیوں سے وہ گھبراتا بھی تھا۔ دوست احباب نے یہ اندیشہ دیکھ کر اُسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ایک اور انقلاب آیا۔ ہندوستان دو مملکتوں میں بٹ گیا۔ انگریزوں نے برصغیر سے کوچ کرتے ہوئے ہندو مسلمان کے خون کی ہولی دیکھی۔ لہو سے تاریخ آزادی لکھی گئی اور کشمیر سے مہاراجہ ہری سنگھ اپنے اہل و عیال لاؤ لشکر اور چہیتے جانثوں کو لے کر فرار ہو گیا۔ حملہ آور قبائلی سرینگر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے اور حکومت کی مشینری نابود ہو گئی تھی۔ پولیس، فوج اور دوسرے سرکاری کارندوں کا نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ مظفر آباد، کوہالہ اوڑی، کرناہ اور ہندوارہ سے سکھ رفیوجی سری نگر وارد ہو رہے تھے۔ بڈھ گیر جہاں کشمیری پنڈت جاتی کی اچھی تعداد آباد ہے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے بالکل اسی طرح سے جیسے فتحکدل، بھانہ محلہ، حبہ کدل، چینکرال محلہ، زیندار محلہ یا سھتو بربرشاہ کے کشمیری پنڈت۔ تو محمد عبداللہ تبت بقال نے اپنے ہم عمر دوستوں اور ہمسائیوں کے ساتھ حفاظتی کمیٹی بنائی جو باقاعدگی سے رات بھر پاس پڑوس کے محلوں میں بھی گشت کیا کرتی اور لوگوں کو تلقین کیا کرتی کہ وہ پُرامن رہیں اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کی ہدایات کا انتظار کریں۔ یہ فن کار کا ایک اور روپ تھا۔

دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء میں ریاست میں پہلا ریڈیو سٹیشن جموں میں قائم ہوا۔ ابھی تک مہاراجہ ہری سنگھ کا سکہ رواں تھا اور اُس نے مرکزی سرکار کو زور دے کر کہا کہ اگر کوئی ریڈیو سٹیشن قائم کرنا ہے تو پہلے جموں میں ہی قائم کیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور "جموں و کشمیر براڈکاسٹنگ سروس" کا پہلا نشریاتی ادارہ رنبیر سنگھ ہائی سکول کے پچھواڑے میں قائم ہوا اور کلاس روم

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہنگامی اسٹوڈیو میں بدل دیئے گئے۔ ریاست کے قلم کاروں، موسیقاروں، دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں کے لئے اپنے فن پارے پیش کرنے کی ایک نئی راہ نکل آئی۔ محمد عبداللہ تبت بقال اور اس کے دوسرے ہم عصر صوفیانہ موسیقاروں یعنی محمد سلطان میر، محمد سلطان بٹ، غلام نبی بٹ، امیر شاہ، غلام قادر مجاور، غلام محمد قالین باف، استاد رمضان جو، استاد صدیق جو وغیرہ کو اب اپنا فن، اپنا ہنر محفل سماع یا بادام واری یا مغل باغات کے دائروں سے نکال کر عوام الناس تک پہنچانے کے مواقع ملنے کی گنجائش نظر آئیں۔ وہ سب اگرچہ جموں نہیں گئے لیکن اُمید بندھ گئی تھی کہ سرینگر میں بھی ایک اور ریڈیو سٹیشن جلد ہی قائم ہونے والا ہے۔ اُمید پر دنیا قائم ہے تو فن کار بھی اسی دنیا کا باسی تو ہے!

وقت اور حکومت کی بدولت سری نگر میں یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو ایک اور نشرگاہ قائم ہوئی اور براڈ کاسٹنگ سروس کے بدلے میں ریڈیو کشمیر نے جنم لیا۔ چند ماہ قبل آل انڈیا ریڈیو کے اہل کاروں اور انجنیروں نے مہاراجہ ہری سنگھ کے پولو گراؤنڈ کے ایک پویلین کو منتخب کیا جہاں پولو کے گھوڑے ستالیا کرنے اور سلوتریوں (ماہر حیوانات ڈاکٹروں) کی تحویل میں دئے جاتے! جگہ بھی کیا چن لی تھی ان صاحبان ذوق نے!!

پروگرام افسروں میں ایاز انصاری، پربھات مکرجی، کرشن سروپ ملک، امرت لال مینی، بی آر مہرہ، کے ایس شنگلو اور دوسرے یکے بعد دیگرے نئے ریڈیو سٹیشن پر نازل ہوتے گئے۔ مگر ابتدا میں پربھات مکرجی اور کرشن سروپ ملک سرینگر آئے۔ ان کے آنے کا مدعا یہ بھی تھا کہ مقامی موسیقاروں کا آڈیشن ہو اور مناسب اور باہنر موسیقاروں کو ریڈیو کشمیر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پر ملازم رکھا جائے۔ چنانچہ مختلف موسیقاروں ـــــــــــ کے آڈیشن ہوتے گئے اور صوفیانہ موسیقاروں میں محمد عبداللہ تبت بقال کو بڑا مشاق گائیک اور سنتور نواز پایا گیا۔ آڈیشن کے بعد بھی پربھات مکرجی نے سنتور پر کئی ایک نغمے سُنے اور خوش ہوتا رہا کہ ایک عمدہ اور صاحب ہنر اور فن کار سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے صوفیانہ موسیقار بھی آڈیشن میں فن کا مظاہرہ کر گئے لیکن جو نقشِ اوّل تھا وہ نقشِ ثانی نہ بن سکا۔ محمد عبداللہ تبت بقال کے ساتھیوں میں پیر نظام الدین، غلام محمد قالین باف، امیر شاہ، غلام نبی بٹ، محمد سلطان بٹ، محمد سلطان میر اور غلام قادر مجاور کو سٹاف پر لیا گیا۔ اور اب صوفیانہ موسیقی کے رمز آشناؤں کے علاوہ عوام الناس بھی اس موسیقی سے لُطف اندوز ہونے لگے جو کل تک درباروں، محفلوں اور مخصوص نشستوں کی چہار دیواریوں میں مقید تھی۔ صوفیانہ موسیقاروں کے سامعین و شائقین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ تصور میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔

ریڈیو کشمیر کی ملازمت میں محمد عبداللہ تبت بقال سے میری ملاقات پھر ہوئی۔ یہ سلسلہ چار عشروں تک پھیلا ہے۔ میں نے بچپن ہی سے اس کا گانا اپنے دور کے رشتہ دار احمد اللہ کین کی قیام گاہ پر سنا تھا اور اس کے بعد جشنِ شگوفہ یا مغل باغات میں سننے کے مواقع میسر آتے گئے۔ میں اس کی طرزِ ادا اور صنفِ موسیقی میں عجیب سی کشش پاتا تھا۔ گھریلو ماحول میں فارسی کا چلن تھا تو گانے میں فارسی اشعار بھلے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ شروع میں معانی کم کم ہی سمجھ آتے۔ بچپن سے جوانی تک کا زمانہ گورنمنٹ پرائمری سکول اور پھر اسلامیہ ہائی سکول کے ایام پر محیط ہے جہاں فارسی بطور مضمون پڑھنے لگا اور اب محمد عبداللہ تبت بقال کے فارسی گانے میں مزید

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

دل جیسی پیار ہوتی گئی۔ جب ریڈیو کشمیر کی ملازمت اختیار کی تو مجھے شعبۂ موسیقی کا انچارج بنا دیا گیا۔ اب میں یہ جانتا تھا کہ صوفیانہ موسیقی کی ادائیگی میں وہی نظام الاوقات مروج ہے جو ہندوستانی سنگیت میں ہے۔ روز و شب کے آٹھوں پہروں میں مختلف مقام بانٹے گئے ہیں اور صوفیانہ موسیقار اسی کے عین مطابق صوفیانہ موسیقی پیش کرتا ہے۔ (مقام راگ کا بدل مانا جاتا ہے)

اب محمد عبداللہ تبت بقال کے دوسرے چھپے ہوئے گُن سامنے آنے لگے۔ اس کو اپنی آواز پر اتنا کنٹرول تھا کہ بیک وقت یا یکے بعد دیگرے وہ بوڑھے آدمی، بچے، عورت یا نوجوان کی آوازیں نکال لیتا اور ان میں مختلف ڈائیلاگ بھی ادا کر سکتا تھا۔ چنانچہ کبھی کبھی وہ کشمیری ڈراموں میں بھی حصہ لیا کرتا۔ اگر عین وقت پر کوئی اداکار ریڈیو سٹیشن پہنچ نہیں پاتا تو محمد عبداللہ تبت بقال سے رجوع کیا جاتا۔ تھوڑے پس و پیش کے بعد وہ وقت کی ضرورت کی وجہ سے یہ کام بھی کر جاتا۔ کہیں کوئی نعت خواں سٹوڈیو نہیں آجاتا، تو محمد عبداللہ تبت بقال عبدالاحد نادم یا ناظم یا جامی یا حقانی کی نعت لے کر حاضر ہو جایا کرتا۔ گائک غیر حاضر ہوتا تو محمد عبداللہ تبت بقال کی موجودگی میں اور کون گا سکتا تھا۔ سازندے کی ضرورت ہوتی تو سنتور لے کر محمد عبداللہ تبت بقال سٹوڈیو میں داخل ہو جایا کرتا۔ کسی پروگرام میں تلاوت قرآن حکیم مقصود ہوتی تو محمد عبداللہ تبت بقال کو طلب کیا جاتا۔ ماہِ صیام کے سحری پروگراموں میں مناجات و مناقب شامل کرنا ہوتے تو محمد عبداللہ تبت بقال پیش پیش ہوتا۔ محرم الحرام کا مہینہ آتا تو فارسی اور کشمیری مراثی محمد عبداللہ تبت بقال کی آواز میں ریکارڈ کیے جاتے۔ عیدوں اور تہواروں کی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بات ہوتی تو محمد عبداللہ تبت بقال کی طرف نظریں جاتیں، حتیٰ کہ کشمیری لیلا گو اپنے کا خیال آتا تو محمد عبداللہ تبت بقال کی اور رجوع ہوتا۔ چھکری اور روف گانے کی صلاح بھی محمد عبداللہ تبت بقال کو دی جاتی۔ درود خوانی کی ضرورت ہوتی تو محمد عبداللہ تبت بقال کو خدمات سے استفادہ کیا جاتا۔ حق تو یہ ہے کہ اس فن کار میں بہت سے گُن تھے۔ یہ فن کار "مجموعۂ ہنرہائے لطیف" تھا۔ یوں لگتا تھا کہ "ہر مرض کی دوا" یہ فن کار ہے۔ کسی زمانے میں امرت دھارا ہر بیماری کے لئے مجرب دوا مانی جاتی تھی تو اب ریڈیو کشمیر کا "امرت دھارا" محمد عبداللہ تبت بقال تھا۔

ایسے بہت کم موسیقار رہیں یا ہوئے ہیں جو روایتی گائیکی میں کوئی اختراع کرتے ہیں۔ کلاسیکی گائیگی میں وہی یہ قدم اٹھا سکتا ہے جو مشاق ہو اور پورے نظام آہنگ و ترنم پر نظر رکھتا ہو۔ ہم عصر اساتذہ اور موسیقاروں میں کسی نے یہ کوشش کبھی نہیں کی تھی کہ معاصر شعراء کی غزلیں اور جدید مفہوم کی شعری تخلیقات کو صوفیانہ موسیقی کے کسی مقام کی بندش میں گایا جائے۔ محمد عبداللہ تبت بقال نے پہلی بار ریڈیو کی ملازمت میں یہ بھی کر دکھایا۔ چنانچہ مہجور، آزاد، سائر، کامل اور کئی شاعروں کی غزلیں مختلف اوقات پر تنہا گا کر مختلف ریڈیو پروگراموں میں پیش کیں۔ ان کی ادائیگی میں کلاسیکی رنگ غالب رہتا مگر مروجہ طرزوں سے جدا بھی ہوتیں۔ کبھی کبھی تو یہ احساس ہونے لگتا کہ اب اس کے دوسرے ہمنوا گلوکار اس کا ساتھ دیں گے کہ اب گائیں گے! اسی جدت طبع کی بناء پر مشہور کشمیری لیلار

بیل تے ماد ل شیرہ گلاب میوش وَستے (دکترش جوراز دان)

گا کر ایک نئی طرح طرز و ادا ڈالی۔ کئی دوسرے چھوٹے بڑے فن کاروں نے اس کا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اتباع کرنا چاہا تھا اور اب بھی کوششیں جاری ہیں مگر وہ بات کہاں جو محمد عبداللہ تبت بقال کی ادائیگی اور گائیکی میں ہے۔

حکومت ہند کی دعوت پر ایک ایرانی موسیقی داں ڈاکٹر روح اللہ خالقی ملک کا دورہ کر رہے تھے تو پروگرام میں کشمیر آنا بھی شامل تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں وہ کشمیر آیا تو ریڈیو کشمیر کے لیولو گراؤنڈ والے سٹوڈیو میں محفل موسیقی آراستہ کی گئی۔ لوک سنگیت اور سازوں کے بعد صوفیانہ موسیقی کا دور چلا۔ مقامی اہل ذوق میں مولانا حیرت کاملی، مولانا فطرت گیلانی، میر حبیب اللہ کاملی اور علی شاہ بھی شامل تھے۔ محمد عبداللہ تبت بقال نے سنتور پر ایک نغمہ سنایا۔ روح اللہ خالقی بے حد محظوظ ہوئے اور کہنے لگے کہ کئی ایرانی موسیقاروں خاص طور سے حسن اور سنتور خاں حبیب سماعی کی طرح بجاتا ہے۔ ڈاکٹر خالقی خود بھی ایک ماہر تال نواز تھے اور تہران میں نیشنل سکول آف میوزک کے ڈائریکٹر تھے۔

ریڈیو کشمیر کے وجود میں آنے سے کشمیری فکر و فن کی ترویج و تشہیر ہونے لگی۔ کشمیری ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور دانشوروں کو مظاہرۂ فن کے لئے ایک نئی راہ مل گئی۔ اب شمس فقیر، احمد بٹہ واری، نعمہ صاحب، رحمان ڈار رحیم صاحب، محمود گامی، رسول میر، صمد میر، شاہ غفور، شاہ قلندر، مقبول کرالہ واری، حقانی، نادم، ناظم، ثناءاللہ کریری، ارنہ مال، حبہ خاتون، غنی کاشمیری، محسن فانی، شاہ صادق قلندر اور دیگر کشمیری اور فارسی شاعروں کا کلام عوام الناس تک پہنچانے کا ایک وسیلہ مل گیا تھا۔ نثر کی طرف بھی اب توجہ مبذول ہوگئی تھی جو کشمیری زبان میں کم و بیش نابود تھی۔ ریڈیو کے مختلف اصناف یعنی بات چیت انٹرویو، ڈرامہ، فیچر، غنائیہ میں کامیاب مشقیں ہونے لگی تھیں۔ داستان سرائی کے لئے ایک نئی راہ نکل آئی تھی اور اب اکہ نندن، ہیمال ناگرائے، گلریز، زہن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مزود، یوسف زلیخا، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں پیش کرنے کے لئے پیشہ ور داستان گویوں کی خدمات سے استفادہ ہونے لگا اور گھر کے خاموش ماحول میں سامعین یہ داستانیں سننے لگے اور حظ اٹھانے لگے۔ اسی طرح سے چھکری، رؤف، نیند باتھ، ہکہ بائتھ، صحرائی رنگ، چہار رنگ، شش رنگ، وژن، غزل اور لوک اور عشری موسیقی کے مختلف اصناف پیش کرنے والے کلاکاروں کی حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ صوفیانہ موسیقی جسے محفلوں میں متمول گھرانوں اور معدودے چند شائقین کی پشت پناہی حاصل تھی اب سرکار کے علاوہ عام جنتا کی ہمت افزائی میسر تھی۔ جب یہ صورت حال ہو تو جدت پسند طبیعت کوئی نہ کوئی کاوش کرنے کی تمنا ضرور رکھتا ہے۔ محمد عبداللہ تبت بقال ایسی ہی کاوشوں میں کچھ وقت صرف کرتا۔ اس کی آواز جاندار اور توانا تھی۔ رسائی (Range) بھی بہت تھی۔ ایک خاص طرح کا سوز تھا۔ ایک عجیب کشش تھی۔ فارسی اور کشمیری شاعری کی واقفیت کی بدولت الفاظ کی کماحقہ صحیح ادائیگی ہوتی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے موسیقی کے قومی پروگراموں میں پانچویں عشرے میں پہلی بار صوفیانہ موسیقی محمد عبداللہ تبت بقال کی قیادت میں براڈکاسٹ ہوئی تو یہ گائیکی ریاستی حدود سے نکل کر دوسرے شائقین کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ ان دیکھے، ان گنت سننے والوں نے اس کی آواز اس کا سنتور بجانے کا ڈھنگ سن کر فرحت و تازگی (Freshness) محسوس کی۔ اس کے بعد موسیقی کے سالانہ جشنوں میں مدعو سامعین کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے کئی مواقع میسر آئے۔ دلی، بمبئی، لکھنؤ اور دوسرے ثقافتی مرکزوں پر صوفیانہ موسیقی پیش کی گئی۔ صاحب نظر موسیقی دانوں نے تحسین و آفرین کی۔ اور کئی اعزازات سے نوازا۔ چنانچہ سنگیت ناٹک اکادمی نے ۱۹۷۲ء میں بہترین موسیقار کا قومی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

انعام پیش کیا۔ یہ انعام ملک کا سب سے بڑا اعزاز ہے اور صدر جمہوریہ ہر سال ملک کے برگزیدہ فن کاروں کو عطا کیا کرتے ہیں۔ اس اعزاز کے لگ بھگ چھ سال کے بعد ریاستی کلچرل اکیڈیمی نے بھی محمد عبداللہ تبت بقال جیسے نابغہ روزگار کو اعزاز سے نوازا۔ چنانچہ سالانہ تقریب پر ۱۹۷۸ء[2] میں خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام پیش کیا گیا۔ جس کا وہ مستحق تھا۔

محمد عبداللہ تبت بقال کی زندگی کا ایک دور یاد آتا ہے جو ریڈیو سے کنارہ کشی کا مختصر سا وقفہ تھا۔ جمعہ نماز پر کسی مسجد میں وعظ خوانی میں حکومت وقت کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرنا چاہی، تو مخبروں نے حاکم وقت کو رپورٹ دی۔ اس نے حاکم اعلیٰ کی خدمت میں "بغاوت" کی باتیں پہنچا دیں تو تحقیقات کے بغیر ہی انصاف کے تقاضوں کے برعکس، محمد عبداللہ تبت بقال نوکری سے سبکدوش کر دئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ محمد عبداللہ کی حکومت ڈسمس کی گئی تھی اور بخشی غلام محمد کا دور اقتدار شروع ہو چکا تھا۔ سال بھر در بدری میں گذرا پھر ریڈیو والوں کی جد و جہد رنگ لائی اور وہ پھر ملازم ہو گیا۔

محمد عبداللہ تبت بقال کی شخصیت کے ایک پہلو یا رخ کا ذکر کئے بغیر یہ مقالہ یا خاکہ نامکمل رہ جائے گا۔ وہ یہ کہ سفر کی سواری کے معاملے میں وہ بزدلانہ حد تک قدامت پرست تھا۔ پا پیادہ سفر کرنے میں دلی مسرت ملتی تھی مگر جلدی یا عجلت کی وجہ سے سائیکل سواری بھی کرتا۔ اگر سرینگر سے جموں جانا ہوتا یا ملک کے دوسرے حصوں میں منعقد سنگیت سبھاؤں میں شرکت کرنا مقصود ہوتی تو وہ بمشکل بس اور ریل کے سفر پر آمادہ ہو جاتا، شرط یہ ضرور رہتی کہ تنہا

---

۱ مہر ناد دس سال بعد (ادارہ)

۲ ستمبر ۱۹۷۸ء (ادارہ)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سفر نہیں کرنا ہے۔ ہوائی جہاز کے سفر کا نام سنتے ہی ہوائیاں اُڑ جاتیں۔ پسینے چھوٹنے لگتے، بے قراری اور دھڑکن تیز ہونے لگتی۔ آنکھوں کے آگے ساری دھرتی گھومتی نظر آتی اور بے چون و چرا کہہ اٹھتا: "استغفر اللہ، جہاز پر میں سوار نہیں ہو سکتا کیوں کہ میرے ہوتے ہوئے جہاز گر کر تباہ ہو جائے گا مفت میں میری جان جائے گی۔ مجھے مجبور نہ کریں، میں نوکری چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر جہاز پہ سوار نہیں ہو سکتا۔ میرے اہل و عیال کا کچھ پاس کریں میں ہوائی جہاز سے کبھی بھی نہیں جا سکتا....." اور ہوا بھی یہ کہ جب قومی کلچرل وفود کے ساتھ روس، شام، افغانستان، ایران اور دیگر بیرونی ملکوں کے سفر کی بات آئی تو محمد عبداللہ تبت بقال ہوائی سفر کے خوف سے بخار میں مبتلا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونِ ملک جا کر وہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے شائقینِ موسیقی کو محظوظ نہیں کر پایا۔

ریڈیو سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس کا موسیقی سے برابر قائم رہا، کلچرل اکیڈمی کے پروگراموں میں بھی شرکت کرتا رہا۔ لیکن سنہ ۱۹۸۰ء میں اپنے ایک عزیز کے انتقال کر جانے کے بعد وہ تھک سا گیا تھا۔ موسیقی سے بھی دل اکتا سا گیا تھا۔

۴ جنوری سنہ ۱۹۸۱ء کو تھوڑے دن صاحبِ فراش رہنے کے بعد اس ہمہ صفت موسیقار نے آخری سُر کھینچا اور اللہ ہو کہہ کر ہمیشہ کے لئے آنکھیں دنیا اور عزیز و اقارب سے پھیر لیں ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نشاط انصاری

حکیم حبیب اللہ

مرثیہ نگاری کا نام سنتے ہی ہمارا ذہن شہیدِ انسانیت حضرت امام حسینؑ اور ان کے جاں نثار رفیقوں، بھائیوں اور اولادوں کی اُس عظیم شہادت اور قربانی کی طرف منعطف ہوتا ہے جو انہوں نے اسلام کی بقاء اور تحفظ کے لئے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل سرزمینِ کربلا میں پیش کی۔ اس تاریخی المیہ سے پیشتر بھی اگرچہ مرثیہ نگاری کی صنف نے سارے عرب و عجم میں اپنے نقوش اور پیر و بال پھیلا دئے تھے اور عرب میں خاص طور سے شخصی یا ذاتی مرثیہ تخلیق کرنے میں عربی شعراء اپنا زورِ بیان صرف کر کے ایک دوسرے پر ترجیح لینے میں فخر محسوس کرتے تھے مگر کربلا کے واقعہ ہائلہ کے بعد مرثیہ گوئی کی صنف پلٹا کھا کر شہدائے کربلا کی شہادت کے منفرد کارناموں کے اظہار کے لئے ہی مخصوص ہو کر رہ گئی اور اس کا زیادہ چلن عرب کے مقابلے میں سرزمین ایران میں چل پڑا۔ اسی ایران کے ساتھ جب کشمیر کے سیاسی، تاریخی، ثقافتی، تہذیبی اور سماجی تعلقات ماضی قدیم سے استوار ہونا شروع

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوئے تو ایران کے شعر و ادب نے کشمیری زبان و ادب کو دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ ہی متاثر کیا۔ جس کے نتیجے میں ہمارے کشمیری شعری ادب کو غزل، ترانہ، دوبیتی، رباعی، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، مسدس، شہر آشوب ایسے اصنافِ سخن براہِ راست عطا ہوئے جیسا کہ یہاں کی تاریخی کتابوں میں وارد ہونے کے علاوہ کشمیری زبان و ادب کی تاریخ بھی یہی کچھ بتا دیتی ہے۔

کشمیری مرثیہ نگاری کی تاریخ، اس کے ارتقاء اور یہاں اس کے پہنچنے کا جہاں تک تعلق ہے یہ کشمیری اصنافِ سخن کی وہ واحد صنف ہے جو یہاں دو خانوں میں بٹ چکی ہے۔ ایک خانہ شخصی یا ذاتی مرثیہ نگاری کا اور دوسرا شہدائے کربلا کی بے مثال قربانی سے متعلق مرثیہ گوئی کا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل تھے جو اس خاص صنفِ سخن کے دو خانوں میں بٹ جانے کا باعث بنے؟ اس کا مناسب اور صحیح صحیح جواب بے ریا اور صاحب بصیرت مؤرخوں سے ہی مل سکتا ہے۔ پہلے حصے کی مرثیہ گوئی میں ہمیں صرف وہ مرثیہ ملتے ہیں جو ایک تو شخصی مرثیے تھے دوم یہ کہ ان کی ہیئت وژن فارم کی تھی یا مثنوی فارم کی یعنی کا دوسرا اہم حصہ کشمیری زبان میں کہے گئے وہ کلاسیکی مرثیے ہیں جو شہدائے کربلا کی محبت سے سرشار ہو کر تخلیق کئے گئے اور جن کی ہیئت فارسی زبان کی مرثیہ نگاری کی جیسی ہے نہ کہ عربی یا کسی دوسری ایشیائی زبان کی مرثیہ نگاری کی۔ اول الذکر قسم کی شخصی مرثیہ نگاری میں طبع آزمائی اگر کی جا چکی ہے تو اس میں حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والے کشمیری شعراء ہی پیش پیش دکھائی دیتے رہے ہیں اور اس مسلک سے وابستہ شاعروں نے بھولے سے بھی اس صنفِ خاص اور ہیئت کو اپنا کر اس پر قلم ہی نہیں اٹھایا ہے۔ ہاں اگر پوری سنجیدگی سے اور عقیدتاً قلم اٹھا کر اپنی ذہانت اور علمی و ادبی قابلیت کے جوہر دکھائے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

گئے ہیں تو وہ ہیں امامیہ مسلک سے منسلک شعراء جنہوں نے شہدائے کربلا کی شہادت سے متاثر ہو کر کشمیری زبان میں ایک خاص فارم کے تحت مرثیے لکھ کر کشمیری شاعری کے دامن کو اسی طرح مالا مال کیا اور بام عروج پہ پہنچایا۔ جس طرح کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے اردو زبان کو اپنے مراثی سے وسعت عطا کی اور اسے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے برابر لاکھڑا کیا۔

کشمیری زبان کے مرثیہ نگاروں کا دو خانوں میں بٹ جانے اور اس صنف کو مسلمانوں کے ایک اقلیتی فرقہ کی ہی صنف سخن قرار دئے جانے کے عوامل از خود یہ بات صاف کرتے ہیں کہ کشمیری زبان کے اولین تذکرہ نگار عبدالاحد آزاد کا کشمیری مرثیہ نگاری کے بارے میں اس اہم صنف کی تاریخ یا ارتقاء دکھانے میں چپ سادھ لینا ایک معنی خیز بات ہو سکتی ہے ورنہ محمود گامی کے دور سے موجودہ صدی کے ابتدائی دو دہوں تک لکھے جا چکے کشمیری مراثی کا کوئی تذکرہ نہ کرنا حقیقت سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کے بغیر اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ حالانکہ محمود گامی کے زمانہ سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد تک جن کشمیری مرثیہ نگاروں نے کلاسیکی طرز کی مرثیہ گوئی میں کمال دکھا کر کشمیری شعر و ادب میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے، اُن میں مرزا عبدالقاسم، خواجہ حسین میر (المعروف بہ حسنہ لوٗئے)، خواجہ محمد باقر، منشی محمد صفدر، منشی محمد قاسم، خواجہ محمد دائم، منشی شاہ محمد، منشی محمد یوسف، ملا عبداللہ انصاری، حکیم محمد جواد، حکیم عبداللہ، منشی مصطفیٰ علی، منشی محمد علی، حکیم حسن علی، منشی احمد علی غازی، قاضی احمد علی، سید صالح، سید تراب، منشی حسین علی، منشی محمد عباس، منشی حیدر علی، حکیم عظیم، منشی احسن اللہ، سید مصطفیٰ، حکیم غلام رسول، حکیم حبیب اللہ، سید رضا اور منشی محمد صادق ایسے یگانۂ روزگار مرثیہ نگار شامل

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہیں جنہوں نے ۳۰۸ طویل مراثی مختلف ناموں کے تحت تخلیق کیے ہیں سالن سارے مرثیوں کو اکٹھا کر کے اگر شیرازہ بند کر کے معرضِ اشاعت میں لایا جائے تو درجنوں ضخیم کتابیں سامنے آسکتی ہیں۔

ان ہی مرثیہ گو شعرا میں ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے آخری اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور کا مشہور و معروف کشمیری مرثیہ نگار اور اس بزم خاص کی آخری تابناک شمع حکیم حبیب اللہ حبیبؔ المعروف حبہ صاحب سرینگر میں محلہ بابا پورہ (حبہ کدل) کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں ۱۲۶۸ھ[2] مطابق ۱۸۵۲ء[3] کو روشن ہوئی۔ حبیبؔ کے اپنے ہی اس مصرعہ سے انکی تاریخ ولادت نکلتی ہے

خاک پائے ابوترابؑ حبیبؔ۔ (۱۲۶۸ھ) — آپ کے والد کا نام تھا حکیم عبدالرحیم، جو اگرچہ شاعر یا کوئی عالم و فاضل نہ تھے تاہم علم و ادب کے شیدائی ضرور تھے۔ دادا حکیم محمد عظیم واقعی عظیم مرثیہ نگار تھے اور انہوں نے دو درجن سے زائد مرثیے تخلیق کیے ہیں۔ حکیم حبیب اللہ کا خاندان اصل میں "ملا" نام سے ہی جانا جاتا تھا مگر بعد میں ملا سے "حکیم" بنے۔ کلیات حکیم حبیب اللہ کے مؤلفین سید محمد انیس کاظمی اور محمد یٰسین منظر ان کا شجرۂ نسب اس طرح پیش کر چکے ہیں:۔

"حکیم حبیب اللہ حبیبؔ ابن حکیم عبدالرحیم ابن حکیم محمد عظیم ابن حکیم محمد جواد ابن ملا علی اکبر ہمدانی ابن ملا عبدالغنی ہمدانی (برادر ملا محمد طاہر غنی کشمیری) ابن ملا محمد طالب ہمدانی ابن ملا محمد صادق ہمدانی ابن

۱؎ شاہد بڈگامی کے مؤرخانہ انداز کی صداقت از منشی نذیر احمد ایم اے، حبہ کدل، ڈپٹی لیبر کمشنر

۲؎ تاریخ شیعیان کشمیر از حکیم غلام صفدر، حبہ کدل سابق افسر خزانہ

۳؎ شاہد بڈگامی نے اپنی کتاب "کاشر مرثی ہنزتاریخ" میں ۱۸۵۶ء دکھایا ہے جو غلط ہے۔ ن۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ملا عبدالرشید ہمدانی ابن ملا سعید الدین ہمدانی“ ۔

یہی ملا سعید الدین ہمدانی حبیب کے مورث اعلیٰ ہیں جو حضرت میر سید علی ہمدانی ؒ کے ایک مصاحب خاص کی حیثیت سے ۷۷۳ھ / ۱۳۷۱ء میں بغرض تبلیغ کشمیر میں وارد ہوئے تھے ۔[۱] ملا سعید الدین ہمدانی جب انتقال کر چکے تو ان کے جسد خاکی کو خانقاہ معلیٰ کے صحن میں آسودہ کیا گیا ۔[۲] حکیم صاحب کے پڑدادا حکیم محمد جواد کے دور سے ہی ان کا خاندان اپنی علم دوستی اور علمی برتری سے ملا نام چھوڑ کر حکیم بنا ۔ یہ حکیم جواد افغان گورنر عبداللہ خان[۳] کے مشیر خاص تھے اور ان کے دادا حکیم محمد عظیم شاہی طبیب کے عہدہ پر فائز تھے ۔

بابا پورہ حبہ کدل کا یہ ملا خاندان ابتداء میں سری نگر کے خانقاہ معلیٰ کے آس پاس شمس واری میں سکونت پذیر تھا مگر بعد میں یہ خاندان بابا پورہ حبہ کدل منتقل ہو گیا جہاں آج بھی اس خاندان کی شاخیں گذر بسر کر رہی ہیں جبکہ کئی ایک آبادی کے دباؤ کی وجہ سے دوسری جگہوں پر منتقل ہو کر زندگی گذار رہے ہیں ۔ اپنے خاندانی رسم و رواج کے مطابق حکیم حبیب اللہ نے عربی اور فارسی تعلیم اپنے ہی اسلاف سے گھر پر حاصل کی اور اس کے بعد سرکاری سکول میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کو داخل کر دیا گیا اور بعد میں سری پرتاپ ہائی سکول سے انہوں نے سیکنڈری سطح کا امتحان پاس کر لیا ۔ کہتے ہیں کہ جب حکیم صاحب اس سکول میں زیر تعلیم تھے تو مہاراجہ معائنہ کرنے کی خاطر سکول میں تشریف لائے اور جب حکیم حبیب اللہ کی کلاس میں داخل ہوئے تو بچوں سے ایک ایسا سوال پوچھا جس کا جواب ان کا استاد تک نہ دے سکا مگر حکیم صاحب ایسے ذہین تھے کہ انہوں نے مہاراجہ کے

---

۱ کلیات حکیم حبیب اللہ ۲ تاریخ حسن، تاریخ واقعات کشمیر اور تاریخ شیعیان کشمیر ۳ سنہ ۱۰۱۲ھ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سوال کوشش کر ہی ہاتھ اوپر اُٹھا لیا تھا اور جب سوال کا صحیح جواب دے چکے تو مہاراجہ ششدر ہو کے رہ گیا اور کہہ اُٹھا "پینڈ یا ریا مرسی یا پاگل ہو سی"۔ چنانچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایسا ہی ہوا جس کی کہ پیش گوئی مہاراجہ نے کی تھی۔ ہوا یہ کہ انکی پہلی بیوی تاجہ بانو جب ان کو داغ مفارقت دے گئی تو اس سانحہ کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا پڑا کہ وہ اپنا دماغی توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ بیوی کی جدائی میں جو غموں کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے اُن سے متاثر ہو کر "مرگ زن" عنوان سے ستر اشعار پر مشتمل ایک فارسی نظم لکھی جس کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:۔

مرد حیران مے شود از مرگ زن　　خانہ ویران مے شود از مرگ زن

زن نگہدار ندۂ ایمان بود　　نقص ایمان مے شود از مرگ زن

بعد زن تقوئی مرد آمد محال　　بلکہ شیطان مے شود از مرگ زن

عشرت آباد جہان اے دوستان　　تیرہ زندان مے شود از مرگ زن

زہ اشک از اختلاط خون دل　　رنگ مرجان مے شود از مرگ زن

مرد فہد این کہ مے گوید حبیب　　مرد حیران مے شود از مرگ زن

کچھ مدت بعد محلہ شمس واری خانقاہ معلی کی ایک بیوہ کلثوم بانو سے دوسری شادی کی مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد کلثوم بانو نے اپنی تنگ مزاجی اور چیڑ چڑے پن سے انکی زندگی کو وبال جان بنا دیا اور اس سے اُن کا دماغی توازن اور بھی بگڑ گیا۔ اُن کے مندرجہ ذیل شعر سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ دوسری بیوی سے کس حد تک تنگ آچکے تھے اور اُس سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے ؎

حبیب اللہ گرفتارم در زندانِ کلثومہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خداوندا رہایم کن از زندان کلثومہ

اس دور سے قبل ہی وہ لاہور گئے تھے۔[1] جہاں انہوں نے مزید تعلیم حاصل کی اور وہ ایسی پر اپنے ہی محلے میں ایک مکتب کھولا جہاں بچوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم دینے لگے۔ ان کی عربی اور فارسی دانی کا یہ عالم تھا کہ عدالت عالیہ کے منصف اعلیٰ کوبی ایلمبر ولیہ، جو فارسی اور اردو زبان سے نابلد تھے، نے اُن سے اردو اور فارسی سیکھی۔ اس دور میں حکیم صاحب نے اپنے دادا حکیم محمد عظیم کی طرح مرثیہ نگاری شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے صف اوّل کے مرثیہ نگار بن گئے۔ جو مرثیے حکیم حبیب اللہ نے تخلیق کر کے اپنے خاندان کا نام روشن کیا، اُن میں مضمون خوف، میزان، شہادت، دوستی، آب، مقتول، زندان، چراغ، خون، گلزار، عطش، کشتی، کربلا، کار، یوسف اور ہمیشہ بہار شامل ہیں۔ کلاسیکی طرز اور اپنی مخصوص ہیئت کے اعتبار سے مضمون کربلا میں سے یہ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

"زُچھ تُو تتھ ما بدل گوس، یہ فرمود مُت اوس خیر الانامن[1]
آو ماریش[2] منز فرزند سالار بیت اللہ مبتلا
گیس بر فراتس کن زِچھان خورد سالے
روٗ تمھو امام زمان گوٗرُس فوجس ڈاُس سعدن[3] نمک حرامن،
گوٗ ظلمہٕ ژھعہٕ ٹلے چراغ روضہٕ رسول اللہ[ص]
پھٹرن کبوتر حرمن پرو بالے۔"

---

[1] کیاشر مرثی ہنز تاریخ از شاہد بڈگامی ۔ کلیات حکیم حبیب اللہ

[2] دشت کربلا کا دوسرا نام ماریہ بھی تھا اور غاضریہ بھی۔

[3] یزید کی طرف سے آئی فوجوں کا سپہ سالار ابن سعد بن وقاص۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

(دیکھئے کہ اس میں ذرا بھر بھی فرق نہ ہوا جو کچھ کہ حضرت خیرالانامؐ نے حسینؑ کے بارے میں فرمایا تھا۔ سالار بیت اللہؐ کے فرزند حسینؑ دشت ماریہ میں مبتلائے مظالم کئے گئے۔ اُن کے غنچہ دہن معصوم بچے اور کڑیل جوان بیٹے فرات کی موجوں کو دیکھ دیکھ کر کربلا کی تپتی ریت پر پژمردہ ہوئے ـــ امام زمان حسینؑ کو ظالموں نے گھیرے میں لے لیا اور نمک حرام ابن سعد نے انکی فوج کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ ظلم و جبر کے زور دار جھکڑ چلنے سے روضۂ رسول اللہؐ بے چراغ ہو گیا اور حرم پاک کے ان کبوتروں کے بال و پر نوچ لیے گئے)

ان مراثی کے علاوہ حکیم حبیب اللہ نے کچھ منظوم تراجم کے علاوہ، فارسی، اُردو اور کشمیری غزلیں، قصائد، مناقب، رباعیات، قطعات، فرد، مادۂ ہائے تاریخ، مخمس، وقایع شہر آشوب، تین چار مثنویاں موسوم بہ سیلاب نامہ، کاشتکار نامہ، ساقی نامہ، اور ریختہ، وغیرہ تخلیق کر کے کشمیری شعر و ادب کے سرمایے میں اضافہ کیا۔ ایک فارسی غزل کے یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ ان کو فارسی غزل لکھنے پر اچھی دسترس حاصل تھی ؎

بہار آمد چمن پر شد سمن بشگفت و سنبل ہم
بطرف بوستان قمری نوا خوان گشت و بلبل ہم
درین موسم کہ بردم در ہوا رنگ دگر بینم
بدستم بایدی دست نگار و ساغر و مل ہم
حبیبا گر زرسوائی رخش مجنون شدی می شو
ولیکن اند کے دیوانہ را باید تعقل ہم

ملا محتشم کاشی کی ایک نظم کی تضمین پر حضرت علی کرم کی منقبت میں یہ اشعار ظاہر

۱؎ جو بہتر ۷۲ نفوس پر مشتمل تھی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کہ رہے ہیں کہ حبیب حضرت علی کرم کے زبردست مداح تھے ؎

خاطرے دارم پریشاں یا علی — خاطرم را جمع گرداں یا علی

سوختم بہرِ خدا بر آتشم — از کرم آبے بیفشاں یا علی

کے حبیب از غیر تو خواہد مراد — از تو دارم چشمِ احساں یا علی

حکیم صاحب نے جو فارسی قصیدہ بعنوان "قصیدہ در توقف لاہور" لکھا ہے اس کا مطلع ہے ؎

دوشینہ بخواب اندرم آں لعبتِ کشمر

بارخے چو گل آمدہ با موئے چو عنبر

اور مقطع کو یوں نظم کیا ہے ؎

خاموش حبیبا نہ سزد شکوہ زدانا

رزاق کسے نیست بجز خالقِ داور

قصیدہ ہذا میں یہ ایک دو شعر ایسے ہیں جن میں انگریزی زبان کے کئی لفظ مثلاً کاسٹک، پلاسٹر، ماسٹر، آر (are) آر (or) اور یو (you) استعمال کئے گئے ہیں ؎

نہ ڈاکٹرم تا بشفاخانہ نشستہ — گاہ کاسٹک آرم بعمل گاہ پلسٹر

نہ ماسٹرم تا کہ اث گہ دہ کنم ٹیچش — او آر بخواں آر چو یو آر یو ود آر

کلاسیکی طرز کی مرثیہ نگاری کرنے والے درجنوں شاعروں میں سے حکیم حبیب اللہ ہی وہ واحد مرثیہ نگار ہیں جنہوں نے قریب قریب ہر صنف شعر پر طبع آزمائی کی ہے۔ درج ذیل رباعی اس بات کی غماز ہے کہ حکیم صاحب اس صنف پر بھی اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے ؎

جانم فدائے نام علمدار کربلا[4] — سقائے کربلا و سپہ دار کربلا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یعنی جناب حضرت عباسؑ نامدار   پورِ علیؑ و جعفر طیارؑ کربلا

انھوں نے شیخ سعدیؒ کی مشہور رباعی "بلغ العلیٰ بکمالہٖ" کی تضمین کشمیری زبان میں نہایت ہی پیارے انداز سے کرکے اپنی قادرالکلامی کا عملی ثبوت پیش کیا ہے:

معراج کوڈ آں حضرتنؑ   بلغ العلیٰ بکمالہٖ
گٹہٖ ترج مہالس وٕ فعتن   کشف الدجیٰ بجمالہٖ
کیاہ بو ہتمن خُلقِ حسن   حسنت جمیع خصالہٖ
صلوات سوزو مرد و زن   صلوا علیہ وآلہٖ

ذیل کے یہ ایک دو شعر بزبانِ حال بتا رہے ہیں کہ حکیم حبیب اللہ کو اردو، فارسی اور کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ عربی زبان پر بھی خاصا عبور حاصل تھا اور عربی زبان کا گہرا مطالعہ بھی، جیسا کہ ان کی مراثی کو پڑھ کر بھی ظاہر ہوتا ہے ؎

چنیں اہلِ ماں راچہ باشد جواب   بغیر از لکم دینکم ولی الدین
آں مست زکو کنار و این از افیون   کل حزب بما لدیہم فرحون

ریختہ یعنی دو یا زیادہ زبانوں کے لفظوں سے مخلوط کلام، ہمارے کئی اور شعراء نے لکھا ہے۔ مگر حکیم حبیب اللہ کا طبعی جھکاؤ اس صنف کی طرف انکی ذہنی اُپج کے اعتبار سے زیادہ ہی شوخ اور لطیف قسم کا ہے۔ حکیم صاحب نے فارسی اشعار کو کشمیری زبان کے لفظوں کے جوڑ سے واقعی پھلجڑی بنایا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر کہ "یڈ"[1] را ہمیشہ وارد "کھیج"[2]   "یڈ" مگو از جحیم باشد "گیج"[3]
در مجالس شود خجل بسیار   آنکہ در جیب ندارد "ڈیج"[4]
حد چو ابلیس را دہد تعلیم   زنِ مکارہ گرچہ باشد "کیج"[5]

---

۱ پیٹ ۲ کشادہ ۳ بھٹی یا چولھا ۴ رومال ۵ گونگی

حکیم حبیب اللہ چونکہ بہت ہی حساس شاعر تھے اس لئے دوسری بیوی کی ترش مزاجی، ناشزبانی اور زبان درازی نے ان کے ذہن میں فراریت کے احساس کو زیادہ ہی تیکھا بنادیا تھا اور ان کے خانگی حالات میں بھی رخنہ پڑا ہوا تھا۔ ان حالات سے مجبور ہو کر اور اپنے غم کو غلط کرنے کے لئے کھلے عام چرس پینی شروع کی اور اس کا چسکا ایسا پڑا کہ چرس خریدنے کیلئے دوسروں سے روپیہ پیسہ مانگنے میں کوئی عار یا جھجک محسوس ہی نہ کرتے تھے۔ دن بھر چرس کے تکیوں پر وقت گذارنا ان کی عادت بنی اور آہستہ آہستہ اپنی ظاہری وضع قطع بھی تبدیل کی اور ادھر ادھر گھومنے پھرنے کی لت بھی پڑی اور بالکل مکمل طور پاگلوں کی طرح گلی گلی اور کوچہ کوچہ پھرنے لگے، مگر شاعرانہ صلاحیتوں میں کوئی بھی فرق نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ اسی پاگل پن میں ایک دن گھومتے گھومتے کولگام پہنچے جہاں آغا فیملی کے آغا عبدالکریم تھانیدار تھے اور حکیم صاحب کے ساتھ ان کی تھوڑی بہت رشتہ داری بھی تھی۔ عبدالکریم ان کو دیکھ کر اپنے ڈیرے پر لے گئے اور ان کی خوب خاطر تواضع کر کے انہیں چھیڑنے کی غرض سے ان سے کہا کہ کیوں نہ کوئی نیا مرثیہ ابھی کہا جائے۔ حکیم نے جواب میں کہا کہ ایک شرط پر۔ آغا نے پوچھا کہ وہ کون سی شرط ہے؟ حکیم صاحب بولے کہ ایک الگ کمرہ فراہم کیا جائے اور سماوار میں گرم گرم نمکین چائے "ڈھیر سی باقرخوانیاں اور رات کے لئے چرس۔ عبدالکریم چونکہ تھانیدار تھے اور وہ بھی اس دور میں جبکہ ایک سپاہی کو دیکھ کر ہی گاؤں کے گاؤں خالی ہو جایا کرتے تھے۔ ان کے لئے لہٰذا یہ سبھی چیزیں فراہم کرنے میں کوئی بھی مشکل تھی ہی نہیں۔ فوراً "حکیم صاحب کی فرمائش پوری کر دی گئی" تو انہوں نے اپنے عالم وحشت میں دوسرے دن صبح ہونے تک ایک پرمغز مرثیہ بعنوان "یوسف" تخلیق

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کر سکے آغا عبدالکریم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ تخلیقی عمل میں وہ پاگل نہیں ہیں۔

ایک دو دن کے بعد عبدالکریم حکیم حبیب اللہ کو اپنے ساتھ سرینگر لے آئے اور انہیں مولانا مولوی حیدر علی انصاری؎ کے پاس لے گئے جہاں حکیم حبیب اللہ نے مولوی موصوف کو اپنا وہ تازہ مرثیہ سنایا جسے سن کر مولانا صاحب بھی متحیر ہو گئے۔ البتہ ایک اعتراض پیش کیا کہ مرثیہ میں ایک جگہ پیغمبر حضرت یعقوبؑ کے ساتھ جو "خراماں" کا لفظ لایا گیا ہے اس سے شعر میں ابتذال پیدا ہوا ہے لیکن حکیم صاحب کی ذہانت کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے بے ساختہ مولانا سے کہدیا کہ کیا آپ جیسے عالم و فاضل کو معلوم نہیں کہ عربی زبان میں گیدڑ کو یعقوب بھی کہا کرتے ہیں اور یہ لفظ اسی مناسبت اور مفہوم سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ سن کر مولانا حیدر علی حکیم حبیب اللہ کی حاضر دماغی اور علمی برتری پر عش عش کر اٹھے۔

ان کی پریشان حالی اپنی جگہ لیکن ان کی بذلہ سنجی اور ظرافت اپنی مثال آپ تھی۔ اس کا ثبوت اُن کے اُس واقعہ سے مل سکتا ہے جبکہ ایک دفعہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کی شادی کی تقریب پر کھانا کھا رہے تھے۔ یہ بتا دینا مناسب رہے گا کہ کشمیر میں مروج رسم کے مطابق مسلمان دعوتوں میں عام طور پر چار چار آدمی ایک ہی ترامی (بڑی پلیٹ) میں کھانا کھاتے ہیں۔ حکیم حبیب اللہ کے ساتھ محلہ آدروٹ عشائی کوچہ فتحکدل کے ایک لکھے پڑھے گھرانے کے تین شخص کھانا کھا چکے۔ ان تینوں کی ذات "پنزو" تھی۔ پنز (پونز) کشمیری زبان میں بندر کو کہتے ہیں اور پانچ کے عدد کو بھی۔ اور جب ایک پنز (پونز) کو تین سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب میں پندرہ کا عدد آتا ہے۔ صاحب خانہ بصد احترام حکیم صاحب کے پاس آئے اور ان سے پوچھا کہ بھئی حکیم

؎ مولوی افتخار حسین انصاری کے دادا جو فرقہ اثنا عشریہ میں مجتہد تصور ہوتے تھے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صاحب کھانا اچھی طرح سے کھا چکے۔ حکیم حبیب اللہ نے بیساختہ نہایت سنجیدہ ہو کر کہا کہ کیا کھاتے۔ دوسری تراميوں (پلیٹوں) میں چار چار آدمی کھانا کھا چکے لیکن میری ترامی (پلیٹ) میں سولہ آدمیوں نے کھانا کھایا۔ لہٰذا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چار آدمیوں والی ترامی (پلیٹ) سے سولہ آدمی کس طرح رچ کر کھانا کھاتے۔ یہ سن کر صاحب خانہ حیران ہوئے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب بولے کہ دیکھئے صاحب حیران ہونے کی کوئی بات نہیں، ایک تو یہ خاکسار کھانا کھا رہا تھا اور پھر یہ تین بیشر یعنی پندرہ لوگ ہو گئے نا سولہ۔ حکیم صاحب کی اس بذلہ سنجی سے ساری محفل ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

حکیم حبیب اللہ نے ایک فارسی مخمس لاہور کالج کے شیخ غلام محبوب سبحانی کی عقیدت و احترام میں اپنے قیام جموں کے دوران لکھا ہے جس کا پہلا بند یوں ہے:

دی شد بباغ آن بت نسرین عذار ما
جانان ما و مونس ما غم گسار ما
آرام جان شکیب دل بے قرار ما
غارہ سبزین ما، چمن ما بہار ما
روح روان و مرہم جان فگار ما

حبیب اللہ نے مہاراجہ رنبیر سنگھ، دیوان کرپا رام وزیر اعظم کشمیر اور نواز شلی خان نواب (لاہور) کی وفات پر مادہ ہائے تاریخ نکالنے کے علاوہ اپنے خاندان، بزرگ رشتہ داروں، اہل علم حضرات اور قریبی اصحاب کے درجنوں مادہ ہائے تاریخ لکھے ہیں ساتھ ہی ساتھ شادی بیاہ اور ختنہ وپیدائشی تقاریب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پر بہت سے تہنیت نامے بھی تخلیق کیے ہیں اور یہ سبھی فارسی زبان میں ہی کہے گئے ہیں۔ اردو میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ سب کا سب آتشزنی کی ایک واردات میں تلف ہو کر رہ گیا۔ البتہ اردو تضمین کا یہ بند ان کی کلیات میں درج ہے

سُنا خضرؑ نے جب غیب سے یہ کلام
کہ جا کر رکابِ شہِ دیںؑ تمام
تو وہ آگے بڑھ کر باخلاص تام
لگا رونے اور عرض کی یا امام

"نگہدار مارا از راہِ غلط
خطا در گذار و صوابم نما"

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حکیم حبیب اللہ حد سے زیادہ چرس پینے لگے تھے اور مکمل طور پاگل ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں اس یگانۂ روزگار ادبی و علمی شخصیت کو اپنے ہی گھر کے ایک کمرے میں بند کر کے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ اس طرح سے ان کو چرس ملنی بند ہو گئی۔ اس تعزیر پر وہ خاموش رہنے اور ایک آدھ بات تک نہ کرنے سے ہی اپنی ناراضگی دکھاتے رہے۔ ہاں اگر کوئی رشتہ دار یا لنگا بندھا زور زبردستی دکھا کر ان کو باتیں کرنے پر مجبور کر دیتا تو حکیم صاحب "کافر مسکین نہ دنیا نہ دیں" کہہ کر دوبارہ خاموش ہو جاتے۔ آخر کار وہ اسی عالم حیرانگی میں ۵۲ سال کی عمر پا کر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۰۵ء اس بساطِ حیات سے اٹھ کر چلے گئے اور اپنے آبائی قبرستان محلہ حسن آباد (رعناواری) سرینگر میں آسودہ کیے گئے۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایس۔ این۔ زاڑو شمن

جسٹس جیالال کلم

جسٹس جیالال کلم کا جنم ۱۸۹۸ء میں سرینگر کے ایک معروف پنڈت گھرانے میں ہوا۔ کول نام کا آپ کا کنبہ بنیادی طور پر ایک گاؤں "کلم" سے تعلق رکھتا تھا جہاں ان کی کافی زمین جاگیر موجود تھی۔ اس کے علاوہ اس گھرانے کی اُس دور کے حکمران کے دربار میں خاص قدر و منزلت تھی۔ مرحوم جسٹس کلم کے دادا پہلے شخص تھے جو سری نگر منتقل ہوئے۔ چنانچہ کول خاندان کے سرینگر منتقل ہونے کے ساتھ ہی ان کے گاؤں کا نام بھی ایک وفا شعار ساتھی کی طرح ان کے ساتھ رہا۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہی نام ان کی ذات ٹھہری اور یہ سلسلہ برابر آج تک چلا آرہا ہے۔ جسٹس کلم کے دادا نائب وزیر وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ انہیں وادیٔ کشمیر کے ایک مقتدر جاگیر دار کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ آپ کے والد شری سونہ کول کلم نے ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے سرکاری نوکری اختیار کی۔ پولیس کی نوکری اس زمانے میں عزت و توقیر کی ایک اہم علامت تصور کی جاتی تھی لیکن انہیں اس نوکری کو بہت جلد چھوڑ دینا پڑا کیوں کہ ان کی وسیع جاگیر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کی نگہداشت کی ذمہ داریاں مقابلتاً مقدم تھیں۔

ایس۔ پی کالج سرینگر سے گریجویشن کرنے کے بعد شری کلم نے ۱۹۱۹ء میں لاء کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آپ نے ۱۹۲۲ء میں بیچلر آف لاء کی ڈگری امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ آپ سرینگر بار میں کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے اور اپنی کم عمری کے باوجود نہایت مقبول رہے۔ آپ کو "منصف" کے عہدے کیلئے منتخب کیا گیا، لیکن آپ کی شاہین صفت فطرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس کی پرواز کی بیکراں وسعتوں کو محدود اور محصور کیا جائے۔ آپ نے یہ اہم عہدہ ٹھکرا دیا۔

شری کلم نے جموں و کشمیر ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی اور نہایت قلیل عرصے میں آپ نے اپنے پیشے کے سول اور فوجداری دونوں شعبوں میں کامیابی اور کامرانی کی نئی منزلیں سر کیں۔ وہ اپنی خداداد ذہانت، حاضر جوابی اور قوتِ خطابت کے لئے مشہور ہو گئے۔ یہاں مجھے ایک خاص واقعہ کی یاد آرہی ہے وہ ہائیکورٹ کے ایک سرکردہ جج کے سامنے ایک فوجداری کیس کی جرح کر رہے تھے۔ جج صاحب ان کے اُبھارے ہوئے نکتے سے اتفاق نہیں رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے کلم صاحب کو ٹوکتے ہوئے کہا:

"دیکھئے مسٹر کلم! آپ کی ریل چھوٹ گئی ہے ---!"

فاضل جج کی اس چوٹ پر مسٹر کلم نے اس طرح فقرہ چست کیا:

"حضور والا ---! مجھے قطعی یہ خیال نہیں تھا کہ میں ایک ریلوے اسٹیشن کے سامنے کھڑا ہوں ---!"

ایک وکیل کی حیثیت سے وہ ہمیشہ وکیلوں کے پیشے کی عزت و توقیر کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ وہ کھوکھلے رشتوں کے قائل نہیں تھے بلکہ اپنی نشست و برخاست میں چھوٹے بڑوں سے یکساں طور گھل مل جاتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی بیکراں انسانی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

محبت اور مزاج کی زبردست جس کے باعث کافی ہر دلعزیز تھے ۔ یہ اسی مقبولیت کا نتیجہ تھا کہ وہ مسلسل دس برس تک کشمیر بار ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوتے رہے ۔

مسٹر کلم نے اپنی سرگرمیوں کو عدالت تک ہی محدود نہیں رہنے دیا بلکہ وہ ریاست کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی برابر ایک اہم رول ادا کرتے رہے ۔ اگرچہ وہ خود ایک باثروت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے اعلیٰ خاندانی پس منظر کے باوجود وہ سیاسیات کے ساگر میں بے خطر کود پڑے ۔ انہوں نے عوامی تحریکات میں ایک اہم رول ادا کیا اور ظلم و جبر سے دبے کچلے کشمیری عوام کی آواز پہ لبیک کہہ کر مطلق العنانیت کے جلال و جبروت کو للکارا ۔ آپ نے سب سے پہلے ہندوستانی ریاستوں میں شخصی حکومت کے نقش کہن کیخلاف آواز بلند کی ۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک مضمون سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا ۔ اس مضمون کی اشاعت سے آپ کا رابطہ آنجہانی سر تیج بہادر سپرو سے قائم ہوا جو اس زمانے کے ایک ممتاز ماہر قانون اور سیاستدان ہونے کے علاوہ بعض ریاستوں کے فرمانرواؤں کے صلاح کار بھی تھے ۔

یہاں اپنی ریاست میں وہ پنڈت فرقے میں بڑھتی ہوئی سماجی بدعات اور اقتصادی مسائل سے بے حد متاثر ہوئے ۔ انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کے ہمراہ ایک ایجی ٹیشن شروع کی ۔ یہ تحریک سنہ ۱۹۳۰ء میں شروع کی گئی اور اس کا مقصد پنڈت فرقے کے مختلف مسائل کا حل ڈھونڈ نکالنا تھا ۔ امتناعی احکامات کی خلاف ورزی کی پاداش میں انہیں حراست میں لیا گیا ۔ انہیں آل سٹیٹ کشمیری پنڈت کانفرنس (سناتن دھرم یووک سبھا) کا جنرل سیکریٹری اور بعد میں صدر منتخب کیا گیا ۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنے قریبی ساتھی شری کیشپ بندھو کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اشتراک سے جاتی کے سماجی ڈھانچے میں نمایاں تبدیلی لانے کے لئے پیہم کاوشیں کیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیری پنڈت فرقے کو اس وقت صدیوں پُرانے رسومات بد نے کھوکھلا بنا کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ جہیز اور شادی بیاہ سے متعلق ایسی تقاریب کیخلاف ایک ہمہ گیر احتجاج کا آغاز کیا گیا جن پر روپے پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا۔ ان مستحسن کوششوں کے نتیجے میں اب یہ تقاریب نہایت سادگی سے منائی جانے لگیں اور پھر شری کیشپ بندھو کی قیادت میں کشمیری پنڈت خواتین نے سالہا سال پرانا اپنا لباس تبدیل کر کے ساڑھی کے نئے اور سادہ لباس کو اختیار کیا۔ یہ بات بلا تامل کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے معاشرے کے رگ و پے میں سمائی ہوئی مکروہ رسومات کا قلع قمع کرنے کے لئے ایک کامیاب جہاد کا بیڑا اٹھایا ـــــ !

کلم صاحب اپنی حیات میں کبھی بھی فرقہ داریت کے رجحانات سے مغلوب نہیں ہوئے۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ اُن دنوں وہ ایک جواں سال وکیل تھے اور انہیں لاہور کے بعض قریبی دوستوں نے شام کے کھانے پہ بلایا تھا۔ یہ سبھی دوست ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ دعوت اپنے شباب پر تھی کہ ان کے ایک دوست نے ہاؤس بوٹ والے ہانجی کی بیوی کے متعلق ایک نازیبا بات کہدی۔ کلم صاحب نے اس بے ہودہ بات کا سخت نوٹس لیا۔ وہ مغلوب الغضب ہو کر دعوت سے اٹھ کر چلے گئے۔ دعوت کا سارا رومان کافور ہو گیا اور ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ مسٹر کلم اپنے اس دوست سے پھر زندگی بھر نہیں ملے۔ اُن کے جسم کے رگ و ریشے میں، اُن کے خون کے ہر قطرے میں کشمیریت کا لاوا اس طرح بھیر تا رہتا تھا کہ وہ مذہب یا ذات پات سے بالاتر ہو کر کسی بھی کشمیری کی عزتِ نفس پر حملہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

۱۹۳۸ء میں جب مرحوم شیخ محمد عبداللہ پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک سے متاثر ہو کر ریاست میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے کوششیں کرنے لگے اور ایک قومی سطح کی تنظیم کے لئے میدان ہموار کرنے لگے تو مسٹر کلم نے اپنے ترقی پسند طرز فکر رکھنے والے متعدد ساتھیوں کے ہمراہ ان کی طرف دست تعاون بڑھایا۔ ان کاوشوں کے مثبت نتائج نکلے۔ شیخ صاحب نے جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا۔ مسٹر کلم اس نئی تنظیم کے سرگرم رکن تھے اور اس میں مختلف کلیدی عہدوں پر فائز رہے۔

وہ قومی مطالبے (آزادی کی دستاویز) کے معمار تھے جسے مہاراجہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان گذارشات میں جہاں ظلم و جبر کے مارے ہوئے ریاستی عوام کی ذات کا بے باک اظہار تھا وہاں پہلی بار ایک ایسی حکومت کے قیام کی درخواست کی گئی جو لوگوں کے سامنے اپنے اعمال و افکار کے لئے جواب دہ ہو۔ لیکن تب ہی شیخ صاحب قید کر لئے گئے۔ کلم صاحب کو بھی ان کی تقلید میں میرپور جیل میں پابند سلاسل رکھا گیا جہاں وہ چھ ماہ تک دار و رسن کے مصائب کا مقابلہ کرتے رہے۔

مہاراجہ کے دور اقتدار کے دوران ہی شیخ محمد عبداللہ نے مطلق العنانیت کے خلاف ایک ہمہ گیر تحریک کا آغاز کیا جسے بعد میں "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کے نام سے موسوم کیا گیا۔ شیخ صاحب کو حراست میں لیا گیا اور انہیں بادامی باغ کنٹونمنٹ میں مصائب و ابتلا کے ایک طویل اور صبر آزما دور سے گذرنا پڑا۔ آزمائش کی اس کٹھن گھڑی میں پنڈت نہرو کی ہدایت پر کلم کو ان کا سینئر ڈیفنس کونسل نامزد کیا گیا۔ یہ وہی مقدمہ تھا جس میں خود پنڈت نہرو اور مسٹر آصف علی بھی ڈیفنس کونسل کے طور پر پیش ہوئے۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا جس سے نہ صرف مسٹر کلم کی قانونی فہم و فراست کا اعتراف ہوتا ہے بلکہ سیکولر رجحان اور فرد کی آزادی کے تئیں ان کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جھکاؤ کی بھی غمازی ہوتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب قبائلیوں نے کشمیر پر حملہ کیا اور وادیٔ کشمیر تاریکی اور افسردگی کی دبیز دھند میں لپیٹ گئی تو مسٹر کلم شیخ صاحب کے شانہ بشانہ دن رات کام کر کے لوگوں کے حوصلے بلند کرتے رہے۔ انہوں نے شیخ صاحب کے ہمراہ کئی بار دہلی کا دورہ کیا اور بالآخر حکومت ہند نے کشمیریوں کی درخواست پر لبیک کہا اور حملہ آوروں سے انہیں محفوظ رکھنے کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑی۔

جب شیخ صاحب "ایمرجینسی ایڈمنسٹریشن" کے قائد مقرر ہوئے تو جسٹس کلم کو اُن کا چیف ایمرجینسی آفیسر تعینات کیا گیا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۸ء میں کابینہ تشکیل دینے کے ایام تک کلم صاحب خوراک و سپلائیز سے متعلق اہم شعبوں کے بھی انچارج رہے۔

یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ کلم صاحب ایک ہمہ پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ سیاسیات اور اپنے پیشے کی دلچسپیوں کے علاوہ ان میں ایک پیدائشی قلم کار کی خداداد صلاحیت موجود تھی۔ اُن ایام میں جبکہ کشمیر میں بس چند ایک اخبارات نکلا کرتے تھے، وہ اپنی صحافتی نگارشات سے دادِ تحسین حاصل کیا کرتے تھے۔ وہ خود ایک ہفتہ وار اخبار "قومی درد" کی ادارت کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے مضامین "مارتنڈ" اور "ملاپ" میں باقاعدگی سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اپنی رحلت سے قبل اُن کے بعض مضامین روزنامہ "مارتنڈ" میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کا تعلق لداخ کے متعلق چین کے اُبھارے ہوئے تنازعات سے تھا۔ تاریخ کشمیر کے عمیق مطالعہ کے پیش نظر انہوں نے کئی تاریخی ثبوت پیش کئے جن سے آپ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہوئی کہ تاریخ کے کسی بھی دور میں لداخ یا اس کے کسی حصے پر چین کا استحقاق نہیں رہا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابھی چند برس قبل ایک ممتاز قومی روزنامے "سٹیٹسمین" نے کلم صاحب کے ان مضامین کا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ذکر کیا اور اپنے کالموں میں کلم صاحب کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا ۔

کلم صاحب "ہسٹری آف کشمیری پنڈتز" نام کی ایک کتاب کے مصنف بھی رہے ہیں ۔ یہ کتاب ارض کشمیر کے قدیم ثقافتی ورثے کا ایک سیر حاصل جائزہ پیش کرتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی کتاب کشمیر کی تاریخ کے مختلف ادوار میں کشمیری پنڈتوں کے ارتقاء کا ایک باقاعدہ احوال بیان کرتی ہے ۔

گاندھی میموریل کالج سرینگر کی مینیجنگ کمیٹی کے انچارج سیکریٹری مسٹر ایس ، این ور نے پبلشرز نوٹ میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ مذکورہ کمیٹی نے اس قسم کی مطبوعات کی اشاعت کا کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا تھا ۔ چنانچہ کمیٹی کے متعلقین نے جسٹس کلم سے درخواست کی تھی کہ وہ اس کتاب کی اشاعت کے حقوق انہیں مرحمت کریں ۔ کلم صاحب نے نہایت فراخدلی سے کتاب کے حقوق مینیجنگ کمیٹی کے نام محفوظ کئے اور اس ضمن میں کسی بھی مالی فائدے کی مصلحت کو یکسر نظر انداز کر دیا ۔ یہ مثال اس ادارے کے تئیں انکی گہری وابستگی کی غماز ہے ۔ وہ خود کئی برسوں تک اس ادارے کے چیئرمین رہے ۔

جسٹس کلم اپنے لڑکپن سے ہی موسیقی کا شستہ ذوق رکھتے تھے ۔ وہ ملک کے اطراف سے کلاسیکی موسیقی کے ممتاز استادوں کو یہاں آنے کی دعوت دیا کرتے تھے ۔ وہ کشمیر کی روایتی صوفیانہ موسیقی سے بھی بے پناہ شغف رکھتے تھے ۔ وہ خود ستار ، دل رہا اور ہارمونیم بجانے میں کافی مشاق تھے ۔ انہیں مختلف راگوں کی بھی کماحقہ آگہی حاصل تھی ۔

کلم صاحب ایک اچھے پارلیمنٹیرین بھی تھے ۔ وہ پہلے پنڈت تھے جنہیں "پرجا سبھا" (قانون ساز اسمبلی) کے لئے منتخب کیا گیا ۔ اس کے علاوہ وہ سپیشل کمشنر کے عہدے پر بھی تعینات رہے ۔ اُن کی خطابت کی صلاحیت کے سبھی معترف

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تھے ۔ یہ ان کی خطابت کا ہی اعجاز تھا کہ اس وقت کی پرجا سبھا کے صدر مسٹر مہتہ کو اعتراف کرنا پڑا کہ "اسمبلی میں کلم صاحب کی موجودگی کے باعث ایسا سماں بندھ جاتا ہے جیسے ہم لوگ پارلیمنٹ میں ہوں"۔

۱۹۴۳ء میں انہیں جموں و کشمیر ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ریاست کی بار ایسوسی ایشن کے ایک ممبر کو عدلیہ کے اس اعلیٰ عہدے کے لئے چنا گیا۔ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اس تقرری کے بعد انہوں نے ایام رفتہ کی اپنی وابستگیوں کو بھلا ڈالا۔ اب وہ صرف ایک جج تھے اور اسی جذبے کے تحت بلا خوف و خطر انصاف کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ اُن کے ضمیر کی آواز اور انکی قانونی فہم و فراست اُن کی واحد راہبر تھی۔ اُنکی اسی منفرد سوچ نے انہیں بہت کم وقت میں ایک آزاد اور بے باک جج کے طور پر شہرت دلائی۔ یہاں پر مجھے ۱۹۵۳ء کا وہ واقعہ یاد آ رہا ہے جب شیخ صاحب کو وزیر اعظم کے عہدے سے سبکدوش کر کے اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ حراست میں لیا گیا۔ حراست کے احکامات کیخلاف ہائیکورٹ میں چند ایک اہم اپیلیں دائر کی گئیں جن کی شنوائی فل بنچ نے کی۔ چونکہ اس سلسلے میں جو آئینی اور قانونی نکات اُبھارے گئے تھے، ان کے دُور رس نتائج نکلنے والے تھے اور اُن سے نئی حکومت کے استحکام کو سنگین خطرہ درپیش ہو سکتا تھا۔ سورگیہ شری ایس کے دفتری، جو اٹارنی جنرل آف انڈیا تھے، نے اس کیس میں سرکار کی نمایندگی کی جبکہ مسٹر ٹی آر بھسین درخواست دہندگان کی وکالت کر رہے تھے۔ یہ جسٹس کلم ہی تھے جنہوں نے چیف جسٹس سے اختلاف رائے کرتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا جس کی ایک اور جج نے توثیق کی تھی۔ یہ جرأت رندانہ اس بات کی عکاس ہے کہ وہ صداقت کے لئے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتے تھے اور اس سلسلے میں وہ سرکار کے مُوقف اور اس کی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مصلحتوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے تھے۔ انکی ذہانت اور قوتِ فیصلہ ہر مرحلے پر توانا رہتی تھی اور اس کے طفیل وہ مختلف معاملات کو احسن طریقے پر حل کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں جب جسٹس کانیانے، جو حصولِ آزادی کے بعد ملک کے پہلے چیف جسٹس رہے تھے، ہائیکورٹ کا معائنہ کیا تو انہیں ایک اہم کیس کے سلسلے میں ریاستی چیف جسٹس وزیر اور جسٹس کلم پر مشتمل ڈویژن بنچ کے سامنے بحث سننے کا اتفاق ہوا۔ جسٹس کانیا کلم صاحب کی بیدار مغزی اور قانونی فراست سے بے حد متاثر ہوئے۔ مسٹر کلم نے ایک کیس کا موقعے پر فیصلہ سنایا اور اس سلسلے میں کسی تحریری حوالے سے انہیں کوئی اعانت حاصل نہیں کرنا پڑی۔ اُن کے بعض فیصلے قانونی پیشے کے لئے ایک نئی جہت اور ایک نئی صبح کی نوید لے کر آئے اور آج بھی متعدد قانونی رپورٹوں میں ان کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ اُن کے قلب و نظر کی بالیدگی کی ان گنت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن مجموعی طور پر اس بات میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ اُن کی ہمہ جہت شخصیت میں ایک سیاستدان، ایک پارلیمنٹیرین، ایک ماہرِ قانون، ایک مورخ اور ایک عالم کے علاوہ موسیقی اور فن کا مداح بھی پنہاں تھا۔ ایک وکیل کی حیثیت سے وہ کیس جیتنے کیلئے زبردست کوشاں رہتے تھے۔ ایک جج کی حیثیت سے وہ انصاف کے تقاضوں کو ہر چیز پر مقدم تصور کرتے تھے۔ ایک مورخ کے روپ میں وہ حقائق کو جھٹلانے کے قائل نہیں تھے۔ ایک سیاست کار کے طور پر وہ اپنے ارضِ وطن مادرِ کشمیر اور اس کے لوگوں سے قلبی وابستگی رکھتے تھے اور ایک راہنما کے منصب پر وہ لوگوں کو صحیح راستے کی طرف لے جانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ کسی بھی شخص کو اپنی عزتِ نفس مجروح کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس سلسلے میں کوئی چھوٹی سی بات بھی انہیں مغلوب الغضب کرنے کے لئے کافی تھی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ریٹائرمنٹ کے بعد جسٹس کلم کو حکومت نے تنخواہ کمیشن کا چیرمین مقرر کیا اور تقریباً ایک سال تک اس اہم عہدے پر فائز رہے ۱۹۶۰ء میں ارض کشمیر کے اس مایہ ناز فرزند کا اچانک انتقال ہوا۔ اس وقت انکی عمر ۶۲ سال تھی۔ انکی موت نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کشمیر کے آسمان پر چمکنے والے ایک تابندہ ستارے تھے۔ چنانچہ ان کی رحلت کی خبر سنتے ہی وادی کے اطراف و اکناف میں غم و الم کے سیاہ بادل چھا گئے۔ وادی کے تمام دفاتر اور عدالتیں ایک دن کے لئے بند رہیں۔ اس وقت کی سبھی بڑی بڑی شخصیات نے انہیں شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا اور آزادی کی جدوجہد کے طویل ماہ و سال کے دوران آپ کی بیش بہا اعانت و اشتراک کا اعتراف کیا گیا۔ اس وقت قانون ساز کونسل کے چیرمین مسٹر فوطیدار تھے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ جسٹس کلم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ بلاشبہ کلم صاحب اپنی ساری زندگی پچھڑے ہوئے اور پسماندہ لوگوں کو استحصال سے نجات دلانے کے لئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹے رہے۔

اپنے جاگیردارانہ ماحول کے باوجود وہ کاشتکار کو زمین منتقل کرنے کی ترقی پسند پالیسی کے زبردست حامی تھے۔ وہ اپنے نظریات کی بنا پر ایک پختہ سوشلسٹ تھے۔ سیکولر روایات میں اُن کا راسخ عقیدہ ناقابل تردید تھا۔ آزادی کے بعد ملک جن انقلاب آفرین مراحل سے گذرا اُن کے پیش نظر انہوں نے اپنے فرقے کے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ نئی تبدیلیوں کی ناگزیریت سے آگاہ ہو جائیں اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کیلئے تیار ہو جائیں۔ انہیں خود کو ایک ایسے نظریئے سے لیس کرنا ہوگا جس میں تنگ نظری اور طبقاتی سوچ کا شائبہ تک نہ ہو۔ انہیں پورے خلوص اور دیانت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

واری سے فرقہ واریت، علاقہ پرستی اور گروہ بندی کی انتشار پسند قوتوں کیخلاف برسرپیکار ہونا چاہیئے۔

اُن کی عقل و خرد کی نئی وسعتیں، انکی قانونی بصیرت، ان کی سیاسی فہم و فراست اور آزادی کی جدوجہد کے دوران اُن کی بیش بہا قربانیاں انہیں تاریخ کے صفحات میں مادر کشمیر کے عظیم فرزند کے طور پر امر کر دیں گی۔

٥ — انگریزی سے ترجمہ

مترجم: جان محمد آزاد)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

برج پریمی

حبیب کیفوی

سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل جموں وکشمیر کے جن ادیبوں نے اردو شعر و نثر کے وسیلے سے اُردو کی خدمت گذاری میں تن من سے حصّہ لیا' ان میں جموں خطّے کے دیا کرشن گردش' قیس شیرانی' غلام حیدر چشتی' نرسنگھ داس نرگس' قدرت اللہ شہاب اور کیف اسرائیلی کے ساتھ حبیب کیفوی کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اُردو زبان کا یہ بزرگ خدمت گذار آج تک برابر اپنے سدا بہار قلم سے موتی رول رہا ہے۔ حبیب کیفوی کے معاصرین میں محمد امین شمیم' کیف اسرائیلی' حسن محمد منہاس' عماد الدین سوز' قمر قمرازی' غلام جیلانی اثر' قیس شیرانی وغیرہ تھے۔ انہوں نے منشی سراج الدین اور چودھری خوشی محمد ناظر کی صحبتوں میں شرکت کی ہے اور ان سے بہرہ یاب ہوئے۔ ایسی شخصیات غنیمت ہیں۔

حبیب کیفوی کا پورا نام حبیب اللہ ہے لیکن ان کی پہچان کیفوی سے ہوتی رہی ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ کیفوی کی نسبت بابائے اُردو برج موہن دتاتریہ کیفی کی قربت اور تلمذ کا ہی فیضان ہے۔ اس طرح کے عقیدت و احترام کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ جہاں شاگرد استاد کے فیض سے اس قدر متاثر ہو کر اس کا نام اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس کا تعلق اپنی زندگی کا جزو بنا لیے۔ آج کسی زمانہ میں جموں کے محلہ پیر میٹھا میں رہنے والے حبیب اللہ کا نام بھی کوئی نہیں جانتا لیکن اردو ادب کے وہ قاری جنہیں "کشمیریات" سے دلچسپی ہے حبیب کیفوی کے نام سے نا آشنا نہیں۔

حبیب کیفوی سنہ ۱۹۱۰ء میں خطۂ جموں میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹریکولیشن کامیاب کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لیا تھا کہ گھر کے نامساعد حالات کے پیش نظر تعلیم کے سلسلہ کو منقطع کرنا پڑا۔ انہیں پیٹ پالنے کے لئے کئی پاپڑ بیلنا پڑے کچھ عرصہ ریاستی محکمہ امداد باہمی میں سب انسپکٹر رہے۔ پھر کشمیر ٹینٹ فیکٹری کے نام سے خیمہ سازی کا ایک کارخانہ کھولا۔ یہاں بھی جی نہ لگا تو اپنے نام پر حابسن (HABSON) نام کا تجارتی ادارہ قائم کیا جو سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں کے لئے فرنیچر اور دوسرا سامان فراہم کرتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران وہ سرینگر میں تھے۔ ملک کی تقسیم ہوتے ہی راولپنڈی پہنچے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ابھی اللہ کے فضل سے حیات ہیں۔

علامہ کیفی سنہ ۱۹۳۴ء میں ریاست جموں و کشمیر میں بطور اسسٹنٹ فارن سیکریٹری ملازم ہوئے۔ ریاست میں ان کی آمد انتہائی خوش آئند تھی۔ ان کے آنے سے شعر و سخن کی محفلوں میں رونق آگئی۔ اس زمانے میں اردو ادب کی کئی قد آور شخصیات ریاست میں مقیم تھیں۔ علامہ کیفی کے آتے ہی شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔

ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اردو کا فروغ تھا۔ انہوں نے تلامذہ کا ایک بڑا حلقہ اکٹھا کر رکھا تھا جن کے کلام کی نہ صرف اصلاح دیا کرتے تھے بلکہ ان کے ذوق سلیم کی تہذیب بھی کرتے تھے۔ اس حلقے میں ریاست سے تعلق رکھنے والے جو سخن ور تھے ان میں خاص طور پر نندلال طالب، دینا ناتھ مست، ڈاکٹر عماد الدین سوز، نسیم رضوی، حبیب کیفوی اہم ہیں۔ علامہ کی محفلوں میں اثر صہبائی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اور ناٹک ساگر کے شہرت یافتہ محمد عمر (محمد عمر نور الٰہی والے) حاضر ہوتے اور اکتساب فیض کرتے۔ ایسی ہی دلنواز محفلوں کے شب و روز میں حبیب اللہ حبیب کیفوی بن گئے۔ اور اپنا اظہار شعر کے میڈیم سے کرنے لگے جنہیں علامہ کیفی سنوارا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں حبیب اللہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ کبھی کبھی شعر کہا کرتے تھے۔ اپنے دوست نسیم رضوی کے ہمراہ جب وہ پہلی مرتبہ پنڈت کیفی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو تعارف کے بعد انہیں اپنا کلام پیش کرنے کو کہا گیا۔ پنڈت جی نے اصلاح کے بعد اپنی طرف سے ایک شعر کا اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحفہ قبول کر لو ؎

کام کالج کا کرو خوب لکھو اور پڑھو
شعر کہنے میں غزل گوئی میں کیا رکھا ہے

لیکن اس کے باوصف حبیب اللہ شعر کہتے رہے اور پنڈت کیفی کی بارگاہ میں حاضر ہوتے رہے اور باقاعدہ طور پر شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ برسوں ہندوستان اور پاکستان کے پرچوں میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "آتش چنار" ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ قیام جموں کے دوران صاحبزادہ محمد عمر نے حبیب کیفوی کو نثر کی طرف مائل کیا اور وہ شگفتہ نثر میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ حبیب کیفوی نے ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بھی شہرت پائی۔ چنانچہ پاکستان کے متعدد ریڈیو اسٹیشنوں سے ان کے ڈرامے اور فیچر براڈکاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔ "قرض" اور "کوٹ" "تحفے" "بلی کے بچے" "باغیچہ" "کولمبس" "اشرف" "کیمپ خاص" ان کے اہم ڈرامے اور فیچر ہیں۔ وہ بچوں کے ادب اور شاعری کی حیثیت سے بھی کافی معروف رہے۔ حبیب کیفوی برس ہا برس پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری رہے اور پاکستان کے ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حبیب کیفوی کو شعر و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کا بنیادی موضوع کشمیر ہے شعر ہو یا نثر ان کے یہاں کشمیر کی مٹی کی خوشبو ملتی ہے۔ ان کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے سینے میں کشمیر کا جو عرفان اور کشمیر کا جو درد جھلکتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فاصلے پر رہ کر ارض وطن کی یادیں ان کے دل کو کس طرح تڑپاتی ہیں۔ یہ یادیں شعر و نغمے میں ڈھل کر ان کے جذبے کی لطافت کا احساس دلاتی ہیں۔ میں ان کی ایک نظم کے صرف چند بند پیش کروں گا:

به کنارِ آبِ جہلم[1]

جہاں کی وسعتیں مایوس کر چکی تھیں مجھے
ترے کنارے پہ حاصل ہوا سکوں مجھ کو
تو جس زمین سے گزر کر یہاں تک آیا ہے
اسی زمیں پہ پہنچنے کا ہے جنوں مجھ کو

○

سنا فسانۂ دلچسپ و دل نواز کوئی
دلِ فسردہ کو جس سے قرار آ جائے
بیانِ چشمۂ شاہی ہو ذکرِ شالامار
نظر کے سامنے رنگِ بہار آ جائے

○

سری نگر کی بہاروں کی داستاں ہی سنا
مجھے خبر ہے جہاں سے گزر کے آیا ہے
میرے رفیق و شفیق و عزیز کیسے ہیں؟

---

[1] بحوالہ ہفتہ وار "آوازِ حق" راولپنڈی۔ ۱۴ جولائی ۱۹۵۳ء۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کسی کا کوئی پیام و سلام لایا ہے؟

○

چمن کے گوشہ میں چلتا ہے اب بھی دورِ شراب؟
وہ فرشِ سبزہ پہ جمتی ہیں محفلیں اب بھی؟
قدم قدم پہ پری چہرہ لوگ ملتے ہیں؟
نشاط باغ میں ہوتی ہیں رونقیں اب بھی؟

○

پھبن وہی ہے شکاروں کی سطحِ دریا پر؟
اسی طرح سے ہے جوبن پہ آبِ ڈل کہ نہیں؟
نظر کو دعوتِ نظارہ اب بھی دیتے ہیں؟
وہ سطحِ آب پہ پھیلے ہوئے کنول کہ نہیں؟

○

گُلوں کے قافلے آتے ہیں اب بھی وادی میں
نسیم باغ کے اونچے چنار کیسے ہیں؟
مرے چمن کی بہاروں کا رنگ کیسا ہے؟
ہوائیں کیسی ہیں، بلبل و ہزار کیسے ہیں؟

○

سنائے جا مجھے یہ ذکرِ دل پذیر ابھی
رگوں میں خون کی گردش کو تیز تر کر لوں
سری نگر کی نمائش کا ذکر چھیڑ کہ میں
نقوشِ کہنہ میں رنگِ حیاتِ نو بھر لوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ان اشعار میں ایک ہجر زدہ عاشق وطن کا دل دھڑکتا ہوا ملتا ہے جو وطن سے دور ہے لیکن جیسے وطن کی ایک ایک ادا، وطن کی ایک ایک شبیہہ تڑپاتی ہے۔ لگتا ہے اس کے ہر خیال میں، اس کے ہر تنفس میں اس سرزمین کی دھیمی دھیمی آنچ سلگ رہی ہے۔

قطع نظر وطنیت کے موضوع کے، حبیب کیفوی غزل گوئی سے بھی طبعی مناسبت رکھتے ہیں اس لیے نظمیہ شاعری کے ساتھ ساتھ برابر غزل بھی کہتے آرہے ہیں۔ انکی تازہ غزلوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

○

دل میں کچھ ایسے رنگ سے وہ جلوہ گر رہے
سرشار حسن کے کیف سے شام و سحر رہے

تم کو کبھی بتائیں گے اصلِ غمِ حیات
اس کشمکش کے دور میں جیتے اگر رہے

پھر بھی سراغِ منزلِ ہستی نہ پا سکے
گو مدتوں تلاش میں گرمِ سفر رہے

راہِ طلب میں شوق ہی تنہا رفیق تھا
ہوش و خرد تو چند قدم ہم سفر رہے

یوں ہی تو بزمِ دوست فروزاں نہیں رہی
روشن کسی کے داغِ جگر تا سحر رہے

○

فرصت کہاں کہ وعدہ فردا کا آزمائیں
جیتا رہے گا کون ترے انتظار تک

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آشفتگی کا رنگ چھپائے نہ چھپ سکا
روکے رہے اگرچہ زباں اختیار تک

ہم احترام عشق میں سب کچھ اٹھا چکے
رونا ہے یہ کہ تم کو نہیں اعتبار تک

طے کر لیا ہے عشق نے ہر ایک مرحلہ
با صد وقار گوشۂ زنداں سے دار تک

○

دونوں عالم میں کوئی اُس کا ٹھکانا ہی نہیں
آہ وہ جس سے مقدر میں نہ دنیا ہو نہ دین

سختیٔ دہر سے کچھ اور بھی تابندہ ہوا
تیری عظمت کا تصور، تیری ہستی کا یقین

دل کی دنیا نہ لرز جائے کہ پھر سامنے ہے
لالہ رخسار کوئی، برق نظر، شعلہ جبیں

عالم حسن ہی کچھ ایسا ہے کہ سب ہیں مفتوں
صید اُس زلف گرہ گیر کے اک ہم ہی نہیں

اُن سے الجھو تو نہ بے فائدہ اے اہل جہاں
حشر برپا ہی نہ کر دیں یہ کہیں خاک نشین

○

حبیب کیفوی آج بھی اپنی اس بزرگی کے عالم میں اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ علامہ کیفیؔ جیسے بزرگ اور اردو کے محسن کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔ اُن کے دامن تلمذ کے ساتھ وہ "تقریباً" بارہ برس وابستہ رہے اور اپنے کلام

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کی اصلاح لیتے رہے ۔ ان کا ذوقِ سلیم علامہ کے فیضِ نظر کا ہی نتیجہ ہے ۔ حبیب کیفوی نے راقم السطور کو ایک خط میں لکھا تھا کہ علامہ کیفی کے اصلاح دینے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے شاگردوں سے شعر سنتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ اصلاح کرتے جاتے تھے ۔ وہ شعر میں صرف ایک آدھ لفظ تبدیل کرتے جس سے پورے شعر کی ہیئت ہی بدل جاتی ۔

حبیب کیفوی کا سب سے اہم کارنامہ ان کی گراں قدر تصنیف "کشمیر میں اردو" ہے جو پہلی بار ۱۹۷۹ء میں مرکزی اردو بورڈ لاہور پاکستان کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ۔ اس کتاب کا پیش لفظ اردو کے معتبر نقاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کشمیر میں اردو کی کہانی بڑی عرق ریزی سے تحریر کی گئی ہے ۔ حبیب کیفوی نے اردو شعر و ادب کی ان مختلف منزلوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے کشمیر میں اردو زبان گزری ہے ۔ اس تحقیقی کارنامے کی ترتیب اور تکمیل کے لئے حبیب کیفوی کو کشمیر سے دور رہ کر مناسب مواد کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑے ہوں گے ، اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوتا ہے ۔

حبیب کیفوی کی کتاب ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس میں پس منظر کے طور پر کشمیری ادب کی مختلف منزلوں کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد کشمیر کے

؎ راقم السطور کو ایسے ہی ایک تحقیقی پروجیکٹ کی تکمیل کے دوران برصغیر کے ایک اولوالعزم محقق اور ناقد پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کے ساتھ جگہ جگہ گھومنے کی سعادت حاصل رہی ہے ۔ جب وہ اسی عنوان کی کتاب (کشمیر میں اردو) کی تالیف کر رہے تھے جو ابھی چند سال قبل جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے بڑے اہتمام سے تین ضخیم جلدوں میں شائع کی ہے ۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

فارسی شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخر میں جموں وکشمیر میں اردو کی ترویج اور ترقی کی شروعات کا تفصیلی جائزہ لے کر کشمیر میں اردو شعر وادب کی کارگزاریوں، ریاست جموں وکشمیر کے شاعروں اور نثر نگاروں کے نام اور کام کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ان مختلف انجمنوں اور اداروں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کے قیام نے کشمیر میں اردو شعر وادب کی ترقی کے دریچے کھول دئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تاریخ بہت مختصر ہے اور اس میں وہ تفصیل نہیں ملتی جو پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی کتاب میں ملتی ہے۔ اس میں وہ ترتیب اور تسلسل بھی نظر نہیں آتا جو سروری صاحب کے کارنامے کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن اس کی افادیت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ پروفیسر سروری کی کتاب میں خطۂ کشمیر کے کارناموں اور یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا حصہ بھاری ہے جبکہ حبیب کیفوی کی کتاب جموں خطے کا زیادہ احاطہ کرتی ہے۔ بہر حال یہ کتاب بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ ایک ارمغان کا درجہ رکھتی ہے۔ یہاں اس کتاب کے مصائب اور محاسن پر بحث کرنے کا محل نہیں لیکن یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ "کشمیر میں اردو" کی کہانی سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

حبیب کیفوی نے "اقبالیات" پر بھی کلم کیا ہے۔ ان کے کئی قابل قدر مضامین اقبال اکادمی پاکستان کے مجلے "اقبال ریویو" میں ملتے ہیں۔ علامہ اقبال کے سلسلے میں کشمیر کے تعلق سے ان کا ایک مضمون "کشمیر کی ایک اقبال شناس شخصیت" اقبال ریویو برائے جولائی۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء (اقبال نمبر) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں وہ منشی سراج الدین احمد کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتے ہیں جس سے منشی صاحب کی سخن سنجی اور اقبال شناسی کے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نئے پہلو اہل نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے تعلق سے منشی صاحب کے بارے میں حبیب کیفوی کے یہ بیانات اہم ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

• "کشمیر میں اقبال شناسی میں کشمیر ریذیڈنسی کے میر منشی سراج الدین احمد کو جو مقام حاصل تھا اس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا کشمیر ریذیڈنسی کے دفاتر سردیوں میں سری نگر سے سیالکوٹ آجاتے تھے سیالکوٹ کے قیام کی وجہ سے علامہ اقبال سے ان کے گہرے مراسم تھے اور یہ رشتہ محبت و عقیدت علامہ کے آخری ایام تک قائم رہا"۔ (ص ۱۸۲)

• "علامہ اقبال منشی صاحب کے ذوق ادب اور سخن فہمی کے بڑے معترف تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً انہیں اپنا تازہ کلام اپنے ہاتھ سے نقل کر کے بھیجتے رہتے تھے۔ اور ایک سخن شناس کی داد کا لطف اٹھاتے تھے۔ "پرندے کی فریاد" اور کئی دوسری نظمیں اور غزلیں مرحوم کے ورثاء کے پاس بطور تبرک محفوظ تھیں جن کا ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد کچھ پتا نہ چلا"۔ (ص ۱۸۹)

• "انجمن فرحت القلوب کشمیر کی ایک ثقافتی اور ادبی جماعت تھی جس میں ریذیڈنسی اور حکومت کے اعلیٰ مسلمان افسر شامل تھے۔ ہر اتوار کو باغوں اور ڈل کی باجماعت سیر کرتے۔ اس سیر و تفریح میں موسیقی کا حصہ بھی ہوتا اور شعر و سخن کا رنگ بھی جمتا۔ برصغیر کی بڑی بڑی شخصیتیں کشمیر جاتیں تو فرحت القلوب کی نشستوں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں ضرور شامل ہوتیں ۔ ان شخصیتوں میں شیخ عبدالقادر، جسٹس ہمالیوں اور علامہ اقبال شامل تھے ۔ علامہ اگرچہ ایک ہی بار کشمیر گئے تاہم انہوں نے مختصر قیام کشمیر کے دوران اس انجمن کے تفریحی مشاغل میں حصہ لیا جو نصف صدی تک کشمیر کے باغات میں مسرتوں کے پھول بکھیرتی رہی ۔" (ص ۱۹۱)

حبیب کیفوی دورِ حاضر میں کشمیر کے ایک بزرگ قلم کار ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنے قلم کی جولانیوں سے اردو شعر و نثر میں پھول کھلائے ہیں بلکہ کشمیر میں اردو کی دلپذیر داستان رقم کرکے ایک باصلاحیت ادبی مورخ کا منصب نبھانے کی باوقار کوشش کی ہے اور یہی کیا کم ہے ۔ ٥

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

رشید تاثیر

عبدالسلام رفیقی

کشمیر نے تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی مایہ ناز ہستیوں کو جنم دیا ہے، انہی اولوالعزم فرزندانِ کشمیر میں عبدالسلام رفیقی کا بھی شمار ہوتا ہے جنہوں نے اپنے قلم، ہمت اور حب الوطنی کے باعث بیسویں صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں برطانوی حکومت کی نیندیں حرام کیں۔ انہیں اپنے عزائم سے باز رکھنے کے لئے برطانوی سامراج نے ان کا بہت دور تک پیچھا کیا لیکن ان کے پائے استقلال اور ارادوں میں جنبش تک نہ آئی۔ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے کشمیر کے ان قابلِ فخر فرزندوں کو فراموش کر دیا ہے۔ لازم ہے کہ ایسی پُروقار اور قابلِ احترام شخصیات کے حالاتِ زندگی سے عوام خاص کر نئی نسل کو روشناس کیا جائے۔

کشمیر کی آزادی اور خود مختاری کو محدود کرنے میں اگرچہ مغل حکمرانوں نے کلیدی رول ادا کیا لیکن بھوک، بیکاری، بیماری، ظلم و ستم کا دور صحیح معنوں میں افغان حکمرانوں کے دورِ اقتدار سے شروع ہوا جسے ڈوگرہ جاگیردارانہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نظام نے انتہا کو پہونچایا اور جس کے باعث اس خطۂ ارض کے ہزاروں ذہین اور زیرک لوگوں نے بھوک اور لاچاری سے تنگ آکر پنجاب کے میدانی علاقوں کی جانب ہجرت کی۔

ایسے ہی ایک قافلے کے ساتھ فتح کدل سری نگر کا حبیب اللہ رفیقی کانگڑہ جا پہونچا اور وہیں بود و باش اختیار کی۔ مگر اس کے دو بیٹوں بدرالدین رفیقی اور محمد یحییٰ رفیقی نے کشمیر میں مقیم اپنے رشتہ داروں سے اپنا رابطہ برابر قائم رکھا۔ بدرالدین کی شادی کانگڑہ میں اُن کے رشتہ کی لڑکی سے ہوئی جس کے بطن سے ۱۸۶۰ء میں عبدالسلام رفیقی پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کانگڑہ میں ہی ہوئی۔ ۱۸۸۳ء میں عبدالسلام رفیقی کی شادی محمد یحییٰ رفیقی کی دختر سے ہوئی۔ ۱۸۸۹ء میں عبدالسلام رفیقی نے "ذات و شرافت" اور "تحفۂ آریہ" کے عنوان سے دو پمفلٹ شائع کر کے قلم کاروں کی دنیا میں قدم رکھا جن میں اسلامی فلسفۂ حیات کے پس منظر میں اخلاقیات کی تشریح کی گئی تھی۔ دونوں پمفلٹوں کو کانگڑہ کے گرد و نواح میں قدر کی نگاہ سے دیکھا اور پڑھا گیا۔ بزرگوں نے ان کے بارے میں پیشین گوئی کی کہ "آگے چل کر یہ لڑکا کارہائے نمایاں انجام دے گا"۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے حضرت بابا داؤد خاکی رح کی شہرۂ آفاق تصنیف "وردالمریدین" پر حواشی لکھے اور "حرزالجبین" کے نام سے شائع کرایا۔ ۱۸۹۰ء میں عبدالسلام رفیقی اپنی بیگم کے ساتھ کشمیر تشریف لائے اور جھیل ڈل میں ہاؤس بوٹ میں قیام کیا۔ وادی کے رؤسا اور دانش وروں سے رابطہ بڑھایا جن میں خواجہ ثناءاللہ شال، مفتی قوام الدین صاحب، مولانا رسول شاہ صاحب، خواجہ عبدالصمد ککرو اور کئی دوسرے اصحاب شامل تھے۔ ان کی اکثر و بیشتر ملاقاتوں میں کشمیریوں کی زبوں حالی اور غلامی موضوعِ سخن رہا کرتا تھا۔ اسی دوران انہوں نے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غنتکدل میں آبائی زمین پر مکان تعمیر کیا اور وہیں منتقل ہو گئے۔ مختلف الخیال لوگوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے اخذ شدہ نتائج کے بعد یہ خیال انھیں اکثر ستانے لگا کہ کشمیری مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے جہاں جدید سائنسی ٹیکنالوجی کی واقفیت اور تعلیم کی روشنی سے منور ہونے کی اشد ضرورت ہے وہاں کشمیریوں پر روا رکھے ظلم و ستم سے دنیا کو باخبر کرانا وقت کی اہم ضرورت اور تقاضا ہے۔

چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد انہوں نے ۱۸۹۶ء میں سرینگر سے الرفیق نام کا اخبار جاری کیا جس کی طباعت تحفۂ کشمیر پریس، شیخ باغ مہاراج گنج میں ہوئی۔ اخبار کے صرف دو شمارے شائع ہوئے جن میں کشمیری عوام کے حال و ماضی کا تجزیہ کر کے کشمیری قافلوں پر ہجرت کے دوران گزرے عبرت ناک واقعات کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ ریاستی جاگیردارانہ نظام کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری اور اسے گستاخانہ جرم قرار دے کر "الرفیق" پر پابندی عائد کرنے کے علاوہ عبدالسلام[ن] رفیقی کی جائیداد کی ضبطی اور ان کی جلاوطنی کے احکام جاری کر دیے گئے۔ مطبع تحفۂ کشمیر پر پابندی لگائی گئی اور پریس کے مالک پنڈت ہرکھ پرشاد سے جواب طلبی کی گئی جس کے نتیجہ میں چھاپہ خانہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔

سلام رفیقی خالی ہاتھ لاہور پہنچے جہاں برطانوی ہند کے جاسوسوں کی نگرانی میں آ گئے جنہوں نے ان کا لاہور میں قیام دشوار بنا دیا۔ ان سے آنکھ بچا کر دہلی چلے گئے۔ وہاں بھی جاسوس ان کا تعاقب کرتے رہے۔ بغرض کچھ عرصہ دہلی میں رہ کر واپس نور پورہ کانگڑہ لوٹے۔ چند ماہ بعد ڈلہوزی گئے

ن اس واقعہ سے قبل ہی وہ نوازی کے عوامی حلقوں میں سلام رفیقی کے نام سے متعارف ہو چکے تھے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

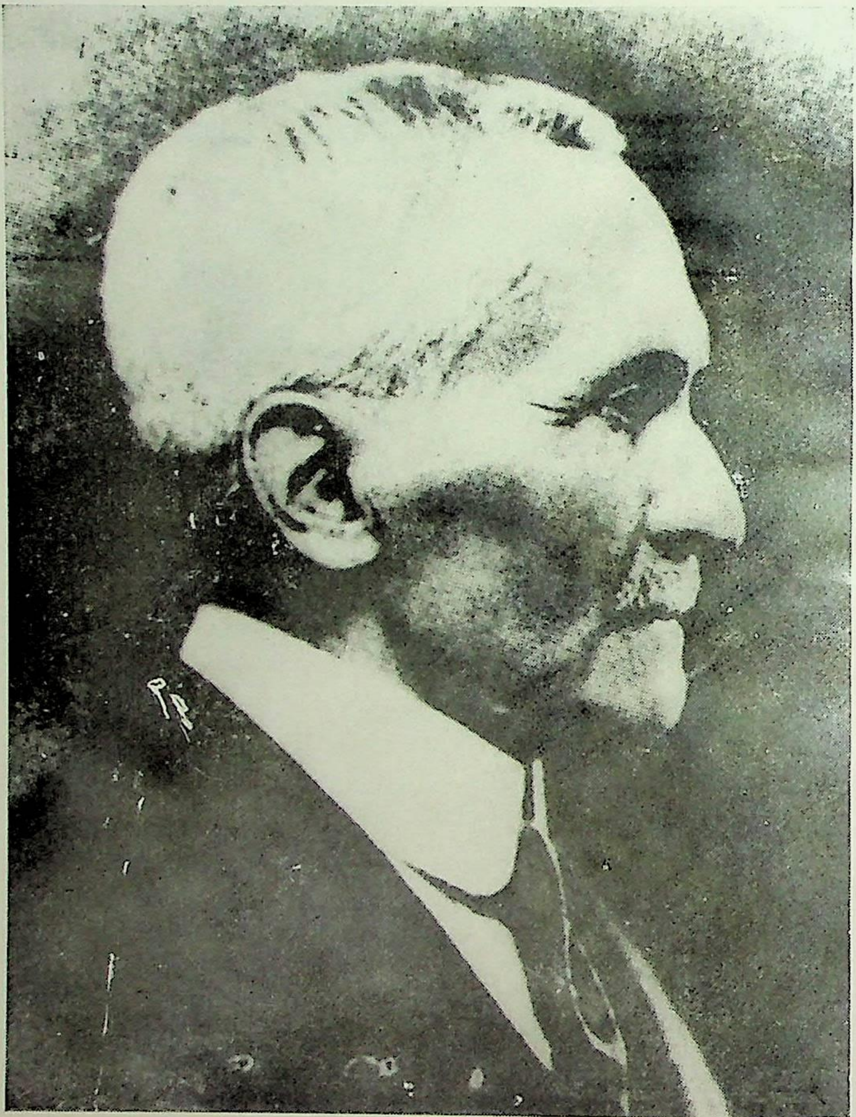

سر مارک ارل سٹائن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

فتحکدل میں آبائی زمین پر مکان تعمیر کیا اور وہیں منتقل ہو گئے۔ مختلف الخیال لوگوں سے ملنے اور ان سے تبادلۂ خیال کر کے اخذ شدہ نتائج کے بعد یہ خیال انھیں اکثر آنے لگا کہ کشمیری مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے جہاں جدید سائنسی ٹیکنالوجی کی واقفیت اور تعلیم کی روشنی سے منور ہونے کی اشد ضرورت ہے وہاں کشمیریوں پر روا رکھے ظلم و ستم سے دنیا کو باخبر کرانا وقت کی اہم ضرورت اور تقاضا ہے۔

چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد انہوں نے ۱۸۹۶ء میں سرینگر سے الرفیق نام کا اخبار جاری کیا جس کی طباعت تحفۂ کشمیر پریس شیخ باغ مہاراج گنج میں ہوئی۔ اخبار کے صرف دو شمارے شائع ہوئے جن میں کشمیری عوام کے حال و ماضی کا تجزیہ کر کے کشمیری قافلوں پر ہجرت کے دوران گذرے عبرت ناک واقعات کا تفصیلی تذکرہ تھا۔ ریاستی جاگیردارانہ نظام کو ان کی یہ حرکت ناگوار گذری اور اسے گستاخانہ جرم قرار دے کر "الرفیق" پر پابندی عائد کرنے کے علاوہ عبدالسلام رفیقی کی جائیداد کی ضبطی اور ان کی جلا وطنی کے احکام جاری کر دئے گئے۔ مطبع تحفۂ کشمیر پر پابندی لگائی گئی اور پریس کے مالک پنڈت ہرمکھ پرشاد سے جواب طلبی کی گئی جس کے نتیجہ میں چھاپ خانہ ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا۔

سلام رفیقی خالی ہاتھ لاہور پہونچے جہاں برطانوی ہند کے جاسوسوں کی نگرانی میں آ گئے جنہوں نے ان کا لاہور میں قیام دشوار بنا دیا۔ ان سے آنکھ بچا کر دہلی چلے گئے۔ وہاں بھی جاسوس ان کا تعاقب کرتے رہے بغرض کچھ عرصہ دہلی میں رہ کر واپس نور پورہ کا نگڑہ لوٹے۔ چند ماہ بعد ڈلہوزی گئے

ؔ اس واقعے سے قبل ہی وہ وادی کے عوامی حلقوں میں سلام رفیقی کے نام سے متعارف ہو چکے تھے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

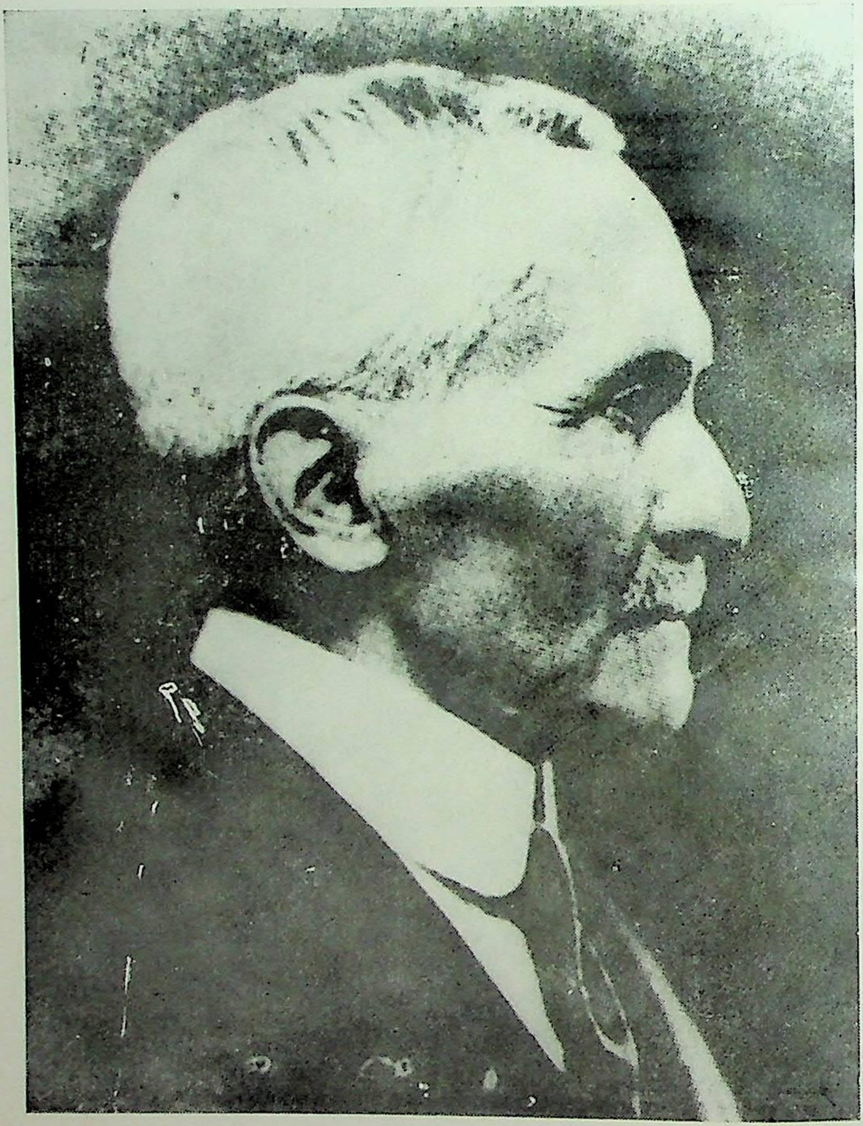

سرمارک ارل سٹائن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بخشی غلام محمد

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

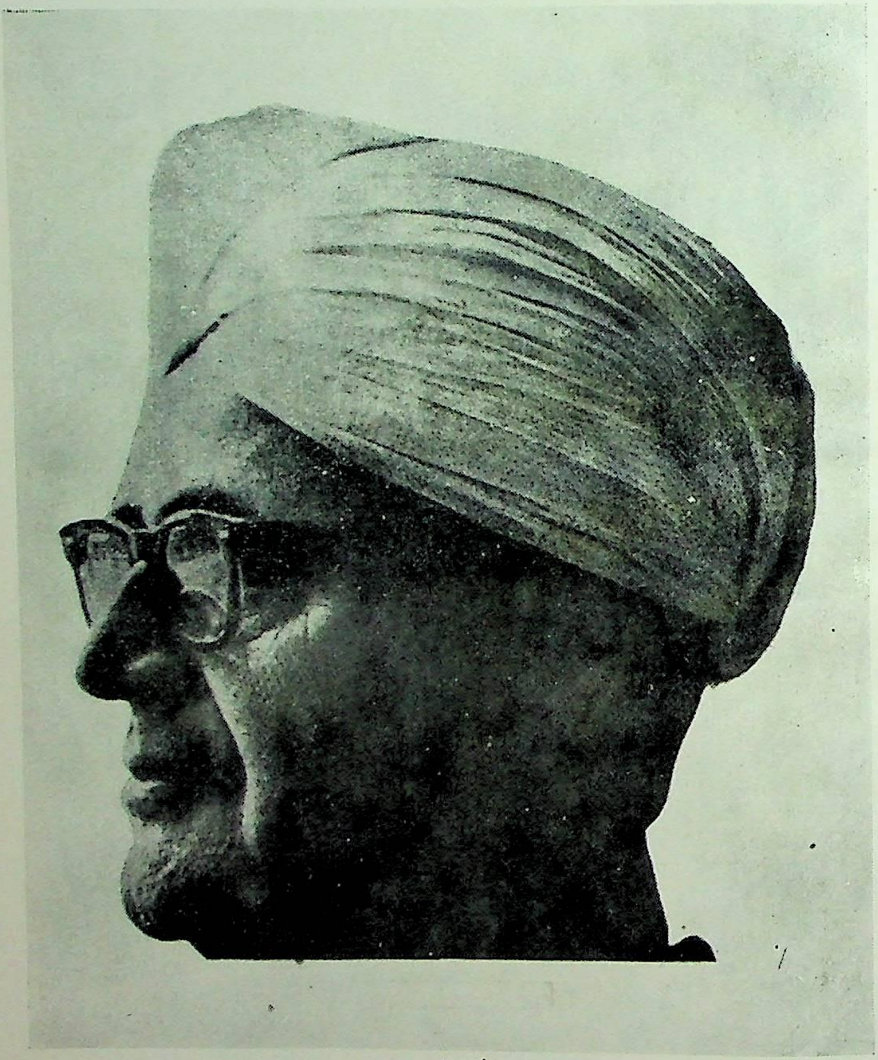

پنڈت گوپی کرشن

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سیّد میرک شاہ اندرابی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

عبدالسلام رفیقی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حبیب کیفوی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جسٹس جیالال کِلّم۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

محمد عبداللہ تبت بقال

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حشمت اللہ خاں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

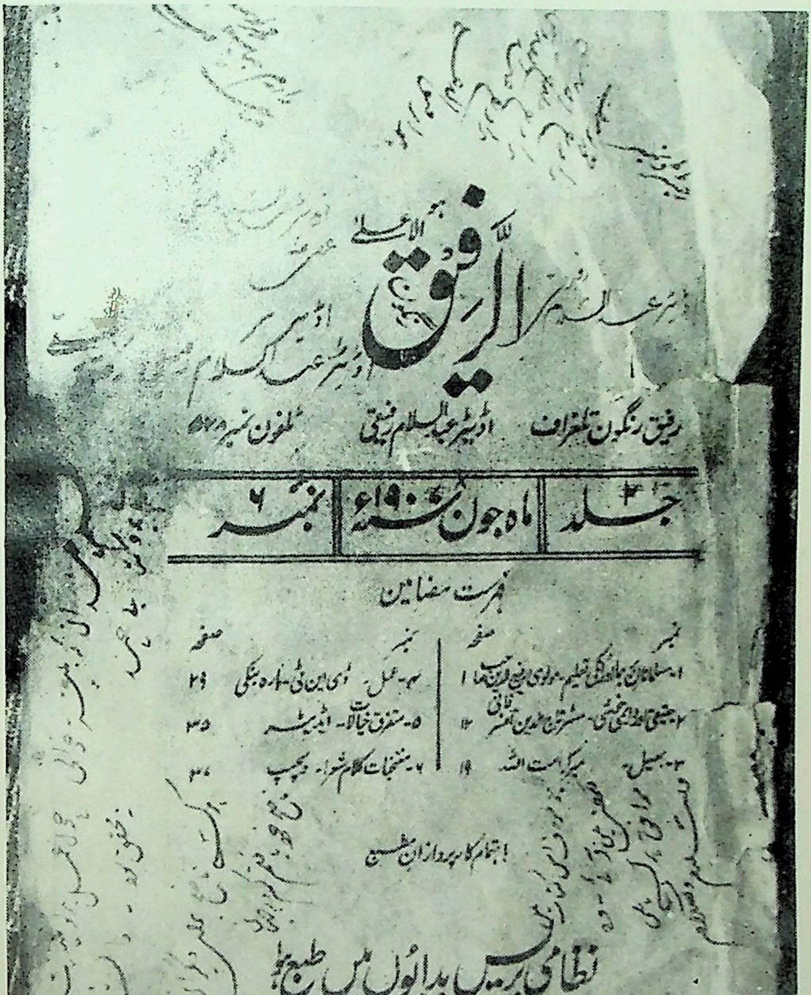

الرفیق

رفیق رنگون ٹلگراف	اڈیٹر عبدالسلام رفیقی	ٹلفون نمبر ۵۷۸

جلد ۲	ماہ جون سنہ ۱۹۰[illegible]ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

نمبر		صفحہ	نمبر		صفحہ
۱	مسلمانوں میں انگلش تعلیم۔ مولوی رفیع الدین عبدالمجید	۱	۴	عمل۔ ڈی این ٹی۔ ادارہ بنگلی	۲۹
۲	حقیقی اور نقلی خوشی۔ مسٹر [illegible]	۱۲	۵	متفرق خیالات۔ اڈیٹر	۳۵
۳	بسمل۔ میر کرامت اللہ	۱۹	۶	منتخبات کلام شعراء۔ دلچسپ	۳۶

باہتمام کارپردازان مطبع

نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا

از رنگون شایع گشت

ایک شمارے کا سرورق

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اور وہاں کی جامع مسجد میں امامت شروع کی۔ ڈلہوزی میں ہی ۱۸۷۹ء میں اپنے چچا محمد یحییٰ رفیقی، جو ان کے سسر بھی تھے، کی غیر مطبوعہ ضخیم تصنیف "مصباح الغنا" جو رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سوانح حیات ہے، کو زیور طباعت سے آراستہ کر کے شائع کیا۔

اس زمانے میں انگریزوں نے ڈلہوزی پارک میں ہندوستانیوں اور کتوں کا داخلہ ممنوع قرار دیا تھا۔ ایک دن نماز فجر سے فارغ ہو کر سالم رفیقی نے چند نمازیوں کی معیت میں پارک کے گیٹ سے پابندی کے اس ہتک آمیز بورڈ کو اتار کر توڑ ڈالا۔ برطانوی حکام، جو سلطنت برطانیہ کے سورج غروب نہ ہونے کے سرسام میں بری طرح مبتلا تھے، ایک ادنیٰ ہندوستانی کی اس توہین آمیز حرکت پر کیسے خاموش رہتے۔ جرأت مندی کے اس جرم کی پاداش میں سالم رفیقی گرفتار ہو کر کلکتہ پہنچائے گئے اور پھر ۱۹۰۳ء میں انہیں رنگون لے جا کر رہا کیا گیا۔

اس سفر میں انہیں ان کی بیگم اور شیر خوار بیٹے محمد یحییٰ رفیقی کا ساتھ نصیب تھا۔ نئے لوگ، نیا ملک، نئی تہذیب ـــ پھر بھی اجنبیت کا احساس انہیں زیادہ دیر تک نہیں رہا۔ انہیں رنگون میں مقیم ہندوستانی نسل کے لوگوں اور کاروبار کرنے والے ہندوستانیوں سے متعارف ہونے میں دیر نہیں لگی۔ زندہ رہنے کے لئے انہوں نے سٹیشنری کی دوکان کھولی۔

قیام رنگون کے دوران انہوں نے جو سب سے بڑا کارنامہ انجام دیا وہ ہے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر اور ملکہ زینت محل کی قبروں کی نشاندہی کا کام، جبکہ انگریزوں نے ان کا نام و نشان تک مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اس میدان میں جہاں شہنشاہ ہند کی آخری

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آرام گاہ ہے، کسی کو چلنے پھرنے کی اجازت تک نہیں تھی۔ سلام رفیقی نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس مقبرے پر تاج محل جیسی عمارت تعمیر کرنے کے لئے ہزاروں محب وطن ہندوستانیوں کو چندہ جمع کرنے کی اپیل کے سلسلے میں خطوط لکھے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں رنگون سے ماہنامہ "الرفیق" دوبارہ جاری کیا جو ۲۲×۱۸ سائز کے ۲۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ سالانہ چندہ بارہ روپئے غیر ممالک سے تین شلنگ، رنگون کے نظام پریس اور مطبع احمدی سے چھپ کر سنہ ۱۹۱۰ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ماہنامہ کو ہندوستان کے اخبار و جرائد کے تبادلہ میں بھی بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ الرفیق کے دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء کے شمارہ میں سر تیج بہادر سپرو کے ماہنامہ "کشمیر درپن" الہ آباد میں شائع شدہ مضمون "پھولوں کی سیر اور کشمیر جنت نظیر" کو دوبارہ شائع کیا جس سے عبدالسلام رفیقی کے احساس غریب الدیار ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مذکرہ مضمون میں کشمیر میں آمد بہار پر بادام واری کی منظر کشی اور کشمیریوں کے ذوق جمالیات کی تعریف کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"یہاں قدرت کا کچھ عجیب دستور ہے۔ درخت میں پھول پہلے نکلتے ہیں اور پتے پیچھے۔ چنانچہ جب بادام کا شگوفہ ظاہر ہوتا ہے، تو دور دور تک بادامی باغ میں پھول ہی پھول نظر آتے ہیں اور دیکھنے والے کو وہ فرحت حاصل ہوتی ہے کہ قلم اپنی زبان سے اسے ادا نہیں کر سکتا۔ مگر یہاں کے لوگ بھی عجیب رنگین طبیعت کے

سنہ ۱۹۶۳ء کے بعد کے برسوں میں اس تاریخی سیرگاہ کو عوام و حکمرانوں کی بدذوقی نے تہس نہس کرکے رکھدیا۔ اب تو "بادام واری" کا نام تاریخ کے دیمک زدہ اوراق میں ہی تلاش کرنا پڑے گا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آدمی ہیں۔ سب کے سب شاعرانہ طبیعت رکھتے ہیں۔ جب یہ موقع
آتا ہے تو گھر بار چھوڑ کر کاروبار بالائے طاق رکھ کر پھولوں کی سیر
کے لئے زن و بچہ کو ہمراہ لے کر باغوں میں جاتے ہیں اور قدرت
کے حسن کے مزے لوٹتے ہیں۔ جب پھولوں کی سیر کو جاتے ہیں تو
ساتھ ساتھ سماوار چائے بنانے کے لئے کلچہ اور بھنے سنگھاڑے
کھانے کے لئے لے جاتے ہیں اور پھولوں کے نیچے بیٹھ کر اپنا
لطف اڑاتے ہیں۔"

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ماہنامہ 'الرفیق' رنگون اپنے آغاز میں صرف
ایک ادبی اور اخلاقی ماہنامہ تھا' البتہ اس کے ایڈیٹوریل میں کبھی کبھار
وطن پرستی اور غیر ملکی تسلط کے خلاف بغاوت کی بُو آتی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں
جب الرفیق پریس قائم ہوا تو رفیقی نے ہند میں قائم انگریزی تسلط کیخلاف
لٹریچر شائع کرنے کی مہم شروع کی۔ ایسے پمفلٹ اور اشتہار طبع کراکے
ہندوستان کے مختلف حصوں میں تقسیم کرائے جن میں ہندوستان پر
برطانوی قبضہ کو دنیا کی سب سے بڑی جعلسازی اور فریب قرار دے کر
ہندوستانیوں کو منظم اور متحد ہو کر جد وجہد کرنے کی اپیلیں ہوتی تھیں۔
اس کامیاب ترسیل کے بعد 'الرفیق' کے اسلوب بیان میں بھی تبدیلی آئی۔
رنگون میں برطانوی حکومت کو کلکتہ سے خفیہ ایجنسیوں کے ذریعہ معلوم ہوا
کہ اس تمام کارستانی کے پس منظر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ والئے جموں و کشمیر
کا ملک بدر کیا ہوا کشمیری باشندہ سلام رفیقی کا ذہن اور سرمایہ کارفرما ہے
ابھی اس رپورٹ پر تحقیقات ہی ہو رہی تھی کہ ۱۹۱۰ء میں عبدالسلام رفیقی
نے برطانوی حکومت کو وقفہ وقفہ سے تین خطوط بھیجے جن میں برطانوی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

طرزِ نظام پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو انٹرنل سیلف گورنمنٹ دینے کا مطالبہ کیا۔ عبدالسلام رفیقی کی ان حرکتوں سے برطانوی حکومت کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ گرفتار کئے گئے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ دورانِ سماعت ان کے وکیل نے انہیں یہ احساس دلایا کہ برطانوی حکومت انہیں پھانسی کی سزا دے کر وہ سرے محبِ وطن ہندوستانیوں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے پر تول رہی ہے۔

قید خانے سے ہی انہوں نے اپنی حاملہ بیگم اور بیٹے کو سرینگر واپس بھیجنے کا انتظام کیا اور پھر ۱۲ مئی ۱۹۱۲ء کو قید خانے سے فرار ہو کر بٹاویہ (جکارتہ کا پرانا نام) پہونچے۔ برٹش انڈیا کی حکومت کو جب اپنے جاسوسوں سے معلوم ہوا کہ عبدالسلام رفیقی بٹاویہ میں ہیں تو اس نے ڈچ گورنمنٹ کو لکھا:

"سلام رفیقی ہمارا ملزم ہے اور جیل سے فرار ہو کر ڈچ ایسٹ انڈیز (انڈونیشیا کا پرانا نام) میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ اُسے گرفتار کر کے ہمارے حوالے کیا جائے"۔

اس طرح سلام رفیقی گرفتار کئے گئے۔ انہوں نے اپنے وکیل کی وساطت سے بٹاویہ کے ریذیڈنٹ کے پاس اپیل دائر کی جس میں اپنے معروضات پیش کرتے ہوئے کہا:-

"میرے پاس ڈچ ایسٹ انڈیز میں داخلہ کے باقاعدہ کاغذات اور اجازت نامہ ہے۔ یہاں پہونچکر میں نے اس ملک کے قوانین کی نہ کوئی خلاف ورزی کی ہے اور نہ داخلے کے وقت دئے ہوئے قول کے مطابق کوئی سیاسی پمفلٹ یا اشتہار ترتیب دیا ہے اس لئے قرینِ انصاف ہے کہ مجھے یہاں سے بلا وجہ نہ نکالا جائے"۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ریذیڈنٹ نے اپیل پر فیصلہ دینے کی بجائے مقدمہ کی فائل ڈچ گورنر جنرل کو جاوا بھیج دی جہاں حکومت ہند کے لگائے ہوئے الزامات کی طویل فہرست سناتے ہوئے انہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے انڈر سیکرٹری کی رپورٹ کی نقل کی کاپی فراہم کی گئی جس میں یہ لکھا تھا:

"اسلام رشیدی کا منشا بہادر شاہ ظفر کی قبر کی تعمیر سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے سے تھا۔"

طویل بحث و تمحیص کے بعد انہیں گورنر جنرل نے ڈچ ایسٹ انڈیز چھوڑنے کا حکم دیتے ہوئے کہا:

"جھگڑا آپ کی دی ہوئی دلائل سے نہیں بلکہ برطانوی حکومت کی ناراضگی اور ہمارے تعلقات کا ہے نہ کہ یہاں قیام کرنے کے اجازت نامے کا۔ عدالت کی خواہش ہے کہ اس معاملے کو طول دینے کی بجائے ختم کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ ایسٹ انڈیز سے چلے جائیں جبکہ حکومت ہند یہ باور دلا رہی ہے کہ آپ کو کسی قسم کی اذیت نہیں دی جائے گی"

اس حکم کے ساتھ ہی انہیں اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کی جانب سے ایک ماہ کے اندر ڈچ ویسٹ انڈیز چھوڑنے کا نوٹس ملا۔ لیکن ان توڑ شکن حالات میں انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے وکیل کی وساطت سے گورنر جنرل کے نام بڑا ہی مضمون نا جرأت بھیجا:

"میری گرفتاری کے بعد یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی کہ میں نے ڈچ حکومت کے قوانین کے مطابق کوئی جرم نہیں کیا ہے اور جو وعدہ کیا نے اس ملک میں اپنے آزادانہ قیام کے بارے میں دیا تھا اس کے تحت نہیں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے کوئی پولیٹیکل پمفلٹ طبع کیا اور نہ یہاں کے امن عامہ کو خلل پہونچانے کی سعی کی ہیں نے جو پمفلٹ رنگون میں اجرائے کئے اُن میں ماسوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا تھا کہ برطانوی گورنمنٹ ہندوستان میں آسٹریلیا اور کینیڈا کے طرز پر انٹرنل سیلف گورنمنٹ تشکیل دے۔ میرے پاس ڈپٹی کمشنر بٹاویہ کا اجازت نامہ ہے اور نہ ڈچ حکام کو میرے قیام پر کوئی اعتراض ہے"۔

بقول عبدالسلام زنیقی اس عرضی میں میرے وکیل نے بے شمار قانونی نقطے ابھارتے ہوئے اس امر کا خدشہ ظاہر کیا:

"ان کا یہاں سے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ جن حالات میں برطانوی حکومت بحری جہازوں کی تلاشی لے رہی ہے، یہ کیسے گرفتاری سے بچ سکتے ہیں"۔

درخواست میں انگریز حکومت کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہ وہ سلام زنیقی کو کسی قسم کی تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ اگر یہ درست ہے تو ڈچ گورنمنٹ ازراہ کرم برطانوی حکومت سے انہیں امریکہ جانے کا پاسپورٹ جاری کرائے تاکہ یہ یہاں سے سیدھا امریکہ جاسکے"۔

سلام زنیقی کو گمان گذرا کہ ان کی درخواست قابل اعتنا نہ سمجھی جائیگی اس لئے انہوں نے ایک اور درخواست میں گورنر جنرل سے بالمشافہ گفت و شنید کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے جواب میں ان کے وکیل کو بتایا گیا کہ گورنر جنرل اُن پر آزردہ ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے سبب برطانوی اور ڈچ حکومتوں میں سخت غلط فہمیاں پیدا ہورہی ہیں۔ البتہ اب کے گورنر جنرل اس بات پر آمادہ ہیں کہ وہ انہیں بحیثیت ایک سیاسی کارکن کے پناہ دیں گے اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تکالیف سے بچ جائیں گے، بشرطیکہ سلام رفیقی خود کو گورنر جنرل کے سپرد کریں۔ وہ انہیں اختتام جنگ (جنگ عظیم اول) تک اپنے علاقہ میں کسی جگہ جہاں وہ چاہیں، بعض شرائط کے تحت رکھیں گے۔ سلام رفیقی کے حامی بھرنے پر ۱۲، اگست ۱۹۱۵ء کو انہیں بٹاویہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اطلاع دی کہ گورنر جنرل نے جنگی بحری جہاز اسایپن کے کپتان کو حکم دیا کہ انہیں جزیرۂ تیمور لیا جائے جہاں وہ اختتام جنگ تک قیام کریں گے۔ انہیں اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ وہ اس بات کو صیغۂ راز میں رکھیں تاکہ برٹش کونسلر کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ مزید تفصیلات طے کرنے کے لئے گورنر جنرل کے قاصد نے بیون زورخ سے آکر ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر اُن سے گفت و شنید کی، جس میں طے پایا کہ تیمور میں ان کی حیثیت اگرچہ نظر بند کی سی ہو گی لیکن وہاں انہیں گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی ہو گی۔

۱۶، اگست ۱۹۱۵ء کو عبدالسلام رفیقی جنگی جہاز اسایپن پر سوار ہوئے۔ بقول اُن کے جہاز کے کپتان اور دوسرے عملہ نے اُن سے اچھا برتاؤ کیا۔

"اس دن عصر کے قریب ہم تیمور کو پانگ کی طرف روانہ ہوئے۔ جہاز کے کمانڈر اور دوسرے آفیسر سب کے سب مجھ سے نہایت خلق اور مروّت سے پیش آئے اور انہوں نے کوشش کی کہ میرا سفر آرام سے گذرے"۔

جہاز کا اندرونی نقشہ کھینچتے اور اپنے وجود کے احساس کا تجزیہ کرتے ہوئے عبدالسلام رفیقی اپنی ڈائری میں یوں رقمطراز ہیں :-

"اس جہاز میں ایک سو سے کچھ زیادہ یورپین اور جاوائی جنگی سپاہی موجود تھے۔ نیز جہاز میں ایک بہت بڑی توپ اور بہت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سی چھوٹی چھوٹی توپیں لگی تھیں ۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو یہ پہلا موقع تھا کہ کسی ہندوستانی کو سیاسی وجوہات کے سبب ایک غیر سلطنت .... سنہ کے ملزم پر جنگی جہاز میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا ہو۔"

غرض ۲۲ راگست ۱۹۱۵ء اتوار کی دوپہر کے قریب جہاز کوبانگ پہنچا۔ کوبانگ کے ریذیڈنٹ اور اسسٹنٹ ریذیڈنٹ دونوں شہر سے باہر گئے تھے ۔ اُن کے سیکرٹری نے ریذیڈنٹ کی جانب سے سلام رشیتی کو خوش آمدید کہا اور کہا آپ لٹر یوسنگ میں آزاد ہیں البتہ اختتام جنگ سے قبل آپ کوبانگ سے باہر نہیں جا سکتے۔ بعد ازاں انہیں ریذیڈنٹ نے ایک ملاقات کے دوران واضح الفاظ میں اس امر کا اطمینان دلایا کہ اس شہر کے گردونواح میں آپ کلی طور آزاد ہیں لیکن ڈچ گورنمنٹ آپ کی کفالت کی کسی صورت میں ذمہ دار نہیں ۔

کوبانگ میں قیام کے دوران سلام رشیتی پر یہ راز منکشف ہوا کہ ڈچ قانون کے تحت کوئی سرکاری ملازم اور فوجی جوان دوران ملازمت اخباری اسٹرنگر یا نامہ نگار بھی ہو سکتا ہے اور ایسا کرنے کے لئے اُسے کسی پیشگی اجازت نامہ کی ضرورت نہیں ہے ۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ جاوا سے جہاز کے روانہ ہوتے ہی جہاز کے کپتان فریمر نے سلام رشیتی کی آمد کے بارے میں کوبانگ کے اخباروں کو تار کے ذریعہ اطلاع فراہم کر دی تھی جس کی پاداش میں برطانوی حکام کو ان کے نقل و حمل کی اطلاع ملی اور یہ راز طشت از بام ہو کے رہ گیا ۔ بقول سلام رشیتی "دوران سفر میں نے حتی الامکان اپنے بارے میں کچھ کہنے سے احتراز کیا لیکن میرے کوبانگ پہنچتے ہی اخباروں کے کالموں کے کالم میرے بارے میں مضامین

سنہ الفاظ نکال دیئے گئے ہیں ۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سے سیاہ ہونے لگے ۔ ان اطلاعات کا ماخذ اسا ین جہارنر کے نوجوان آفیسر ریذیڈنٹ کے آفس کے ناتجربہ کار کلرک اور بازاری افواہیں تھیں ۔ مجھے ان مہمل مضامین اور خبروں کا جواب دینے کی ممانعت تھی ۔ خاموشی سے انہیں پڑھ کر جمع کرتا رہا ۔ کئی اخباروں نے مجھے جاپان کا جاسوس قرار دیا ۔ بعض نے ترکی کا فرستادہ لکھا ۔ ایک اخبار نے لکھا کہ جب میں کوپانگ بندرگاہ پر اترا تو میرے ساتھ اشرفیوں سے بھرا ٹرنک تھا اور کئی مجھے نواب اور شہزادہ قرار دینے تک سے باز نہ آئے ۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ بعض اخباروں نے ڈچ گورنمنٹ کو اس بات پر موردِ الزام ٹھہرایا کہ اس نے کیوں ایک ایسے شخص کو جنگی جہاز میں یہاں لاکر پناہ دی جبکہ اسے اس ملک سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ۔ بعض اخبارات نے ڈچ گورنمنٹ کی انصاف پسندی اور فہم و فراست کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ اس نے فیاضی کا ثبوت دے کر ایک ہندوستانی سیاسی ورکر کی جان بچائی اور ہندوستانیوں کے سیاسی حق کی حمایت کی ۔

ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ستمبر ۱۹۱۵ء کے تیسرے ہفتہ میں انہیں مقامی حکام کی معرفت گورنر جنرل کا یہ حکم سنایا گیا کہ وہ کوئی مکتوب عربی یا فارسی یا کسی ہندوستانی زبان میں نہ لکھیں جس کو ڈچ حکام نہ سمجھتے ہوں ، اور نہ غیر ممالک میں کسی کو کوئی تجارتی خط بھی لکھیں جس سے سلام رفیقی نے یہ مطلب اخذ کیا کہ وہ اس ملک میں رہ تو سکتے ہیں لیکن کسی قسم کی تجارت نہیں کر سکتے ۔ اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کے بعد انہوں نے گورنر کے نام انگریزی میں ایک مکتوب لکھا جس کی کاپی کا ترجمہ ڈچ زبان میں کپتان فریمرشن نے کیا ، اور وہ

ٹ کپتان فریمر کے بارے میں سلام رفیقی اپنی نجی ڈائری میں رقمطراز ہیں :
" کپتان فریمر جس کو کچھ عرصہ بعد فوجی حکام پر نکتہ چینی کرنے کے جرم میں کورٹ

(اگلے صفحہ پر)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کو بھیجی گئی۔ سلام رنیقی نے خط میں اپنے معروضات پیش کرتے ہوئے لکھا:

"دوسری زبانوں میں بیرونی ممالک سے میری خط و کتابت بند نہ کی جائے جبکہ ہر خط سنسر سے گزرتا ہے۔ تجارتی خطوط پہ پابندی عائد کرنے سے میرا ذریعہ معاش متاثر ہوگا اور اگر میں تجارت نہ کروں تو زندہ کیسے رہ سکتا ہوں۔ اس لئے یا تو مجھے تجارت کرنے کی تمام سہولیات میسر کی جائیں یا میرے گذارے کا بندوبست کیا جائے"۔

کچھ عرصہ بعد انہیں گورنر جنرل کی جانب سے اطلاع ملی کہ وہ ہندوستانی زبانوں کے سوا دوسری تمام زبانوں میں اس ملک سے باہر خطوط بھیج سکتے ہیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو سلام رنیقی نے اپنے خط میں گورنر جنرل کا شکریہ ادا کرکے اپنے سابق مکتوب کے حوالے سے اس میں ابھارے گئے دیگر امور کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی۔ انہیں ایک طویل عرصہ کے بعد اس چٹھی کے جواب میں مقامی حکام نے مطلع کیا کہ گورنر جنرل یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ آپ کے گذارہ کا بندوبست سرکاری ذرائع سے کیا جائے۔ مزید ماقبل جو دوسرے ممالک سے خط و کتابت کرنے کی اجازت دی گئی تھی وہ منسوخ کی گئی ہے کیونکہ گورنر جنرل آپ کے مکتوب کے طرز تحریر سے ناخوش ہوئے ہیں۔

اس دھماکہ خیز جواب نے سلام رنیقی کی تمام امیدوں اور منصوبوں پر

(از صفحہ گذشتہ) مارشل سے گذرنا پڑا لیکن جیوری نے اس پہ الزامات ثابت نہیں کئے لیکن وہ مجبوراً قبل از وقت ریٹائر ہو کر ہالینڈ واپس چلے گئے۔ اس نے لڑائی کے دوران بحیثیت نامہ نگار کے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اخبار نویک ڈچ میں اس کی تحریریں خاص حیثیت رکھتی ہیں"۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پانی پھیر دیا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والے اس ماحول میں بھی انہوں نے حوصلہ اور ہمت کا دامن نہیں چھوڑا۔ ۲ فروری ۱۹۱۶ء کو گورنر جنرل کے نام ایک اور خط میں انکساری سے اپیل کرتے ہوئے لکھا:

"میری بدقسمتی سے میرے چند گذشتہ خطوط کو غیر مودبانہ تصور کیا گیا۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے دانستہ گورنر جنرل کی شان کے خلاف کوئی ایسی بات نہیں لکھی اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جب میں بے یار و مددگار تھا میری ہر وقت مدد کر کے مجھے فنا ہونے سے بچایا گیا۔ میں ایسی گستاخی کا مرتکب کیسے ہو سکتا ہوں میں اپنے محسن کا شکر گذار ہوں"۔

متذکرہ خط میں منجملہ دیگر باتوں کے انہوں نے مزید یہ بھی لکھا:۔

"گورنر جنرل بخوبی جانتے ہیں کہ میرا ڈچ علاقہ کو چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر مجھے تجارت کرنے کی اجازت نہ دی گئی تو لازم ہے کہ میں ڈچ گورنمنٹ سے اپنے گذارے کے لئے اپیل کروں۔ میرا معاملہ اُس مسافر جیسا ہے جو شیر کے ڈر سے کسی بھلے آدمی کے گھر میں پناہ لیتا ہے اور مالک مکان اسے بخوشی پناہ دیتا ہے لیکن کھانے کے دستر خوان پر بیٹھنے سے روکتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے جب چاہو اس مکان سے نکل جانا۔ اس لحاظ سے میرے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں یا تو باہر جا کر شیر کے منہ کا نوالہ بنوں یا اسی مکان میں پڑا بھوکا مر جاؤں"۔

۸ جون ۱۹۱۶ء کو سلام رفیقی نے گورنر جنرل کو بنک میں جمع شدہ اپنی پونجی کا گوشوارہ پیش کرتے ہوئے اور تجارت کرنے کی اجازت کا اعادہ کرتے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوئے لکھا:۔

"یہ قلیل رقم مجھے زیادہ دیر زندہ رہنے میں مددگار ثابت نہیں ہوسکتی۔ ایک جانب مجھے آزاد ہونے کا مژدہ سنایا جارہا ہے اور دوسری جانب میری حالت قیدی سے بدتر ہے' حالانکہ دنیا کی ہر مہذب حکومت قید کے دوران قیدیوں کی کفالت برداشت کرتی ہے"۔

گورنر جنرل کی طرف سے خاموشی اختیار کرنے پر انہوں نے مقامی حکام سے رابطہ قائم کرنے کی خواہش ظاہر کی اور کہا:

"چونکہ میری حالت غیر ہوتی جارہی ہے اس لئے میں جاوا کے اخباروں میں اپنی کمزور مالی حالت کا انکشاف کرکے اپنے ہمدردوں سے اپیل کروں گا کہ میری مالی امداد کی غرض سے دلال بنک میں اپنے عطیات جمع کرائیں"۔

کچھ مدت بعد ڈچ حکام نے انہیں مطلع کیا کہ گورنر جنرل اور چیف پولیٹیکل آفیسر اس قسم کی اپیل کو نامناسب سمجھ کر اس تجویز کو رد کرتے ہیں اور آپکو تجارت کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔

جاپانی تجارتی حلقوں سے رابطہ قائم کرنے کے بعد سلام زنیقی کو ان کاروباری اداروں نے اطلاع دی کہ انہیں برطانوی کونسلر نے ہدایت کی ہے کہ وہ سلام زنیقی سے تاوقتیکہ وہ برطانوی حکام سے کلیرنس حاصل نہ کرے کسی قسم کے تجارتی تعلقات استوار نہیں کرسکتے ہیں۔

یہ خبر ان کو چونکا دینے والی ثابت نہیں ہوئی۔ وہ بخوبی جانتے تھے جب وہ پہلے پہل کویانگ پہونچے تو وہاں کے کنٹرولر کمشنر ریذیڈنٹ نے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ان کا نام جمخانہ کلب کی ممبرشپ کے لئے تجویز کیا تھا جس کو کلب کے پریذیڈنٹ اور سیکریٹری نے اُن کے نام اپنے مشترکہ خط میں یہ کہہ کر نامنظور کیا کہ کلب کے قواعد و ضوابط کے تحت آپ ممبر نہیں بن سکتے ہیں۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ ایسا کلب کے برطانوی ممبروں کے کہنے پر کیا گیا ہے۔ بہر کیف انہوں نے برطانوی حکومت کی اس تنگدلانہ رنجش کے مدعا و مقصد کو واضح الفاظ میں سمجھنے کے لئے برٹش کونسلر ایجنٹ کی معرفت برٹش کونسلر جنرل مسٹر بینیکٹ کو یہ ٹا و یہ خط لکھ کر اس ناروا سلوک کے بارے میں وضاحت چاہی جس کے جواب میں مسٹر بینیکٹ نے اُن سے مندرجہ ذیل سوالوں کا براہ راست جواب لکھنے کی ہدایت کی:

(۱) اپنے تازہ سیاسی حالات سے واقف کرائیں۔

(۱۱) آپ کی سوچ میں کتنی تبدیلی آئی ہے؟

(۱۱۱) فی زمانہ ہمارے دشمنوں کو کس حد تک مدد دے رہے ہیں؟

ان سوالوں کے جواب میں سلام رنیتی نے مندرجہ ذیل خط مسٹر بینیکٹ کو بھیجا:

"بجواب میری درخواست برائے منگوانے مال تجارتی مسٹر سی ایم بیٹ برٹش کونسل ایجنٹ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کے نام براہ راست خط لکھوں اور اس میں مالی حالت کا تذکرہ کروں، میں نے کس حد تک موجودہ سیاسی معاملات کے متعلق اپنے خیالات تبدیل کئے ہیں؟ میرا طریقہ برٹش انڈیا کی گورنمنٹ کے دشمنوں کی امداد اور اعانت کے متعلق کیا ہے؟

میرے لئے یہ بہت ہی مشکل ہے کہ آپ کو اپنے موجودہ سیاسی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خیالات کے متعلق رائے کا یقین دلا سکوں۔ لیکن میں نہایت ادب کے ساتھ مکرر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کسی وقت بھی برٹش انڈیا کی گورنمنٹ کے یا برٹش ایمپائر کے دشمنوں کی مدد نہیں کی اور نہ کبھی میری خواہش رہی ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔

یہ ضروری ہے کہ اب ہندوستانیوں کو اختتام جنگ تک انتظار کرنا ہوگا تاکہ برٹش ایمپائر نئے سرے سے نئے انتظام میں داخل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کو اُس کی ضرورت سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔

اس موقعہ پر پھر اعادہ کرتا ہوں کہ جس دن سے یعنی ۲۳ اپریل ۱۹۱۶ء کو جب میں نے ڈچ حکومت سے وعدہ کیا ہے میں نے پولیٹیکل امور کے بارے میں کوئی پمفلٹ شائع نہیں کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ میرے جواب سے آپ مطمئن ہوں گے"۔

اس دیارِ غیر میں بڑی تکلیفوں اور پابندیوں کے بعد عبدالسلام رفیقی کو راحت کا رانس لینا اختتام جنگ کے بعد ہی نصیب ہوئی۔ اُن پر عائد شدہ تقریباً تمام پابندیاں سنہ ۱۹۲۱ء میں ہٹائی گئیں اور برطانوی حکومت نے بھی اس پر نیم دلانہ رضامندی ظاہر کی کہ اگر وہ برطانوی مقبوضات کے کسی حصہ میں رہائش یا قیام کرنا چاہیں تو اُسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں سلام رفیقی نے ایک جاوانی خاتون سے نکاح کیا جس کے بطن سے ایک لڑکی نور النساء پیدا ہوئی جو ہالینڈ میں بیاہی گئی اور وہیں سکونت پذیر ہے۔ اُن کی پہلی بیگم سے ۲ بیٹے محمد یحییٰ رفیقی اور محمد اسحاق رفیقی تھے جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کی والدہ نے سرینگر میں ہی کی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

۱۹۲۵ء میں دونوں بھائی اپنے والد سے ملنے اور ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے کے لئے انڈونیشیا گئے۔ محمد یحییٰ رفیقی اپنی والدہ سے ملنے ۱۹۳۰ء تک کئی بار سرینگر آئے۔ ۱۹۳۰ء کے سفر کے دوران ہی ۸ اپریل کو ان کی ملاقات علی گڈھ ریلوے سٹیشن کے تیسرے درجے کے ڈبہ میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے کئی دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ہوئی جو اپنی تعلیم ختم کر کے سرینگر واپس آرہے تھے۔ خراماں خراماں یہ ملاقات دوستی میں بدلی۔ ۱۹۳۲ء میں جب مسلم کانفرنس کا پہلا سالانہ اجلاس شاہی مسجد سری نگر میں منعقد ہوا تو محمد یحییٰ رفیقی شیخ محمد عبداللہ کے قابل اعتماد رفقاء میں شمار ہوتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ہی جب پریس اور پلیٹ فارم سے پابندیاں ہٹائی گئیں، ریاست سے متعدد اخبار و جرائد شائع ہوئے۔ مسلم کانفرنس کی ترجمانی کیلئے ہفت روزہ "صداقت" جاری ہوا۔ وقفہ اشاعت ۱۹۳۴ء میں روزنامہ ہوا مولانا مسعودی مدیر اور محمد یحییٰ رفیقی معاون مدیر تھے۔ اخبار "جہانگیر" کے بھی مولانا محمد سعید مسعودی مدیر اور محمد یحییٰ رفیقی معاون مدیر تھے۔ ۱۹۳۵ء میں محمد یحییٰ رفیقی کے برادر نسبتی غلام نبی نے سرینگر سے کشمیری زبان کا پہلا اخبار "گاشہ تارک" منظر عام پر لایا جس کا صرف ایک شمارہ نکلا۔ ظاہر ہے کہ محمد یحییٰ رفیقی نے شیخ

ؔ اس موقعہ پر ان دوستوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے یہ بتانا لازمی ہے جو ظن کے گھوڑے دوڑا کر یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ محمد یحییٰ رفیقی کو کوئٹ کشمیر تحریک کے دوران ریاستی حکومت نے ملک بدر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد یحییٰ رفیقی اپنی رضا اور منشاء سے ۱۹۴۶ء میں سرینگر سے انڈونیشیا چلے گئے جہاں انہوں نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی سے ان کے تین لڑکیاں اور چار لڑکے ہوئے۔ ان کی پہلی بیگم جو سرینگر میں بقید حیات ہیں، کے بطن سے تین لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر محمد اسلم

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

محمد عبداللہ سے قربت اور بے تکلفی کے باعث اپنے والد بزرگوار کے حالات سے ان کو باخبر کیا ہوگا جب ہی ۱۹۳۸ء میں شیخ صاحب نے سلام رفیقی کے نام اپنے مکتوب میں یہ خواہش ظاہر کی کہ سرینگر واپس آکر ریاستی عوام کو اپنے سیاسی تجربات سے مستفید ہونے کا موقعہ دیں جس کے جواب میں سلام رفیقی نے لکھا :-

" قطع نظر کاروباری مصروفیات کے میری صحت اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ میں طویل سفر کروں ۔ آپ کی سیاسی سرگرمیوں سے لاہور اور سرینگر کے اخبارات کے ذریعہ کما حقہ واقف ہوں ' یہ جان کر مسرت ہوتی ہے کہ یحییٰ آپ کے قومی کاموں میں ہاتھ بٹا رہا ہے ۔ اللہ آپ کو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب کرے "۔

جنگ آزادی ہند کا یہ بوڑھا سپاہی دوسری جنگ عظیم کے دوران ۲ جولائی ۱۹۴۱ء کو جکارتہ کے ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں انتقال کر گیا اور وہیں آسودہ خاک کیا گیا ۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) :- (جو ان دنوں انگلینڈ میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں) محمد یعقوب اور محمد قاسم ، شمس النساء ، محبوب النساء اور زبیدہ النساء (سب سرینگر میں مقیم ہیں) ۔ محمد یحییٰ رفیقی ۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو سورابایا ' ایسٹ کوسٹ انڈونیشیا میں رحلت کر گئے اور وہیں سپرد خاک ہوئے ۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ظہور الدین

صاحبزادہ محمد عمر

صاحبزادہ محمد عمر ریاست جموں و کشمیر خصوصاً جموں کے ایک نامور خاندان سے متعلق تھے۔ اس خاندان نے ریاست میں علم و ادب کی شمع کو فروزاں رکھنے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اسے اردو ادب کی کوئی تاریخ فراموش نہیں کرسکتی۔ انکی مساعی جمیلہ نے اردو زبان و ادب کو ریاست جموں و کشمیر میں وہ استحکام عطا کیا جس نے بالآخر اُسے ریاست کی سرکاری زبان کی مسندِ جلیلہ تک پہنچا دیا۔ موصوف کے آبائواجداد کون تھے اور وہ ریاست میں کہاں سے آئے، اس سے متعلق جو معلومات مختلف ذرائع سے ہم تک پہنچتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

"صاحبزادہ محمد عمر کے جدِ امجد خواجہ شیخ اللہ تیراہی رامپور کے روہیلہ دربار میں قلعہ دار تھے اور حضرت حافظ جمال اللہ نقشبندی کے طالب تھے۔ انہیں کی نظر کا اثر تھا کہ آپ نے درویشی اختیار کرلی اور مغربی پاکستان کے مشہور پیر خانوادہ چورہ شریف (ضلع اٹک) کے بانی ہوئے۔ صاحبزادہ صاحب مرحوم کے والد پیر بیدار شاہ صاحب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مہاراجہ رنبیر سنگھ (م - ۱۸۸۴ء) کے عہد میں جموں تشریف لائے۔
مہاراجہ موصوف کے ندیم خاص اور مقرب میاں لال دین صاحب
بڑے متدین اور درویش دوست رئیس تھے۔ آپ سترہ مسجدوں کے
بانی تھے۔ مکہ معظمہ میں رباط کشمیر، مسجد، مکتب و چاہ بنوا چکے تھے
اور سلطان روم سے پاشا کا خطاب پایا تھا۔ آپ کو صاحبزادہ صاحب
مرحوم کے دادا اللہ دین محمد صاحب سے گہری عقیدت تھی چنانچہ آپ
نے اپنی بیٹی پیر زیدار شاہ صاحب سے بیاہ دی اور کچھ عرصہ بعد
سنہ ۱۳۰۰ھ میں صاحب زادہ محمد عمر صاحب پیدا ہوئے۔ بچپن
میں ہی آپ مہر مادری اور شفقت پدری سے محروم ہو گئے اور اپنے
نانا میاں لال دین صاحب کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔
سنہ ۱۸۹۴ء میں میاں صاحب موصوف بھی اللہ کو پیارے ہو گئے تو
صاحبزادہ صاحب کی بے اولاد خالہ نے آپ کو گود لے لیا۔ اس نیک
خاتون کی شفقت و محبت سے آپ مہر مادری بھی بھول گئے اور نہایت
نازو نعم میں پرورش پانے لگے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں صاحبزادہ صاحب
نے سری رنبیر گورنمنٹ ہائی اسکول جموں سے میٹرک کا امتحان پاس
کیا اور مزید تعلیم کے لئے لاہور میں فورمین (شاید فارمن) کرسچین
کالج میں داخلہ لے لیا جہاں سے آپ نے تاریخ و اقتصادیات سے
کر انٹرمیڈیٹ پاس کیا اور بی اے میں داخل ہو گئے۔ ان دنوں
آپ کی شناسائی منشی نور الٰہی صاحب سے ہو چکی تھی۔ منشی صاحب
کے برادر بزرگ میاں فضل الٰہی مرحوم بیرسٹر ایٹ لاء (حویلی بیقرا
شاہی۔ موچی دروازہ لاہور) کی دختر سے آپ کی نسبت قرار پائی میاں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صاحب موصوف رائے بہادر لالہ سکھدیال چیف جج جموں و کشمیر ہائی کورٹ کے ذاتی دوست تھے۔ چنانچہ اس توسط سے صاحبزادہ مرحوم جموں و کشمیر ہائیکورٹ میں مترجم کے عہدے پر فائز ہو گئے اور تعلیم ترک کر کے جموں چلے آئے۔ یہ ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے۔[1]

ملازمت کے دوران مترجم کی حیثیت سے صاحبزادہ محمد عمر نے خوب نام کمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری ریاست میں اُن کا شہرہ ہو گیا۔ حکومت نے انکی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی اور مختلف شعبوں میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنے کے موقعے بھی فراہم کئے۔ مترجم کی حیثیت سے حاصل ہونے والی اس تربیت نے بعد میں ساری عمر اُن کا ساتھ دیا اور اُن سے متعدد کارہائے نمایاں انجام دلائے۔ حسن شاہ صاحب اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں :-

"کچھ عرصہ بعد "جنرل کلازز ایکٹ" اور "پرتاپ کوڈ" کا ترجمہ آپ کے سپرد ہوا۔ یہ کام آپ نے اس خوش اسلوبی سے پورا کیا کہ دربار میں آپ کی قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں پبلسٹی کا کام آپ کے سپرد رہا اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ آنجہانی (م ۱۹۲۵ء) والئی کشمیر نے آپ کو سند خوشنودی اور ایک تمغہ عطا کیا لیکن اسے کبھی اپنے لئے وجہ امتیاز نہ سمجھا اور کبھی اشارتاً بھی اس کا کسی سے ذکر نہ کیا۔ اس کے بعد آپ وزارت قانون میں بھی مترجم رہے"۔[2]

علم حاصل کرنے کی لگن بچپن سے ہی تھی اور ہر وقت کسی نہ کسی علمی کام میں خود کو مصروف رکھتے۔ سرکاری ملازمت کی خاطر اگرچہ کہ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع

---

[1] ،[2] سوسٹہ، حسن شاہ، مصنفین ناٹک ساگر۔ آج کل دہلی (ڈراما نمبر) جنوری ۱۹۵۹ء ص ۵۳۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کر کے وطن لوٹ آئے تھے لیکن علم حاصل کرنے کی خواہش بدستور موجود تھی چنانچہ ملازمت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تعلیمی استعداد کو آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور انتھک محنت و لگن سے منصفی کا امتحان پاس کر کے قانون کی سند حاصل کر لی اور اس طرح بطور جج بھی مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ موصوف کی ان کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے حسن شاہ لکھتے ہیں:۔

"اسی دوران میں آپ نے منصفی کا امتحان پاس کر کے قانون کی سند حاصل کی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں منصف اور بعد میں سب جج ہو کر سنہ ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ وکالت کرتے رہے"[1]

صاحبزادہ محمد عمر کا انتقال ۳، اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کو صبح دل کی حرکت بند ہونے سے ہوا اور جموں میں قلعہ باہو کے سامنے قبرستان بیر قاذر بخش[2] میں سپرد خاک کئے گئے۔

صاحبزادہ محمد عمر کو قدرت نے تین صاحب زادوں[3] سے نوازا۔ بڑے صاحب زادے کا نام محمود احمد، منجھلے کا نام حسن شاہ اور سب سے چھوٹے کا خالد شاہ تھا۔

۱۔ حسن شاہ۔ مصنفین ناٹک ساگر۔ آج کل دلی (ڈرامانمبر) جنوری سنہ ۱۹۵۹ء ص ۵۳
۲۔ راقم انکی قبر کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے محفوظ کرانے کیلئے قدم اٹھائے جا سکیں۔
۳۔ محمود احمد اور حسن شاہ ایک مدت تک ریاست کے کالجوں میں بطور پرنسپل کام کرتے رہے۔ خالد شاہ ملکوال پنجاب میں ڈاکٹر تھے۔ محمود احمد آخر میں ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بھی رہے اور تقریباً بارہ پندرہ سال قبل ان کا انتقال ہوا۔ حسن شاہ مولانا آزاد کالج جموں میں پرنسپل کے طور پر کام کر رہے تھے کہ سنہ ۱۹۶۵ء کے آس پاس ملازمت ترک کر کے پاکستان چلے گئے۔ جہاں ایک عرصے تک ایک یونیورسٹی میں رجسٹرار رہ کر سبکدوش ہوئے۔ خالد شاہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں اُس چنگاری نے بچپن میں سلگنا شروع کر دیا تھا جس نے بعد میں شعلہ جوالا کی شکل اختیار کر کے ان کے ادبی ذوق و شوق کے لئے مہمیز کا کام انجام دیا۔ یہ چنگاری ان تھیٹریکل کمپنیوں نے بھڑکائی جو جموں میں ڈرامے دکھانے کے لئے اکثر آیا کرتی تھیں اور جن کی آمد کا سلسلہ انیسویں صدی کے ربع آخر تک خاصا عام ہو چکا تھا۔ مہاراجا بہادر ان سرگرمیوں میں نہ صرف خود دلچسپی لینے لگے تھے بلکہ وہ ایسی کمپنیوں کی خاص حوصلہ افزائی کرتے جو یہاں آکر ڈرامے کھیلتیں یا تماشے دکھاتیں۔ چنانچہ انہیں کمپنیوں کی وجہ سے صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں ادبی ذوق کی وہ چنگاری روشن ہوئی جس نے بعد میں ان سے نہ صرف ڈرامے لکھوائے بلکہ انہیں کھیلنے اور کھلوانے کے قابل بھی بنایا۔ موصوف شاید دوسری جماعت کے طالب علم تھے جب انہیں پہلی بار کسی تھیٹریکل کمپنی کے "اکبر اعظم" نامی کھیل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر کیا تھا ایک آگ سی وجود میں دہک اٹھی۔ ڈرامے دیکھنے کا ایسا چسکہ لگا کہ اس سے بینائی پر بُرا اثر پڑا۔ بچپن میں ہی عینک لگ گئی۔ اُس زمانے میں عینک بنوانے کے لئے لاہور جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں اس مقصد کے لئے جب وہ لاہور گئے ہوئے تھے تو وہاں چو محلہ میں عینکوں کی ایک دکان پر ان کی ملاقات اُس شخص سے ہوئی جو بعد میں انکے نام کا جزو خاص بن گیا۔ یہ شخص تھا منشی نورالٰہی مرحوم۔ منشی نورالٰہی کے والد منشی چراغ دین اور صاحبزادہ محمد عمر کے

سلہ وہ حضرات جو صاحبزادہ محمد عمر یا نورالٰہی صاحب کے نام کو تنہا دیکھنے یا پڑھنے کے عادی نہیں ہیں انہیں اس مقالے کی جبین نیاز پہ اس نام کو تنہا پا کر "یقیناً" اچنبھا ہوگا لیکن بیچاران و ناہنجار مقالہ نگار کیا کرے کہ اسے تو صرف اسی نام کے بارے میں کچھ لکھنے کے لئے کہا گیا ہے۔ امید ہے اس مرکب نام کے شیدائیوں کے ساتھ ہی ساتھ (اگلے صفحہ پر)

کر کے وطن لوٹ آئے تھے لیکن علم حاصل کرنے کی خواہش بدستور موجود تھی چنانچہ ملازمت کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تعلیمی استعداد کو آگے بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور انتھک محنت و لگن سے منصفی کا امتحان پاس کر کے قانون کی سند حاصل کر لی اور اس طرح بطور جج بھی مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ موصوف کی ان کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے حسن شاہ لکھتے ہیں:۔

"اسی دوران میں آپ نے منصفی کا امتحان پاس کر کے قانون کی سند حاصل کی اور سنہ ۱۹۲۵ء میں منصف اور بعد میں سب جج ہو کر سنہ ۱۹۳۶ء میں سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد آپ وکالت کرتے رہے"[1]

صاحبزادہ محمد عمر کا انتقال ۳، اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء کو صبح دل کی حرکت بند ہونے سے ہوا اور جموں میں قلعہ باہو کے سامنے قبرستان پیر قادر بخش[2] میں سپرد خاک کئے گئے۔

صاحبزادہ محمد عمر کو قدرت نے تین صاحبزادوں[3] سے نوازا۔ بڑے صاحبزادے کا نام محمود احمد، منجھلے کا نام حسن شاہ اور سب سے چھوٹے کا خالد شاہ تھا۔

۱۔ حسن شاہ۔ مصنفین ناٹک ساگر (آج کل دہلی ڈرامانمبر) جنوری سنہ ۱۹۵۹ء ص ۵۳

۲۔ راقم انکی قبر کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اسے محفوظ کرانے کیلئے قدم اٹھائے جا سکیں۔

۳۔ محمود احمد اور حسن شاہ ایک مدت تک ریاست کے کالجوں میں بطور پرنسپل کام کرتے رہے۔ خالد شاہ ملکوال پنجاب میں ڈاکٹر تھے۔ محمود احمد آخر میں ڈائرکٹر آرکائیوز بھی رہے اور تقریباً بارہ پندرہ سال قبل ان کا انتقال ہوا۔ حسن شاہ مولانا آزاد کالج جموں میں پرنسپل کے طور پر کام کر رہے تھے کہ سنہ ۱۹۶۵ء کے آس پاس ملازمت ترک کر کے پاکستان چلے گئے۔ جہاں ایک عرصے تک ایک یونیورسٹی میں رجسٹرار رہ کر سبکدوش ہوئے۔ خالد شاہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں اُس چنگاری نے بچپن میں سلگنا شروع کر دیا
تھا جس نے بعد میں شعلہ جوالا کی شکل اختیار کر کے ان کے ادبی ذوق و شوق
کے لئے مہمیز کا کام انجام دیا۔ یہ چنگاری ان تھیٹریکل کمپنیوں نے بھڑکائی جو جموں
میں ڈرامے دکھانے کے لئے اکثر آیا کرتی تھیں اور جن کی آمد کا سلسلہ انیسویں
صدی کے ربع آخر تک خاصا عام ہو چکا تھا۔ مہاراجا بہادران ان سرگرمیوں
میں نہ صرف خود دلچسپی لینے لگے تھے بلکہ وہ ایسی کمپنیوں کی خاص حوصلہ افزائی
کرتے جو یہاں آکر ڈرامے کھیلتیں یا تماشے دکھاتیں۔ چنانچہ انہیں کمپنیوں کی وجہ
سے صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں ادبی ذوق کی وہ چنگاری روشن ہوئی جس نے
بعد میں ان سے نہ صرف ڈرامے لکھوائے بلکہ انہیں کھیلنے اور کھلوانے کے قابل
بھی بنایا۔ موصوف شاید دوسری جماعت کے طالب علم تھے جب انہیں پہلی بار
کسی تھیٹریکل کمپنی کے "اکبر اعظم" نامی کھیل کو دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر کیا تھا ایک
آگ سی وجود میں دہک اٹھی۔ ڈرامے دیکھنے کا ایسا چسکہ لگا کہ اس سے
بینائی پر بُرا اثر پڑا۔ بچپن میں ہی عینک لگ گئی۔ اُس زمانے میں عینک بنوانے
کے لئے لاہور جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۲ء میں اس مقصد کے لئے جب وہ
لاہور گئے ہوئے تھے تو وہاں چومحلہ میں عینکوں کی ایک دکان پر ان کی ملاقات
اُس شخص سے ہوئی جو بعد میں انکے نام کا جزو خاص بن گیا۔ یہ شخص تھا منشی
نور الٰہی[لہ] مرحوم — منشی نور الٰہی کے والد منشی چراغ دین اور صاحبزادہ محمد عمر کے

لہ وہ حضرات جو صاحبزادہ محمد عمر یا نور الٰہی صاحب کے نام کو تنہا دیکھنے یا پڑھنے کے عادی
ہیں ہیں انہیں اس مقالے کی جبین نیاز پر اس نام کو تنہا پا کر یقیناً "اچنبھا" ہوگا لیکن
بیچارہ مقالہ نگار کیا کرے کہ اسے تو صرف اسی نام کے بارے میں کچھ لکھنے
کے لئے کہا گیا ہے۔ امید ہے اس مرکب نام کے شیدائیوں کے ساتھ ہی ساتھ (اگلے صفحہ پر)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خالو میاں غلام رسول سے ہو گیا، جو بعد میں جموں و کشمیر گورنمنٹ کے ٹریڈ کمشنر بن کر لندن بھی گئے، میں گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ ان دونوں کی یہ ملاقات جلد ہی دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔ بعد میں جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلئے محمد عمر لاہور آگئے تو یہ ملاقاتیں گہرے تعلقات کا موجب بنیں۔

محمد عمر مرحوم کے وجود میں ڈراموں کے ذوق و شوق کی جس چنگاری کو تھیٹریکل کمپنیوں نے جموں میں بھڑکایا تھا وہ لاہور پہنچ کر اور بھی تیز ہو گئی۔ لاہور ہمیشہ سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ وہ چنگاری کالج کی تعلیم کے دوران اب تماش بینی کی حد سے آگے بڑھ کر تماشہ بننے یا تماشہ دکھانے کی حد تک جا پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے کالج کے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ یہاں اکثر انگریزی ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر رائیس اور پادری کارٹر نے جب اردو ڈرامے کھیلنے کا سلسلہ شروع کیا تو صاحبزادہ مرحوم اُن میں

(از صفحہ) مرحومین کی ارواح مقدسہ بھی اس ناکردہ گستاخی کے لئے معاف فرمائینگی کہ اس میں مقالہ نویس بیچارے شامت کے مارے کی کوئی تقصیر نہیں۔ اس اعترافِ عجز کی یہاں اسلئے بھی ضرورت ہے کہ محمد عمر کے دوست اور رفیق کار منشی نور الٰہی صاحب کی وفات کے بعد بھی، جو صاحبزادہ محمد عمر کی وفات سے کم و بیش دس سال قبل واقع ہوئی، موصوف نے جو کچھ لکھا یا چھپایا اس پر منشی صاحب کا نام بھی مصنف یا مولف کے طور پر ان کے نام کے ساتھ شامل رہا اور اس طرح تادمِ آخر، محمد عمر صاحب کی ہر تحریر "محمد عمر نور الٰہی" کے مرکب نام کے ساتھ آتی رہی۔ دونوں کے مابین کس حد تک قربت تھی اس کی مزید وضاحت مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگی جو خود ان کے موقر صاحبزادے جناب حسن شاہ کے ایک مضمون سے ماخوذ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:-

"اردو ڈراما کی تاریخ میں "نور الٰہی محمد عمر" کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بعض لوگ انھیں آج تک ایک ہی فرد سمجھتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہندوستان میں مشترکہ ادبی تصانیف کی جو مثال صاحبزادہ محمد عمر مرحوم و منشی نور الٰہی مرحوم نے قائم کی تھی (اگلے صفحہ پر)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بھی حصہ لینے لگے۔ تماشبین اب خود تماشہ بن رہا تھا۔ فطری صلاحیت چونکہ صاحبزادہ موصوف کے اندر موجود تھی اس لیے جلد ہی وہ جوہر دکھانے کہ سارے کالج میں دھاک بیٹھ گئی۔ پھر کیا تھا ایکٹر کی حیثیت سے بڑے بڑوں سے داد و تحسین حاصل کرنے لگے۔ اس حوصلہ افزائی نے ڈرامے کے باقاعدہ مطالعے کے لیے بنیادی محرک کا کام کیا اور آپ نے اپنی توجہ پوری طرح اس طرف مبذول کر دی۔

ملازمت کا سلسلہ شروع ہونے پر جب محمد عمر ۱۹۰۸ء میں ریاست میں واپس آگئے تو منشی نور الٰہی سے ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا جس

(از صفحہ) وہ یورپ میں سہی لیکن ہندوستان میں قابل فہم نہ تھی۔ عمر بھر یہ دونوں صاحب یک جان و دو قالب ہو کر رہے اور تحریر و تصنیف میں انہوں نے فرقت گوارا نہ کی۔

راقم کے اس مضمون کو حسن شاہ صاحب کے مضمون کا تکملہ تصور کیا جانا چاہیے کہ اس میں راقم نے متذکرہ مضمون سے خاصی خوشہ چینی کی ہے۔

(حسن شاہ۔ مصنفین ناٹک ساگر۔ آج کل دہلی (ڈراما نمبر) جنوری ۱۹۵۹ء جلد ۱۷، نمبر ۶، ص ۵۳)۔

منشی نور الٰہی کا ذکر جب چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ ان کے بارے میں بھی مختصراً کچھ گفتگو ہو جائے۔ ان حضرت کی ولادت ۱۸۸۳-۸۴ء میں لاہور میں ہوئی۔ تعلیمی مراحل بھی وہیں طے پائے۔ اسکول کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ آپکی دیکھ بھال کی ذمے داری آپ کے برادر بزرگ میاں فضل الٰہی بیرسٹر ایٹ لا کے سپرد تھی۔ منشی صاحب کرکٹ کے بہترین کھلاڑی تھے۔ ریاست کے مہاراجا پرتاپ سنگھ بھی کرکٹ کے رسیا تھے اور اکثر ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے جو اچھا کرکٹ کھیلتے ہوں۔ وہ دل کھول کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتے۔ چنانچہ انھوں نے منشی نور الٰہی کے کھیل سے متاثر ہو کر انہیں اپنی ٹیم میں شامل (اگلے صفحہ پر)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے اس تخلیقی سفر کے آغاز کے امکانات روشن کر دیئے جو ابھی تک محض تربیت کی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے رام لیلا ناٹک کلب کے نام سے ایک تھیٹر قائم کر رکھا تھا جس کا مقصد صرف رام لیلا پیش کرنا تھا۔ اس کلب میں منشی نور الٰہی مرحوم کو خاصا دخل تھا چنانچہ موصوف کی وساطت سے محمد عمر بھی اس کلب میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ کلب امیچر ڈرامیٹک کلب میں تبدیل ہو گیا تو سری نگر میں بسنت باغ اور جموں میں مندر دیوان جوالا سہائے میں دو منڈوے قائم ہو گئے۔ جہاں باقاعدہ ڈرامے ہونے لگے۔ مہاراجہ بہادر نہ صرف اس کی سرگرمیوں میں خاصی دلچسپی لیتے بلکہ انہیں سالانہ مالی امداد فراہم کر کے اس قابل بنانے کہ وہ تماشے تیار کر کے دکھا سکیں۔ اسی کلب سے ان دو حضرات کا وہ ازلی و ابدی تخلیقی اشتراک شروع ہوا جس نے ریاست میں اُردو ادب خصوصاً اُردو ڈرامے کی ترویج و ترقی کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی ڈرامے لکھ کر انہیں اسٹیج کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔

اپنی عمر بھر کی محنت و لگن سے انہوں نے جو ڈرامے لکھے اُن میں ایسے ڈراموں کی تعداد زیادہ ہے جو یا تو کسی یورپی ڈرامے کا ترجمہ ہیں یا پھر اس سے ماخوذ۔ کمال یہ ہے کہ انہوں نے انہیں اپنے تخلیقی جوہر کی آنچ سے کچھ

(از صفحہ   ) کر کے ریاست میں بلا لیا۔ اس طرح آپ اپنے تعلیمی سلسلے کو منقطع کر کے دربار کشمیر میں ملازم ہو گئے۔ پہلے محکمہ کسٹم و آبکاری میں رہے پھر بندوبست و مال میں تحصیلدار ہو گئے اور ترقی کرتے کرتے ڈپٹی کمشنر کے عہدے تک جا پہنچے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۳۶ء میں ذیابیطس کی وجہ سے لاہور میں انتقال کیا اور میانی صاحب کے قبرستان میں مدفون ہوئے۔ انتقال سے ۴/۵ سال قبل ایک اور شادی کی۔ آپ کے تین صاحبزادے میاں احسن الٰہی انسپکٹر لاہور کارپوریشن جناب محبوب الٰہی اور میاں اقبال الٰہی تھے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ایسا روپ دیا ہے کہ وہ ترجمہ کی بجائے طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔

صاحبزادہ محمد عمر اور منشی نور الٰہی کو اگرچہ کہ ملازمت کے دوران ایسے موقعے بہت کم نصیب ہوئے جب وہ دونوں کسی ایک ہی جگہ پر تعینات ہوں جس کی اشتراکِ عمل کے لئے بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے جب بھی کوئی کام کرنے کا فیصلہ کیا تو کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر کے ضرور مشورہ کیا۔ کبھی کام شروع کرنے سے پہلے خط و کتابت کے ذریعے ایک دوسرے سے مشورہ کر لیتے یا پھر کام مکمل ہونے پر مسودہ دوسرے کو بھیج دیتے جو اُسے دیکھنے کے بعد مناسب مشوروں سے نوازتا۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ سرکاری دورے کے دوران اگر دوسرے کی جائے تعیناتی قریب ہی ہوتی تو اس سے ملاقات کر کے مشورہ کر لیتے۔ اکثر و بیشتر مسودے سے متعلق آخری رائے محمد عمر ہی قائم کرتے اور انہیں کی رائے کے ساتھ وہ پریس میں بھیجا جاتا۔

ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ابتدا میں کسی دوسرے مُوقر ادیب یا دانشور سے بھی مشورہ کر لیتے۔ یہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اپنے دور کے اکثر اہم دانش وروں، شاعروں اور ادیبوں سے اُن کے قریبی مراسم قائم ہوئے۔ ان کا کوئی ڈراما ایسا نہیں ہے جس پر سر ڈاکٹر محمد اقبال، دتاتریہ کیفی، مولوی عبد الحق یا کسی دوسرے مبلغ روزگار کی رائے شامل نہ ہو۔ ان ہی کوششوں کے دوران اور اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی ایام میں ہی اُن کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ابھی زندگی کا رُخ ہی موڑ کے رکھ دیا۔ خود ڈرامے لکھ کر اسٹیج کرنے کی ابتدا انہوں نے مشہور فرانسیسی ڈرامانگار مولیئر کی کامیڈی "The Shop keeper turned into Gentleman" کو ہندوستانی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

قالب عطا کر سکے گی۔ یہ تجربہ خاصا حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ایک فرانسیسی ٹریجڈی کا مسودہ تیار کر کے اسکی نوک پلک درست کرنے کے لئے اپنے کسی دہلوی دوست کو بھیجا جس نے مسودہ نہیں لوٹایا۔ اس واقعے نے صاحبزادہ محمد عمر کے اندر اس چنگاری کو روشن کیا جس کی وجہ سے انہیں اردو زبان پر استناد کی حد تک عبور حاصل ہو گیا۔ انہوں نے ایک طویل مدت تک لکھنؤ اور دہلی کے مراکز کی خاک چھان کر اس روزمرہ اور محاورہ پر عبور حاصل کر لیا جو اردو زبان کا طرۂ امتیاز ہے۔ خصوصاً بیگماتی زبان پر انہوں نے اس طرح دسترس حاصل کی کہ اپنے ہم عصروں میں سب سے بازی لے گئے۔ ان کوششوں کے بعد پھر انہیں زبان کی اصلاح یا اس کی نوک پلک درست کرانے کی کبھی ضرورت نہ پڑی بلکہ اپنے دور کے ہر بڑے ادیب اور دانشور سے داد و تحسین حاصل کی۔ عمر بھر کی محنت و لگن سے ان دو حضرات نے اردو ڈرامے کو جو سرمایہ دیا اور جن کی معلومات ہم تک پہنچ سکی ہیں ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں:۔

۵۔ **روحِ سیاست:** ابراہم لنکن کی قابلِ تقلید حیات کے پردے میں جذبات عالیہ کی تصویر دکھائی ہے۔ یہ ڈراما جان ڈرنک واٹر کے انگریزی ڈرامے سے ماخوذ ہے۔ اس میں موصوف پر اسلام کے اثرات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس ڈرامے پر موصوف کو حکومت وقت کی طرف سے انعام بھی ملا۔ ریاست کے اسکولوں کے نصاب میں بھی شامل کیا گیا۔ اس ڈرامے سے متعلق جو اشتہار "بگڑے دل" کی اشاعت پر اس کے آخر میں شامل کیا گیا وہ حسب ذیل ہے:۔

"ڈراما روحِ سیاست وہ معرکتہ الآراء کتاب ہے جس نے عالم ادبیات میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ کے زندہ جاوید پریذیڈنٹ ابراہم لنکن کی قابلِ تقلید حیات کے پردہ میں جذبات عالیہ کی وہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تصویریں دکھائی ہیں کہ اسلام کے عہدِ اُولےٰ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ ایک مسیحی روایات ملت بیضا پر عمل پیرا ہو کر کس طرح چار دانگ عالم سے اپنے عزم راسخ و استقلال کے طفیل خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے۔ اردو زبان میں اپنے رنگ کی ایک ہی چیز ہے۔ ریاست کشمیر کے تمام سکولوں کے امتحانوں کے لئے منظور ہوئی ہے اور اسے انعامی کتاب قرار دیا گیا ہے۔

اکابر مشاہیر عہد مثل سر ڈاکٹر اقبال، بھائی پرمانند ایم۔اے، مولوی عبدالغنی ایم۔اے، شیخ نورالدین ایم اے، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نہایت زور سے اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ اور مندرجہ ذیل جرائد نے اس پر دھوم دھامی سے ریویو لکھے ہیں: لاہور۔ زمیندار۔ سیاست۔ ہمدرد۔ کشمیری میگزین۔ بندے ماترم۔ پرتاپ۔ کیسری۔ دلیش۔ رسالہ تحریک شباب اردو"۔

۵۔ جانِ ظرافت: مولیئر، لیسنگ اور مرزا جعفر ایرانی کے ڈراموں کا ملا جلا روپ ہے۔ اسے بھی آزاد ترجمہ ہی قرار دینا چاہیئے۔ اس ڈرامے کے بارے میں "بگڑے دل" کے آخر میں مندرجہ ذیل خیالات درج کئے گئے ہیں:

"ایک تخیل کے بجالت آمیز کارنامے ہنسی دل لگی میں سینکڑوں کام کی باتیں سمجھاتے ہیں۔ اصل کتاب مولیئر سے ماخوذ ہے اور اس میں وہ تمام چٹکیاں مستور ہیں جو جرمنی کے مشہور ڈرامانگار لیسنگ اور فارسی میں ڈراما کے موجد آغا جعفر کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں۔ بہت کچھ باتیں مصنفین کی طبعزاد ہیں۔ غرضیکہ اس زعفران زار کی بالیدگی کیلئے کئی شاداب چمنوں کی خوشہ چینی کی گئی ہے۔ متین اور مہذب ظرافت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کا بہترین نمونہ ہے۔ ریاست کشمیر کے سکولوں کے لئے منظور ہوئی اس کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے کہ عالی جناب سر ڈاکٹر اقبال نے اس کا ڈیڈیکیشن منظور فرمایا۔"

۵۔ **بگڑے دل**: فرانس کے مشہور ڈرامانویس مولئیر کی کامیڈی "مس انتھروپ" کا ترجمہ ہے۔ ڈرامے کے تعارف میں مصنفین نے ۹ اگست سنہ ۱۹۲۲ء کی تاریخ درج کی ہے۔ اس میں تصرف برائے نام ہے۔ اصل کی صرف اُن باتوں کو نظر انداز کیا ہے جس کا مطالعہ ہندوستانیوں کے لئے چنداں دل چسپ نہیں۔

۵۔ **قزاق**: اس ڈرامے کے بارے میں بھی "بگڑے دل" کے آخر میں یہ اشتہار درج ہے:

"جرمنی کے شہرۂ آفاق فلسفی، شاعر اور ڈرامانگار شلر کے ایک دلفریب ڈراما کو ہندوستانی مذاق کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے نشیب و فراز، اعمالِ بد کے مآلِ کار اور محبت کے حقیقی معیار کا مرقع پیش کیا ہے۔ ایڈیٹر رسالہ اردو اس کی زبان کو فصیح اور شاندار تصور کرتے ہیں اور جناب لالہ کنور سین صاحب ایم اے بیرسٹرایٹ لاء، جسٹس ہائی کورٹ کشمیر اسے از حد دل چسپ خیال فرماتے ہیں۔"

۵۔ **ظفر کی موت**: بیلجیم کے مشہور زمانہ ڈرامہ نگار مارس میٹرلنک کی بہترین تصنیف A sister's Love کا ترجمہ ہے۔ اس کے بارے میں بھی مندرجہ ذیل خیالات پیش کئے گئے ہیں:۔

"بیلجیم کے چابک دست اور محیر العقول ڈرامانگار میٹرلنک (جنہیں ڈرامانگاری کے صلہ میں نوبل پرائز ملا ہے) کی ایک سنگلاخ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تصنیف کا سلیس ترجمہ معہ حواشی جس میں ایک بہن کی محبت کا جلوہ دکھا کر اُن جذبات کو نمایاں کیا ہے جو انسان کے دل ہی میں رہتے ہیں اور جن کا اظہار زبان سے نہیں ہو سکتا۔ انہیں جذبات کا اظہار میٹرلنک کی خصوصیت ہے"۔

○ ۔ تین ٹوپیاں : غالباً ڈک کی ایک فرانسیسی فارس (Farce) کا اردو ترجمہ ہے۔

○ ۔ خواب پریشاں : سویڈن کے سربرآوردہ ڈرامانگار سوسیو سٹارین برگ کے ایک فلسفیانہ ڈراما کا ترجمہ ہے۔ یہ ڈراما اُس وقت زیر ترتیب تھا جب اس کا اشتہار "بگڑے دل" میں شائع ہوا۔ معلوم نہیں بعد میں شائع کیا گیا یا نہیں۔

○ ۔ پنچم مدھم : (سات ڈرامے) ۱۹۴۵ء میں پہلی بار یہ مجموعہ شائع ہوا۔ اسے منشی نور الٰہی کے نام معنون کیا گیا ہے جو اُس وقت حیات نہ تھے۔ انتساب کی زبان یہ ہے :۔

"معنون مرحوم رفیق کار منشی نور الٰہی کے نام جنہوں نے اس قلم کو بنایا بھی اور بگاڑا بھی"۔

○ ۔ ڈرامے چند : یہ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

○ ۔ ناٹک کتھا : یہ سنسکرت کے مختلف اہم ڈراموں کے ترجموں پر مشتمل ہے۔ اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے عشرت رحمانی لکھتے ہیں :۔

"مصنفین کی ایک اور قابل ذکر اور انوکھی تصنیف ناٹک کتھا ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کالیداس کے ڈراما شکنتلا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

وکرم اروشی، بھوبھوتی کے ڈراما مالتی مادھو، شودرک کے ڈراما مرچھہ کٹک، بھاس کے وسوادتا، ہرش کی رتناولی اور ولیم شیکسپیئر کے ناٹک مدرار اکھشس کی کہانیوں اور ایک تاریخی کہانی "نگلوری" پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب "Lamb's Tales from Shakespeare" کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ زبان و طرز بیان کے لحاظ سے علامہ کیفی مرحوم نے اسے اردو زبان میں اپنی طرز کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: یہ کتاب اس زبان میں ہے جسے دہلی کی اصطلاح میں نکھار اردو کہتے ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: سحر نگار مؤلفوں نے اخذ و ترجمہ پر ہی بس نہ کی بلکہ اسے اسلوب میں بیحد خوبیاں بھر دیں جن پر اردو کو ناز ہو سکتا ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور سلجھے ہوئے گویا موہن مالا کے مانک موتی ہیں کہ ایک دوسرے کے بعد ڈھلک رہے ہیں۔[۱]

ان کے علاوہ "محبت کی بازی" اور "آ بیل مجھے مار" کے مسوّدے پریس میں بھیجنے کے لئے منشی نور الٰہی مرحوم کی بیوہ کے پاس تھے۔ جانے طباعت کی منزل تک پہنچے یا نہیں۔

مندرجہ بالا ڈراموں میں سے وہ جو راقم کی دسترس میں ہیں اور جن کا مطالعہ میں نے بالاستیعاب کیا ہے، حسب ذیل ہیں:۔

(۱) قزاق　　(۲) پنچم مدھم　　(۳) بگڑے دل

انہیں کے مطالعے نے ان کے فن سے متعلق راقم کو اس رائے تک پہنچایا ہے جو نیچے درج کی جا رہی ہے۔ یہاں چونکہ ہر ڈرامے کے تفصیلی اور الگ الگ جائزے کی گنجائش نہیں ہے اس لئے مجموعی جائزہ ہی پیش کرنے کی

---

[۱] حسن شاہ۔ مشفقین ناٹک ساگر۔ آج کل دہلی (ڈراما نمبر) جنوری ۱۹۵۹ء۔ ص ۵۶

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کوشش کی جا رہی ہے۔

صاحبزادہ محمد عمر (اور منشی نور الٰہی) کے ڈراموں کے مطالعے سے اس کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اُردو ڈرامے سے متعلق آغا حشر کاشمیری کی قائم کردہ روایت سے بہت متاثر تھے۔ انہوں نے جہاں آغا حشر کی طرح یورپی ڈراموں سے ماخوذ و استفادہ کیا وہیں اس کی فنی روایت کا تتبع کرنے کی بھی کوشش کی۔ مثلاً مکالموں کی ساخت ان کے ہاں بھی کم و بیش ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی آغا حشر کے ڈراموں میں ہے یا جیسی آغا حشر کے زمانے تک اُردو ڈراموں میں عام طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یعنی مقفی و مسجع نثر، پرشکوہ الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملے جو آسانی کے ساتھ پُرزور انداز میں ادا کئے جا سکیں اور برمحل اشعار کا استعمال۔ اشعار کے برمحل استعمال میں یہ حضرات آغا حشر سے بھی سبقت لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پلاٹ کی ترتیب اور واقعات کا منطقی ربط بھی اُن کے ہاں اپنے سبھی پیشروؤں سے کہیں زیادہ جاگزیں اور نکھرا ہوا ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ڈرامے کے فن پر اُنکی گرفت اپنے پیشروؤں سے کہیں مضبوط ہے۔ اگرچہ اکثر ڈراموں کے پلاٹ کی ترتیب میں وحدتوں کا خیال نہیں رکھا گیا لیکن اس سے ڈرامے کے مجموعی تاثر میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایسے ڈرامے بھی لکھے جن میں تینوں وحدتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کلاسیکی اصولوں کے عین مطابق المیہ اور طربیہ کو الگ الگ رکھنے کی کوشش کی ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف ڈرامے کے فنی اصولوں سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ ہماری اس دلیل کا ثبوت ان کے ڈراما "قزاق" میں "عرض حال" کے تحت لکھے ان تعارفی کلمات سے ہو جاتا ہے۔ موصوف "قزاق" سے متعلق

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اصول اتحادِ عمل کو مدّنظر رکھ کر ہم نے اس کے ساتھ کا مک کے شمول سے احتراز کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ارباب نظر ایک ڈراما میں دو پلاٹوں کو روا نہ رکھیں گے"۔ (ص - ۱)

یہ وہی اصول ہیں جنہیں ارسطو بوطیقا میں ڈرامے کے فن سے متعلق بحث کرتے ہوئے پیش کرتا ہے مطالعے کی وسعت نے صاحبزادہ محمد عمر کے فن میں خاص طور سے وہ نکھار پیدا کیا جو ان کے معاصرین میں امتیاز علی تاج کے علاوہ اور کسی کے ہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ کچھ ڈرامے البتہ ایسے ہیں جن میں واقعاتی ربط مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ ایسا شاید اس لئے ہوا ہے کہ مصنفین نے ترجمہ کرتے وقت بہت سے حصوں کو یا تفصیلات کو اپنے قارئین کے لئے غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا ہے جس سے ایک خلا کا سا احساس ہوتا ہے۔ ایسی جگہوں کو تخلیقی جوہر سے پُر کیا جانا چاہیے تھا۔ مسجع و مقفیٰ زبان، جس کا ذکر اوپر ہوا کی ایک مثال ان کے ڈراما "قزاق" سے ملاحظہ کیجیے :-

"افسوس میرا کہا نہ مانا۔ چھوٹے بھائی کی باتوں کو حقیر جانا۔ آخر بھائی کا آئینۂ دل چکنا چور کیا۔ باپ کے جگر میں ناسور کیا۔"

یہاں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بعد میں اس طرح کی نثر کا استعمال ان کے ہاں بتدریج کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ موضوعات ماضی کے ڈراموں سے ماخوذ ہونے کے باوجود عصری معنویت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ان باتوں کو خاص طور پر ابھارا جائے جو عصری حقائق کی بہترین عکاسی کرتی ہیں۔ اسی لئے ان کے ہاں جہاں عصری سماجی و اخلاقی مسائل ابھر

ن محمد عمر نور الٰہی ۔ قزاق ۔ طبع اول ۔ المشتہر شیخ مبارک علی تاجر لوہاری دروازہ لاہور، ص: ۶

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کر سامنے آتے ہیں وہیں اُن میں وہ ترقی پسندانہ جوہر بھی پیدا ہو جاتا ہے جو اُن کے دور کی ایک بڑی حقیقت ہے۔ "قزاق" سے ہی ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے جس سے اُن کے ترقی پسند نظریات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ ڈرامے کا ایک قزاق بہادر نواب زادہ "شیر دل" سے مخاطب ہے:-

"بہادر: بے کسوں کی حمایت کا بیڑا اٹھاؤ۔ ظالموں کو ظلم کا مزہ چکھاؤ۔ امیروں کی وہ دولت چھین لو جو محض اُن کے خزانہ کا سنگار ہے۔ اور اُن محتاجوں کو دے دو جنہیں زندگی بسر کرنا دشوار ہے"۔ (ص۔ ۱۳)

انکی حقیقت نگاری کا ایک جامع روپ ہمارے سامنے اُس وقت آتا ہے جب موصوف "بگڑے دل" میں ایک مقام پر دربار داری کے تباہ کُن اثرات کو پیش کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح دربار داری دانشوری کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ زبیدہ یہاں دلشاد کو سمجھاتی ہے کہ وہ اگر چاہے تو اُسے دربار میں جگہ دلائی جا سکتی ہے۔ اس پر دلشاد جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:-

"مگر بیگم، میں دربار میں جا کر بناؤں گا کیا۔ میں طبعاً دربار داری سے گریز کرتا ہوں۔ قدرت نے مجھے وہ دل ہی عطا نہیں کیا ہے جو ایسی فضا میں تڑپ سکے۔ مجھ میں وہ بات نہیں جس کے طفیل دربار میں کوئی کچھ بن سکتا ہے۔ سچ کہنا اور مُنہ پر کہنا میری سب سے بڑی قابلیت ہے۔ جب کسی سے ہمکلام ہوتا ہوں تو اُسے اُلّو بنانے کے لئے اس کی حسب خواہش باتیں نہیں بنا سکتا اور جس شخص میں اپنے خیالات چھپانے کا وصف نہ ہو اس کی حالت دربار جیسی جگہوں میں "اگر ماند شبے ماند" کی مصداق ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اگر دربار سے تعلق نہ ہو تو ہماری وجاہت میں فرق آتا ہے اور خطابات سے محروم رہتے ہیں مگر ایک تسکین دل کو حاصل ہوتی ہے کہ ہر روز گداگری بننے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی۔ آج خندہ پیشانی سے اس کی گالیاں سنو، کل اس کی غزل کی تعریف کرو، شام کے دربار میں کسی فرتوت خاتون کے حسن کی شان میں قصیدہ کہو اور رات کو گھر آؤ تو کسی امیر کی بے معنی تصنیف پر تقریظ لکھو۔ بیگم صاحبہ دربار میں نہ جانے سے ان سب عذابوں سے تو نجات مل جاتی ہے۔"[1]

مختصر یہ کہ انہوں نے اردو ڈرامے کی ترویج و ترقی کے لئے جو خدمات انجام دیں، وہ کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

ڈرامے ترجمہ و تالیف کرنے کے علاوہ ان حضرات نے "اندر سبھا" کی ترتیب کا کام بھی انجام دیا اور اس کا ایک جامع اور محققانہ ایڈیشن تیار کر کے سید امتیاز علی تاج کی نذر کیا جسے انہوں نے سید حمید علی صاحب کے ذریعے لاہور سے چھپوایا۔

اسی طرح "کلیات مولیئر" کا ایک نسخہ بھی انہوں نے تیار کیا، جسے شائع کرنے کے حقوق سنہ ۱۹۲۶ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے حاصل کر لئے تھے لیکن اس کے بعد اس کا انجام کیا ہوا کچھ پتہ نہیں۔[2] یہ کتاب جناب حسن شاہ کی اطلاع کے مطابق دونوں حضرات کی آخری تالیف تھی۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ "ناٹک ساگر" کی تالیف ہے جس کی تدوین

---

[1] محمد عمر نور الہی - بگڑے دل، المشتہر شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور طبع اول ص ۵۸

[2] اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے انجمن سے رابطہ قائم کر رہا ہوں۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کا کام ۱۹۲۱ء میں شروع ہوا۔ یہ عالمی ڈرامے کی تاریخ ہے جس میں دنیا کے اکثر ممالک میں ڈرامے کی روایت اور اہم ڈرامہ نگاروں کی خدمات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہی نہیں اسے اُردو میں ڈرامے پر پہلی تنقیدی کتاب کا شرف بھی حاصل ہے جو پہلی بار ۱۹۲۴ء میں جموں سے شائع ہوئی اور جس پر مؤلفین کو نہ صرف مہاراجہ بہادر پرتاپ سنگھ سے ۲۵۰/- روپے کا انعام ملا بلکہ جس پر ملک کے اکثر رسائل و جرائد میں تعریفی مضامین بھی شائع ہوئے۔ اس کتاب کے مطالعے سے مؤلفین کی وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ ڈرامے کے فن پر ان کے عبور کا بھی کما حقہٗ پتہ چلتا ہے۔ اردو ڈرامے کی تاریخ کی ترتیب کی بھی یہ پہلی سیڑھی ہے۔ اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولوی عبدالحق رسالہ اُردو شمارہ جنوری ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں:-

"......اسی طرح ڈراما ان دونوں صاحبوں کا تکیۂ خیال ہے۔ کوئی مضمون ہو کوئی خیال ہو، وہ یا تو ڈرامے کے متعلق ہوگا یا اس سے ٹکرا کر نکلے گا۔ یہ اسی انہماک کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے دنیا بھر کے ڈراموں کی تاریخ لکھ ڈالی جس میں ہر ملک کے مشہور ڈرامہ نگاروں اور ایکٹروں کے خاص خاص کارنامے، ممالکِ عالم کے اسٹیج کے عروج و زوال کے اسباب اور فنِ ڈراما کی ارتقائی کیفیت بیان کی ہے۔ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس فن پر ایسی جامع حیثیت سے لکھی گئی......... اس سے پہلے کبھی اس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ کسی نے اس مضمون پر بحث نہیں کی تھی۔"[1]

---

[1] حسن شاہ۔ مصنفین ناٹک ساگر۔ آج کل دہلی ڈرامانمبر ا جنوری ۱۹۵۹ء ص-۵۷

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اِس کاوش کو اُردو تنقید میں بھی ایک اضافے کی جگہ دی جانی چاہیئے کیوں کہ اس سے اُس غیر جانبدار تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے جس کی روایت کو مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعے پروان چڑھایا تھا اور جس کو بعد میں اُن کے متبعین نے فروغ دیا۔ اردو تنقید کو آگے بڑھانے کیلئے "ناٹک ساگر" کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے نامور رسائل میں شائع ہوتے رہے اور داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔

صاحبزادہ محمد عمر صرف ڈرامہ نگار اور ایکٹر ہی نہ تھے بلکہ وہ ایک باکمال ڈائریکٹر بھی تھے۔ ان کے اس کمالِ فن کے بارے میں ایک واقعہ سنیئے جسے ڈوگری کے مشہور ادیب جناب وشوا ناتھ کھجوریہ نے مجھے سنایا جو ایک مدت تک خود بھی موصوف کے ڈائریکٹ کیے ڈراموں میں کام کرتے رہے۔ مندر دیوانان جموں میں جہاں مہاراجہ بہادر نے تھیٹر قائم کر رکھا تھا ڈرامہ "ہرلیش چندر" پیش کیا جا رہا تھا جس کی ہدایت کاری کے فرائض صاحبزادہ موصوف ادا کر رہے تھے۔ تھیٹر ایکٹروں کا شراب سے کچھ ایسا گہرا رشتہ ہے کہ اکثر کی یہ عادت بن جاتی ہے کہ وہ بغیر پیئے رول نہیں کر سکتے۔ اس زمانے میں یہ بدعت کچھ زیادہ ہی عام تھی۔ صاحبزادہ موصوف کے اسٹیج تھیٹر میں متعدد حضرات اس لت کے شکار تھے اگرچہ اس کی وجہ سے اُن کے کام میں کبھی کوئی قباحت پیدا نہیں ہوئی۔ اس ڈرامہ (ہرلیش چندر) میں ان کے ایک معتبر رفیق کار لالہ کشن چند کاتیال وشوامتر کا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان کا اور ان کے چیلے کا میک اپ ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں ڈرامہ شروع ہونے والا تھا کہ کسی نے صاحبزادہ موصوف کو اطلاع دی کہ کشن چند کاتیال اتنی زیادہ پی چکے ہیں کہ اُن کا رول ادا کرنا ممکن نہیں۔ وہ فوراً کمرے میں پہنچے دیکھا حالت خراب

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہے ۔ ایک جملہ بھی ٹھیک سے ادا نہیں ہو پا رہا ۔ چنانچہ چشم زدن میں موصوف کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے سب کو کمرے سے باہر نکال کر کمرہ اندر سے بند کر لیا ۔ باہر کھڑے سب حضرات پریشان تھے کہ نہ جانے اب کیا ہو، کچھ لوگ شاید یہ بھی سوچ رہے تھے کہ صاحبزادہ موصوف کشن چند کی خوب درگت بنائیں گے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باہر کھڑے حضرات کو صاحبزادہ موصوف کا یہ جملہ سنائی دیتا: "سمجھ گئے نا" اور جواب میں وہ صرف "ہوں" کہہ کے رہ جاتے ۔ آدھ گھنٹے کے بعد موصوف باہر نکلے اور ڈرامہ شروع ہو گیا۔ سین کے دوران، جب بھی وشوامتر کا مکالمہ آتا تو لالہ کشن چند کا تیال چیلے کے کان کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کے سے انداز میں کچھ کہتے جس کے بعد چیلا اپنا مکالمہ بہ آواز بلند ادا کرتا ۔ سارے منظر میں اسی طرح مائم کے سے انداز میں موصوف نے اپنے مکالمات ادا کئے اور کسی کو کمی کا احساس تک نہ ہوا ۔ شراب کے نشے کی وجہ سے وہ سرگوشی کچھ اس انداز سے کرتے کہ ناظرین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے ۔ وہ سمجھتے یہ اداکاری کا حصہ ہے ۔ ڈرامہ نہایت کامیاب رہا اور عوام ہی نہیں خواص نے بھی، جن کا تعلق دربار سے تھا، اسے بہت پسند کیا ۔ آواز سے ادا کئے جانے والے مکالموں کو بے آواز ادا کروانا اور وہ بھی آدھ پون گھنٹے کی ریہرسل کے بعد یہ انہیں کا کرشمہ تھا جس سے اُن کی باکمال ہدایت کاری کا ثبوت ملتا ہے ۔

ڈرامے اور تنقید کے علاوہ موصوف نے افسانے بھی لکھے اور شاعری بھی کی ۔ وہ جموں میں ہونے والے اکثر آل انڈیا یا مقامی مشاعروں میں شریک ہوتے ۔ جناب شیخ حسین شاہ صاحب ریٹائرڈ ایس پی پولیس کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق اس زمانے میں اکثر مشاعرے ڈوگرہ ہال جموں میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

منعقد ہوتے تھے جن میں صاحبزادہ محمد عمر بھی شریک ہوتے اور اپنا کلام سنا کر سامعین سے داد حاصل کرتے۔ لیا اوقات مشاعرے میں شریک شعراء خصوصاً وہ جن کے درمیان چشمک ہوتی، ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کرتے۔ صاحبزادہ موصوف کی بھی ایک آدھ سے چشمک تھی چنانچہ یہ بھی ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے۔

ان کے افسانے بھی وقتاً فوقتاً ملک کے نامور جرائد میں شائع ہو کر اصحابِ نظر سے خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ موصوف نے اکثر افسانوں میں اپنے دور کے مسائل کو موضوع بنا کر اربابِ حل و عقد کی توجہ کا مرکز بنایا۔ اُن کے متعدد افسانے اگرچہ کہ قابلِ ذکر ہیں لیکن یہاں ان کا صرف ایک افسانہ جس کا عنوان "ضیا پاشی" ہے، مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے بیوپاریوں کی اُن چالوں کو عریاں کیا ہے جو وہ ٹیکس سے بچنے کے لئے چلتے ہیں۔ زبان اگرچہ تھوڑی سی قدیم ہے لیکن طنز کی کاٹ نے اُسے مؤثر بنا دیا ہے۔

صاحبزادہ موصوف صرف نامور ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار اور نقاد ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہترین انسان بھی تھے۔ پُر خلوص، نیک دل اور ہر طرح کے تعصب سے پاک۔ اگر اُن میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو اپنے امیچر کلب کے لئے منجھے ہوئے ایکٹروں کی وہ ٹولی جمع نہ کر پاتے جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے۔ اُن کے رفقائے کار کے نام حسبِ ذیل ہیں:-

لالہ دینا ناتھ (اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری)، لالہ رام کشن (اکونٹس آفیسر) لالہ کشن چند کاتیال (اسسٹنٹ فارن سیکرٹری) اور شیو ناتھ کھجوریہ وغیرہ۔

اُن کی اس انسان دوستی اور سیکولر شخصیت سے متعلق اظہارِ خیال کرتے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوئے جناب وشنو ناتھ کچھو ریہ بتاتے ہیں کہ صاحبزادہ محمد عمر ایک بہت ہی پیاری شخصیت کے مالک تھے۔ جو بھی شخص ایک بار اُن سے مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس زمانے میں جب فرقہ واریت کے اثرات زیادہ گہرے تھے ایک ایسی ٹولی بنا لینا جس میں زیادہ تعداد غیر مسلموں کی ہو، کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کی شخصیت میں اگر یہ جوہر نہ ہوتا تو وہ امیچر ڈرامیٹک کلب بنا پاتے اور نہ اس کی قیادت ہی کر سکتے۔ کچھو ریہ صاحب مزید بتاتے ہیں کہ اُنکی جب بھی صاحبزادہ موصوف سے ملاقات ہوتی، وہ اُنہیں بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے۔ ڈرامے کی پیشکش کے دوران اگر کسی کو غیر معمولی کامیابی نصیب ہو تو اُسے بہت سراہتے۔

صاحبزادہ محمد عمر کی شخصیت ایک روشن مینار کیطرح تھی جس سے ان کے اکثر رفقاء و معاصرین نے روشنی حاصل کی۔ خصوصاً ریاست میں علمی و ادبی فضا کو برقرار رکھنے اور اُسے مزید تقویت پہنچانے میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے انہیں ادب کی کوئی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ •

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نشاط انصاری

غلام احمد کشفی

جنتِ خیابانِ کشمیر نے اپنے زُمرّدی سینے پر ماضی بعید سے ہی ایسے نظر نواز اور مہک زار پھول یہاں دُور دُور تک کھلا دیئے ہیں جن کی رنگینی اور مہکار نے وادیٔ کشمیر کو جہاں داماں باغبان اور کفِ گُلفروش بنا کے رکھ دیا ہے وہاں ایسے اہل خلقیہ عطر جہانگیری ہونے کی سعادت بھی عطا کی ہے۔ ان ہی اور ایسے ہی پھولوں کی ادبی بہار نے ہماری جنت نظیر وادی کو اپنی بھرپور رعنائی سے قطع نظر علمی و ادبی سطح پر ہم پلۂ ایران بنا کے رکھا ہے۔

زمین چمن وادیٔ کشمیر کے ان ہی مہکتے ہوئے زنگار رنگ پھولوں میں ایک خوش آیند کنول کشمیر کے شمال و مغرب کی جانب جھیل وُلر کے شمالی کنارے پر واقع ایک مردم خیز خطّے بانڈی پورہ کے ایک چھوٹے سے مگر خوبصورت گاؤں "داچھی گام" میں آج سے لگ بھگ اسّی سال قبل ایک ایسے گھرانے میں کھل اٹھا، جہاں علم و ادب کی شمعیں فروزاں تو نہیں تھیں، پر کرمک شب تاب کی مانند ایک کھاتا پیتا زمیندار محمد سلطان میر دو وقت کی روٹی کے معاملے میں خود

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کفیل تھا۔ اُس دور میں کھاتے پیتے گھرانوں میں ہی بچوں کو مروجہ عربی فارسی تعلیم دلوائی جاتی تھی۔ اس سطح سے نیچے زندگی بسر کرنے والے گھروں کے بچے تعلیم و تربیت کے معاملے میں کورے کے کورے ہی رہا کرتے تھے۔

واچھی گام کے دہقان زادہ محمد سلطان میر نے اپنے زمانے کے رواج کے مطابق عربی اور فارسی کی رسمی تعلیم اپنے پاس پڑوس میں ہی پائی تھی۔ اسی دیہاتی کی امیدوں کے مرکز اور آنکھوں کی ٹھنڈک غلام احمد میر کشفی نے اپنے والد کی آرزوؤں کے مطابق آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے ایک معرکہ جیسا سر کر لیا۔ یہ اس وقت کے ماحول کا تذکرہ ہے جس میں کسی دیہاتی کا آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنا کوہ بے ستون کاٹ کر جوئے شیر لانے کے مترادف تصور ہوتا تھا۔ اس دور میں شہروں سے قطع نظر دیہات کے اندر چونکہ ایلوپیتھی علاج و معالجہ کا کوئی رواج یا دستور تھا نہیں، اس لئے گاؤں گاؤں یونانی طب جاننے والا وہی شخص مریضوں اور بیماروں کا علاج دیسی طریقوں پر کیا کرتا تھا جسے عربی فارسی کی تھوڑی بہت تعلیم ہوا کرتی تھی۔ اس لحاظ سے واچھی گام کا محمد سلطان میر بھی اپنے گاؤں میں آبائی پیشہ کے علاوہ طبابت کی تھوڑی سی مہارت رکھتا تھا۔ اس توسط سے وہ اپنے گاؤں میں اچھی خاصی شہرت کا مالک بھی تھا۔

اپنے مسلک کے اعتبار سے محمد سلطان میر قادیانی مرزائی تھا۔ اسی خاص جذبے سے اس دیہاتی نے اپنے بیٹے غلام احمد کشفی کو مڈل پاس کروانے کے بعد قادیان روانہ کیا تاکہ اس کا بیٹا وہاں کچھ مدت رہ کر مرزائی مسلک کی مبادیات کی تحصیل کے علاوہ اس مسلک کے اصولوں اور مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات سے پوری آگہی پا کر اس مکتبِ فکر پر حاوی ہو سکے۔ اپنے قیام قادیان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کے دوران کشفی نے وہاں عربی زبان میں مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں فارسی میں منشی فاضل اور اردو میں ادیب فاضل کے امتحانات یکے بعد دیگرے پاس کر لیے۔ یوں سلطان میر کے ہونہار بیٹے غلام احمد کشفی نے قادیان میں رہنے کے دوران عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اپنی بساط کے مطابق مہارت حاصل کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کی بھی تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی۔ آج سے ساٹھ ستر سال قبل کسی دیہاتی نوجوان کا علوم شرقیہ کی یہ تینوں ڈگریاں حاصل کرنا کارے دارد والا معاملہ سمجھنا ایک بدیہی امر تھا۔ اس لحاظ سے کشفی نے واقعی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب وادیٔ کشمیر میں مرزائیوں کا خوب طوطی بول رہا تھا اور اسی مکتب فکر کے امام مولوی عبداللہ کافی اثر و رسوخ کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ کشفی چونکہ انہی کے خاص پیروؤں میں سے تھے اور جب وہ شرقی اسناد کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد قادیان سے واپس لوٹے تو یہاں پہنچکر ان کو سرکاری نوکری حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی اور مولوی عبداللہ کی مساعی جمیلہ سے ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کے آس پاس ان کا تقرر گورنمنٹ سری پرتاپ اسکول سرینگر میں عربی مدرس کی حیثیت سے ہوا۔

۱۹۳۱ء کے دوران جب کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے خلاف شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی تو اس تحریک کے ساتھ ہر پڑھے لکھے کشمیری نوجوان کا اگر بعلم کھلا نہ سہی، بلاواسطہ اور چوری چھپے اور خاص کر ایک سرکاری ملازم کا وابستہ ہوجانا ایک قدرتی بات تھی۔ کشفی بھی باہر کی ہوا دیکھ کر آئے تھے، لہذا وہ بھی اپنے دل میں کشمیریوں کی آزادی کا جذبہ رکھتے تھے۔ اس لیے وہ مرزائیوں کے اخبار 'اصلاح' جو ان دنوں سرینگر سے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

شائع ہوا کرتا تھا، میں فرضی ناموں سے اپنے مضامین وغیرہ شائع کروانے لگے۔

۱۹۳۱ء کے بعد جب یہاں تحریک آزادی اپنے پورے شباب پر تھی تو اس تحریک نے ساری ریاست کو متاثر کر کے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے نتیجے میں نیشنل کانفرنس کے لیڈر اور دوسرے سرگرم کارکن مہاراجہ کی مطلق العنان حکومت کے خلاف آواز اٹھانے اور کشمیر کی آزادی چاہنے اور مانگنے کی پاداش میں جیلوں میں بند کئے جاتے رہے۔ عام گرفتاریوں کا یہ سلسلہ جب بڑھ چکا تو نیشنل کانفرنس کا آفیشل آرگن اخبار 'خدمت' قریب قریب بند ہونے کو آیا، اس لئے کہ اس اخبار کے چلانے والے بھی دھر لئے گئے تھے۔ یہ دیکھ کر نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں انکی تنظیم کا اخبار 'خدمت' سرکاری عتاب کا شکار ہو کر بند نہ ہو جائے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکریٹری مولانا محمد سعید مسعودی نے مظفر آباد جیل سے اپنے ایک سیاسی کارکن ساتھی علی محمد بٹہ کو خط لکھ کر ہدایت کی کہ وہ غلام احمد کشفی کو سرکاری ملازمت سے چھڑوا کر اخبار 'خدمت' کی ادارت سنبھالنے کے لئے آمادہ کرائیں۔ علی محمد بٹہ کے کشفی کے ساتھ اگرچہ مراسم تھے بھی مگر اس نے اس کام کے لئے حبہ کدل (سرینگر) کے علی محمد بک سیلر، جو مرزائیوں کے حلقوں میں کافی اثر و رسوخ کے مالک تھے، کے ذریعہ ہی کشفی کو اخبار 'خدمت' کی ادارت قبول کرنے اور محکمہ تعلیم کو خیرباد کہنے پر آمادہ کر لیا۔ یوں علی محمد بٹہ اور علی محمد کتب فروش کی کوششوں سے غلام احمد کشفی کو سررشتۂ تعلیم سے نکلوا کر اخبار 'خدمت' کے دفتر پر پہنچایا گیا جہاں اسے اخبار خدمت کی ادارت سونپی گئی۔ میر غلام رسول نازکی کے بیان کے مطابق یہ سنہ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

غلام احمد کشفیؔ کی فطری قابلیت اور ذہانت و متانت سے اخبار خدمت میں بہت جلد نکھار پیدا ہوا۔ حالانکہ اس سے پیشتر کشفیؔ کو صحافت یا جرنلزم کا کوئی بھی تجربہ نہ تھا مگر اس نے اپنی چابکدستی سے اسے چار چاند لگا دئے۔ اخبار 'خدمت' میں ایک کالم 'انکشافات کشفی' ان ہی کی اُپج سے چھپنا شروع ہوا جو اپنی معنویت کے لحاظ سے دیکھتے ہی دیکھتے عوام اور خواص میں اسی طرح مقبول ہوا جس طرح کہ ہمارے آج کے دور میں خواجہ ثناء اللہ بٹ مدیر روزنامہ "آفتاب" کا "خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے" والا کالم ہر دل عزیز ہو چکا ہے۔ اس طرح سے غلام احمد میر اپنے اس خاص کالم سے ادبی حلقوں میں کشفیؔ کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ کالم چونکہ فکاہیہ انداز میں ہوا کرتا تھا۔ اس لئے اخبار خدمت کا رنگ نکھر آنا ایک فطری بات تھی۔

کشفیؔ کی حیات اور ادبی کارناموں سے متعلق راقم کو ۹ر جون ۱۹۸۸ء کو اُن ہی کے ایک دوست اور ہم عصر میر غلام رسول نازکیؔ جو اصل میں بانڈی پورہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، کے دولتکدہ پہ بات چیت کرنے کا موقعہ ملا۔ علاقہ بانڈی پورہ کی مردم خیز مٹی نے مولوی غلام رسول شیوہؔ، مورخ حسن شاہ کھوہامیؔ، عبدالاحد نادمؔ، شیخ غلام جیلی بلبلؔ، میر غلام رسول نازکیؔ اور غلام احمد کشفیؔ کو جنم دے کر ان کے ہاتھوں تاریخ، نعت نگاری، شاعری اور صحافت وغیرہ ایسے ادبی اصناف کی ژولیدہ زلفوں کو سنوارنے کا ادبی فریضہ انجام دیا۔ نازکیؔ صاحب نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ کشفیؔ ایک کامیاب صحافی تھے، منجھے ہوئے ذہن کے مالک تھے اور ایک اخبار کو عوام میں دلچسپ بنانے کے رموز پہ گہری نظر رکھنے والے شخص تھے۔ نازکیؔ صاحب نے کہا کہ انہوں نے ایک دن "میں ابھی مرنا نہیں چاہتا" کے عنوان سے ایک مضمون انہی کے اخبار خدمت میں چھپوایا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کئی ایک دنوں کے بعد مضمون ہذا کے جواب میں تنہا انصاری (مرحوم) کا "میں ابھی مرنا چاہتا ہوں" فکاہیہ مضمون 'خدمت' میں آیا۔ علاقہ بانڈی پورہ کے ہی شیخ غلام علی بلبل نے دوسری طرف سے "آپ مرتے کیوں نہیں" کے عنوان سے اپنا مقالہ چھپوایا۔ ان تینوں ہم عصر ادباء اور خاص کر دوستوں کے انداز فکر میں یہ ایک قسم کی کنٹروورسی تھی اور اسے حل کرنے کے لئے خود اخبار خدمت کے مدیر غلام احمد میر کشفی نے "چند دوست موت و حیات کی کشمکش میں" کے عنوان سے ایک زوردار فکاہیہ مضمون بڑے طمطراق کے ساتھ چھپایا۔ نازکی صاحب کا کہنا ہے کہ ہم تینوں دوستوں کی تحریر اور مواد کے مقابلے میں کشفی کا مضمون متوازن بھی تھا اور ادب پارہ بھی۔

غلام احمد میر کشفی کے ایک ہم عصر اور ہم علاقہ حاجی محمد اکبر میر، ریٹائرڈ رینج آفیسر آف واچھی گام، راقم کے نام اپنے ایک خط مرقومہ ۱۸ ؍ جون ۱۹۸۸ء میں لکھتے ہیں:-

"کشفی نے کوئی شاعری نہیں کی کیونکہ وہ سہل پسند آدمی تھے۔ اس لئے اس خارزار سے ہمیشہ اپنا دامن بچاتے رہے۔ لہٰذا اُردو یا کشمیری میں ان کا شاعری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور نہ کسی شاعر سے متاثر ہونے کا۔ ہاں مضامین اور مقالے لکھ لینا ان کا شغل تھا لیکن صرف اخباروں کے لئے۔ اس لئے ان کی کوئی تصنیف نہیں۔ "آزاد کشمیر" میں کوئی کتاب تصنیف کی ہو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

لیکن ایک پاکستانی ادیب سلیم خان گمی اپنی تصنیف "کشمیر ثقافت و ادب" کے "خیابان خیابان" (ادبیات) باب میں صفحہ نمبر ۸۴ پر غلام احمد کشفی کے بارے میں اس طرح لکھتے ہیں:-

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

"میر غلام احمد کشفیؔ نہ صرف شاعر بلکہ صاحب طرز صحافی اور تمثیل نگار بھی ہے۔ اُس کے پُر جوش ترانے "آزاد کشمیر ریڈیو" مظفر آباد اور تراڑکھل سے اکثر نشر ہوتے ہیں۔ وہ ۱۵ ر جنوری ۱۹۱۱ء کو تحصیل ہندواڑہ، ضلع بارہمولہ کے ایک گاؤں "زرحمہ گام" میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۱ء سے عملی طور پر تحریک آزادیٔ کشمیر سے وابستہ ہے۔ آج کل وہ "آزاد کشمیر ریڈیو تراڑکھل سے منسلک ہے"۔

سلیم خان گمی اوپر بیان کردہ سٹیٹمنٹ کہ "میر غلام احمد کشفی نہ صرف شاعر بلکہ... الخ کی خود ہی کتاب کے دوسرے باب "گل تازہ" اہل کشمیر اور اُردو زبان" صفحہ نمبر ۲۷ پر ان کے شاعر ہونے کی نفی کر کے لکھتے ہیں:۔

"اس وقت کشمیر کے کئی سپوت اپنے اپنے حلقۂ اثر میں شاعری تمثیل نگاری، افسانہ نویسی اور صحافت کے میدان میں اُردو زبان کی قابل قدر خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

میر غلام احمد کشفیؔ (صحافی و نثر نگار) راولپنڈی"

میر غلام رسول نازکی نے بھی یہی باتیں راقم سے کہیں۔ ان کی دانست میں کشفیؔ نے اپنے قیام کشمیر کے دوران کبھی شاعری نہ کی اور نہ وہ شاعر تھے۔ ہاں ایک کامیاب صحافی ضرور تھے۔ نازکی صاحب نے راقم کو یہ بھی بتا دیا کہ ملک تقسیم ہونے کے بعد جب یہاں شخصی حکومت کے خاتمے کے بعد عوامی حکومت قائم ہوئی اور ۱۹۴۸ء کے دوران ریڈیو کشمیر کی بنیاد ڈال دی گئی تو کشفیؔ نے ریڈیو کی ملازمت میں آنے کی زبردست کوششیں کیں مگر اُن کی ہر کوشش کو مولانا محمد سعید مسعودی نے شاید اس کے مزاجی ہونے کی بنا پر پس پردہ رد کرنا کام بنا دیا اور وہ بد دل

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہو کر پاکستان بھاگ گئے جہاں وہ مظفر آباد کے ریڈیو سٹیشن سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے کچھ مدت کے بعد کشفیؔ کی داچھی گام والی پہلی بیوی کو نازکی صاحب نے ہی نبہ جی کی سفارشوں سے راولپنڈی بھجوا دیا۔

حاجی محمد اکبر میر آف داچھی گام کشفیؔ کے یہاں سے پاکستان بھاگ جانے کی وجوہات کے بارے میں راقم کے نام اپنے مذکورہ ایک خط میں مزید لکھتے ہیں:-

"ہندوستان تقسیم ہونے کے بعد جب لیڈران کرام رہا ہو کر تشریف لائے تو جناب کشفیؔ کیخلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ اِدھر سے مرزائیوں کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا۔ آخر کار کشفیؔ صاحب نے تنگ آ کر اپنی ٹوٹی ہوئی سائیکل اور بستر کشمیر گیسٹ ہاؤس لال چوک کے اس چھوٹے سے کمرے میں رکھ کر راتوں رات بونڈری کراس کر لی جس میں وہ رہتا تھا اور "آزاد کشمیر" ریڈیو میں ملازمت حاصل کر لی، اور وہاں ہی ریٹائر ہو گئے۔ اب بینائی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ بڑی کس مپرسی کی حالت میں دن گذار رہے ہیں"۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد جب یہاں عوامی حکومت قائم ہوئی تو شیخ محمد عبداللہ (پرائم منسٹر) نے ۱۹۴۸ء کے دوران مڈل کلاسوں کے نصاب کو بدلنے اور نئی درسی کتابیں تیار کروانے کے پیش نظر ٹیکسٹ بک ایڈوائزری بورڈ کا قیام اپنی ہی سربراہی میں عمل میں لایا۔ ناظم تعلیمات اسد اللہ کاظمی اس کے وائس چیرمین مقرر کئے گئے اور صاحبزادہ حسن شاہ سیکرٹری۔ فیصلہ یہ لیا گیا کہ باہر کے مصنفین کے بدلے مقامی ادبائے مصنفین سے ہی مڈل کلاسوں کی یہ درسی کتابیں تیار کروائی جائیں۔ چنانچہ الگ الگ مضامین کے لئے پینل آف آتھرس تشکیل دئے گئے اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اُردو کے لئے پروفیسر بی۔ڈی مل شرما، تنہا انصاری مرحوم، میر غلام رسول نازکی، پریم ناتھ پردیسی مرحوم اور غلام احمد کشفی کا پینل آف آتھرس بنایا گیا اور اس پینل نے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لئے "چشمۂ فیض" کے نام سے تین ریڈرس تیار کر لئے۔ کشفی سرحد پار رہتے ہوئے بھی اس کام کے بارے میں مزید تفصیلات حاصل کرنا چاہتے تھے اور شاید معاوضہ بھی۔ ان پانچ مصنفین کو جب ستمبر ۱۹۴۹ء میں ۱۳۲ روپے ۶ آنے فی کس کے حساب سے معاوضہ ادا کیا گیا تو اس وقت کشفی کشمیر سے بھاگ کر پاکستان پہنچ چکے تھے۔ اس واقعہ کے تیرہ سال بعد ۱۹۶۲ء میں کشفی نے راولپنڈی سے ذاتی لیٹر پیڈ پر اپنے دوست تنہا انصاری کے نام ٹیکسٹ بک ایڈوائزری بورڈ کے معاوضہ سے متعلق جو خط لکھا، وہ یہ ہے:-

G.A. Kashfi,
H.A. H.U. OT
Ex- Editor,
The daily 'KHIDMAT'

Purana Qilla,
RAWALPINDI
30. 7. 1962.

محترمی تنہا صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت ہوئی آپ کو خط لکھنا چاہتا تھا لیکن ایڈریس معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔ اب بڑی جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ آپ ٹیچرس ٹریننگ سکول سوپور میں ہیں خدا کرے یہ درست ہو۔ خیر تو قصہ یہ ہے کہ ہم نے مل کر اردو کورس چشمۂ فیض مرتب کیا تھا۔ آپ تو اس کا فیض اٹھاتے رہے اور میں ابھی تک محروم ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے کچھ معلومات کی ضرورت ہے جن سے نہ تو آپ پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ آپ کی حکومت پر۔ میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

نے اس سلسلہ میں اپنے ایک عزیز اور آپ کے ہم پیشہ دوست کو لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں جتنی مفید معلومات آپ بہم پہنچا سکتے ہیں، وہ دوسروں سے امید ہے نہ توقع۔ اس لئے معروض خدمت ہوں کہ اگر آپ براہ راست یا اس بارہ میں میرے ساتھ خط و کتابت کرنے میں کچھ قباحت محسوس نہ کریں تو جالی صاحب کو اس سلسلہ میں پوری پوری مدد دیں اور ایسی مصدقہ رپورٹ بہم فرمائیں جن سے میں اپنا حق مانگنے کے قابل ہو سکوں۔ میری طرف سے تمام آشنا صورت احباب کی خدمت میں سلام مسنون۔ اگر خط کا حوصلہ افزا جواب ملا تو شاید اس سلسلہ کو جاری رکھنے کی صورت بندھ جائے

مخلص دیرینہ
کشفی۔"

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بلدیو پرشاد شرما

پنڈت گنگا ناتھ شرما

جموں کی کنڈی نے جہاں بڑے بڑے بہادر اور نامی سپاہی پیدا کیے، وہاں اس نے پنڈت گنگا ناتھ شرما جیسے کئی نامی گرامی اہلِ قلم اور صحافی بھی پیدا کیے۔ پنڈت گنگا ناتھ شرما بی۔ اے کا شمار جموں کے اہلِ قلم حضرات کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔

پنڈت گنگا ناتھ جی کے ساتھ "بی۔ اے" کا لقب ایسے جڑا ہوا تھا جیسے کسی شاعر کا تخلص ہو۔ اور حق تو یہ ہے کہ وہ پرنس آف ویلز کالج جموں کے اوّلین گریجویٹوں میں سے تھے اور اسی لقب سے ہی اُس پنڈت گنگا ناتھ شرما کی نشاندہی ہوتی ہے جو اس مضمون کا موضوع ہیں۔

پنڈت گنگا ناتھ جی کا جنم ۱۸۹۵ء میں تحصیل ہیرانگر کے ایک چھوٹے سے گاؤں گگھوال میں ہوا۔ آپ کے والد بزرگوار پنڈت کھوجو رام سنسکرت کے بڑے ودوان تھے اور سرگباشی مہاراجہ پرتاپ سنگھ جی نے اُن کو اپنے دربار میں شریمد بھگوت گیتا کا پاٹھ سنانے کے لئے مامور کر رکھا تھا۔ اس طرح پنڈت

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

گنگا ناتھ بھی کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ محلات میں جایا کرتے اور ان کو شروع سے ہی راج دربار کے جاہ و حشمت کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔

ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل سکول پکی ڈھکی اور شری رنبیر ہائی سکول جموں میں حاصل کرنے کے بعد پنڈت گنگا ناتھ جی نے پرنس آف ویلز کالج جموں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سنہ ۱۹۱۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے لاء کالج لاہور میں داخلہ لیا مگر مالی مشکلات کے باعث آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ طالب علمی کے دوران انہوں نے انگریزی کے علاوہ فارسی، سنسکرت، ہندی اور اردو زبانوں پر کافی عبور حاصل کر لیا اور عمیق مطالعے اور مشاہدے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

لاہور سے واپسی پر پنڈت گنگا ناتھ جی نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ شاہی دربار میں رسائی تو تھی ہی لہٰذا انکی تعلیمی قابلیت اور ذہانت کے پیش نظر مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے انہیں اپنے پرائیویٹ دفتر کے کانفڈینشل سیکشن میں بطور ہیڈ کلرک مامور کر دیا۔

اسی زمانہ میں لالہ ملک راج صراف نے ہفتہ وار "رنبیر" جاری کر کے جہاں عوامی مسائل کی ترجمانی کرنے کا بیڑا اٹھایا وہاں ریاست کے قلم کاروں کو اپنے خیالات کی اشاعت کا ذریعہ بھی فراہم کیا۔ "رنبیر" کے نامہ نگاروں میں چند سرکاری ملازم بھی تھے جو خفیہ طور پر خبریں وغیرہ لکھا کرتے تھے ان میں پنڈت گنگا ناتھ جی کا نام پیش پیش تھا۔ اس طرح سنہ ۱۹۲۴ء میں اخبار "رنبیر" کے جاری ہوتے ہی پنڈت گنگا ناتھ جی نے لالہ ملک راج صراف کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور اُن کے مضامین اور خبرنامے "رنبیر" میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی وفات پر ان کے پرائیویٹ دفتر کا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کافی عملہ تخفیف میں لایا گیا۔ پنڈت گنگا ناتھ جی کو ریاست کی وزارت امور خارجہ میں انڈر سیکریٹری کا عہدہ دیا گیا مگر پنڈت جی کے دل میں عوام کی خدمت کے جذبہ نے وہ جوش مارا کہ انہوں نے سرکاری ملازمت چھوڑ کر اخبار نویسی کے پیشے کو اپنا لیا اور اخبار "رنبیر" کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۳۶ء کے اخبار "رنبیر" میں ناظرین سے ان کا تعارف لالہ ملک راج صراف نے ان الفاظ میں کروایا:-

"پنڈت گنگا ناتھ جی شرما بی۔ اے "رنبیر" کے جائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں۔ پنڈت صاحب کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ نہ صرف ریاست اور رعایا ریاست کے حقیقی وفادار اور پورے خیرخواہ ہیں بلکہ خدمت انسانی کا جذبہ بھی آپ کے شدھ ہردیہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ جو کہتے ہیں کر دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ہر بات میں اثر ہوتا ہے"۔

منشی پریم چند کی طرح پنڈت گنگا ناتھ جی کے دل میں عوام کی ناگفتہ بہ حالت اور خاص کر عورتوں کی زبوں حالی کے خلاف جو جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اس کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنا کر آپ نے کئی مضامین اور افسانے لکھے جو اخبار "رنبیر" اور بعد میں اخبار "چاند" کی زینت بنتے رہے۔

اخبار "رنبیر" میں چھپے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:-

"اس وقت رعایا جموں و کشمیر کی سوشل حالت ناگفتہ بہ ہے۔ بھلا جس ملک میں معصوم کنیاؤں پر ظلم ڈھایا جاتا ہو، جہاں دو دو برس کے کمسن بچوں کو بیاہ دیا جاتا ہو، جہاں لڑکیوں کو

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

مثلِ حیوان فروخت کیا جاتا ہو، جہاں زر کے لالچ میں والدین اپنی نابالغ لڑکیوں کی شادی پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھے لنگوروں سے کر دیتے ہوں، جہاں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں یتیم بچے آہ و نالہ و زاری کر رہے ہوں اور موت کو زندگی پر ترجیح دے رہے ہوں، وہ ملک اور اس میں بسنے والے لوگ کب ترقی کر سکتے ہیں؟"

پنڈت گنگا ناتھ جی اردو افسانہ نگاری کا شوق بھی رکھتے تھے۔ آپ کا ایک افسانہ "گوداوری کی آخری تمنا" سنہ ۱۹۲۷ء میں قسط وار اخبار "رنبیر" میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانہ میں پنڈت جی نے ایک کم سن اور سادہ لوح بہو پر ساس کے ذریعہ ڈھائے گئے مظالم کا دردناک منظر پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"پاپن ساس کی مار پیٹ سہنے کے لئے اب گوداوری ہی اکیلی گھر میں رہ گئی تھی۔ ہر روز گالیوں کی وہ بوچھاڑ ہوتی کہ بیچاری کا جگر چھلنی ہو جاتا۔ مگر یہ سلیقہ والی باحیا دلوی سب کچھ چپ چاپ سنتی اور دل کی بھڑاس تک نہ نکالتی۔ اپنی ساس کے طعنے سہنے کے باوجود بھی وہ اس کی دلجوئی کی کوئی کسر باقی نہ رکھتی۔ صبح اٹھتی گھر میں جھاڑو لگاتی، پانی بھرتی، جھوٹے برتن صاف کرتی، چرخہ کاتتی، گائے بھینسوں کو چارہ ڈالتی اور شام کو جب ساس کھاٹ پر لیٹتی تو پاؤں سہلاتی، لیکن گوداوری کی سب باتیں گویا وہ دودھ تھا جو ناگن ساس کے حلق میں اترتے ہی زہر بن جاتا تھا۔ گوداوری کی زندگی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اس نازک بیل کی مانند تھی جسے کسی ناداں مالی نے باغ کی کیاری سے اکھیڑ کر کسی ایسی جگہ لگا دیا ہو جس کے دامن میں ٹھنڈے پانی کی ندی تو بہتی ہو لیکن اس کا بیل کی جڑوں کو تراوت پہنچانا ناممکن ہو۔ ساس کی گھرکیوں اور جھڑکیوں نے اس نازونعمت میں پلی ہوئی باحیا لڑکی کے دل کی کلی کو مرجھا دیا۔ سب سے زیادہ صدمہ اس غریب کو اس وقت پہنچا جب اس کی ساس بات بات کا بہانہ لے کر اس کے ماں باپ کو کئی کئی پیڑھیوں تک پُن پُن کے رکھ دیتی"۔

پنڈت گنگا ناتھ شرما کا ایک مضمون بہ عنوان "تصویر دیکھ کر" اخبار چاند جموں کے ۱۱ جنوری ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ یہ مضمون جہاں اردو ادب کا ایک بہترین نمونہ ہے وہاں اس میں پنڈت جی کے دل و دماغ پر عارفوں اور صوفیوں کے کلمات کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ اس کے چند اقتباس ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہوں گے:۔

"میرے کمرہ میں ۱۹۶۴ء کا ایک کیلنڈر آویزاں ہے جس کو ایک خوش رنگ، خوش شکل، خوش پوش، خوش اندام انگریز شیرخوار بچہ کی عکسی تصویر اس دلاویزی سے مزین کئے ہوئے ہے کہ بقول اقبال ؎

نظارہ کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

معصومیت کی پاکیزگی، حسن کی شگفتگی، مسرت و شادمانی کی آسودگی کا یہ روح نواز مرقع بجھے ہوئے دلوں میں اپنی مسکراہٹ سے از

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سرنوِ نازگی اور تابندگی کی ضیا پاشی سے محبت، سرور اور جوش و اُمنگ کی موجیں اُبھارتا ہے۔ اس صورت جلال و جمال پر اگر حضرت غالبؔ ایک نظر دیکھ لیتے تو اُن کے قلم سے زیرِ منت یہ شعر نہ ہوتا ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اور نہ ہی ڈاکٹر اقبالؔ کے تخیل میں یہ تصور پرواز کرتا ؎

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف زندگی کا جب دل ہی بُجھ گیا ہو

یہ بچہ ایک پُربہار گلستان میں جلوہ گر ہے اور اس کے پس منظر میں گلاب کی سبز پتیوں سے لدی ہوئی شاخ پر ایک شگفتہ پھول اپنے ارغوانی رنگ، نزاکت اور عطر بیزی سے تصویر کی دلاویزی کو دوبالا کر رہا ہے۔ جب میں اس نورانی شبیہہ سے آنکھیں چار کرتا ہوں تو اس کی مسکراہٹ کی تجلی میں ایسا کھو جاتا ہوں کہ میری خاکی کثافتیں لطیف ہو کر روحانی لطافت کا ایک پُرنور پرتو بن جاتی ہیں اور میرے مُنہ سے بے اختیار یہ شعر نکلتا ہے ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طُور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

پنڈت گنگا ناتھ جی نے "ریاست جموں و کشمیر۔ پہلے اور اب" کے عنوان سے مہاراجہ ہری سنگھ کے اوائل برسوں تک ریاست کی تاریخ بھی قلمبند کی تھی جو کافی عرصہ اخبار "رنبیر" میں سلسلہ وار شائع ہوتی رہی۔ اس تاریخ کے جملہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حقوق پنڈت گنگا ناتھ جی نے اپنے پاس محفوظ رکھے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ کتابی شکل میں چھپ کر منظر عام پر نہ آسکی۔

پنڈت گنگا ناتھ جی بچپن سے ہی گاندھی بھگت تھے۔ وہ ہمیشہ کھادی کے کپڑے پہنتے تھے اور اپنے مضامین میں بھی گاندھی جی کے آدرشوں کا پرچار کرتے تھے۔ ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:-

" مہاتما گاندھی جی نے خوب کہا ہے کہ میرے لئے یہ خیال کرنا ناممکن ہے کہ کوئی زمانہ ایسا آجائے جبکہ دنیا سے امیری اور غریبی کا سوال اُٹھ جائے لیکن میرے لئے یہ خیال کرنا بھی ناممکن ہے کہ ایسا زمانہ کبھی نہیں آسکتا جس میں امیر و غریب آپس میں پریم اور ہمدردی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکیں اور ایک دوسرے کے سچے غمگسار نہ ہو سکیں "۔

مہاتما جی کے ان خیالات کا پرچار کرتے ہوئے پنڈت گنگا ناتھ جی نے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کیا ہے:-

" زمانہ حال کے اس دیوتا کی باتیں صداقت سے پُر اور اُن کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہیں۔ اس لئے جب تک ہماری دلی بیماریاں یعنی تنگدلی حسد، تکبر، حقارت، سہل انگاری وغیرہ دُور نہ ہوں گی، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا سکیم بھی ہمیں دُکھوں سے چھٹکارا نہ دلا سکے گا "۔

پنڈت گنگا ناتھ جی نے بھی لالہ ملک راج صراف کے ساتھ اخبار نویسی میں بہت اُتار چڑھاؤ دیکھے اور دلیرانہ طور سے تمام مشکلات کا مقابلہ کیا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ریاستی حکومت نے اخبار "رنبیر" کی اشاعت بند کردی تو بھی اخبار کے عملہ نے ہمت نہ ہاری اور فوراً ہی لاہور سے اخبار "امر" جاری کردیا جو پہلے پنڈت گنگا ناتھ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جی کی ادارت میں ہی شائع ہوتا رہا۔ مگر یہ سلسلہ دیرپا ثابت نہ ہوسکا اور انہوں نے جلد ہی ایک اور ہفتہ وار اخبار "شیر" جاری کیا جس کے وہ ڈائرکٹر تھے۔ اسی اثناء میں حکومت نے "رنبیر" کی اشاعت پہ سے پابندی ہٹا دی اور نومبر سنہ ۱۹۳۱ء میں اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوگئی۔ چنانچہ پنڈت گنگا ناتھ جی پھر سے اس کے جائینٹ ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ یہ سلسلہ سنہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ جب چند خانگی وجوہات پر انہوں نے نہ صرف رنبیر سے قطع تعلق کرلیا بلکہ دنیاوی کاموں سے بھی علیحدگی اختیار کرلی۔ بعد میں مالی پریشانیوں کی وجہ سے آپ نے دھرم ارتھ ٹرسٹ کی ملازمت اختیار کرلی اور وہ مہتمم دھرم ارتھ جموں کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ سنہ ۱۹۴۷ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے فارسی زبان میں چھپے ہوئے "آئین دھرم ارتھ" کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو شائع ہوچکا ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ اخبار "دیش سیوک" جموں کے ایڈیٹر بھی رہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں محکمہ انفارمیشن نے گنیش داس وڈیرہ کی تحریر کردہ "راج درشنی" کے قلمی نسخہ کی فوٹو کاپی انڈیا آفس لنڈن سے منگوائی اور اس کے انگریزی ترجمہ کا کام پنڈت گنگا ناتھ جی کے سپرد کیا گیا۔ آپ نے یہ ترجمہ مکمل تو کرلیا مگر یہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر شائع نہ ہوسکا۔

پنڈت گنگا ناتھ جی کو اپنی ماتری بھاشا ڈوگری سے بھی بڑا لگاؤ تھا اور آزادی کے بعد جب ڈوگری زبان کو فروغ دینے کی تحریک کا آغاز ہوا اور مشہور شاعر دینو بھائی پنت نے ڈوگری کویتا کی اولین کتاب "گت لوں" شائع کی تو اس کا پیش لفظ بھی پنڈت گنگا ناتھ جی نے ہی لکھا تھا۔ ڈوگری کے اس پیش لفظ کے متعلق کرنل شیو ناتھ نے (ساہتیہ اکاڈمی کی شائع کردہ)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اپنی انگریزی تصنیف "ہسٹری آف ڈوگری لٹریچر" میں انہیں ان الفاظ
میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے :-

"Pandit Ganga Nath has a fine literary style and it is a pity that he did not write more. I feel that with his scholarship and intellectual acumen, his command over the language and his concise and charming idiomatic style revealed in this brief introduction piece he could have made substantial contribution to Dogri prose".

(پنڈت گنگا ناتھ کا ادبی سٹائل نہایت عمدہ ہے۔ یہ افسوس ناک امر ہے کہ
انہوں نے ڈوگری زبان میں زیادہ نہ لکھا۔ میرا خیال ہے کہ اُن جیسا
ایک صاحبِ علم اور ذہین شخص جو زبان پر مکمل عبور رکھتا تھا اور ایسے خوبصورت
اور بامحاورہ سٹائل میں لکھنے کی اہلیت رکھتا تھا جیسا کہ اُن کے لکھے مختصر تعارف
سے ظاہر ہے وہ ڈوگری ادب کی گرانقدر خدمت سرانجام دے سکتے تھے۔)

پنڈت گنگا ناتھ جی ڈوگرہ سبھا جموں اور ڈوگرہ برہمن پرتی ندھی سبھا
جموں کے بھی سرگرم کارکن تھے۔

پنڈت گنگا ناتھ جی نے شرافتِ نفسی اپنے والد بزرگوار سے ورثے میں
پائی تھی۔ وہ بڑے خوش مذاق، خوش اطوار، خوش گفتار، خوش وضع اور خوش
کردار انسان تھے۔

جنوری ۱۹۸۲ء میں جب وہ بسترِ علالت پر تھے، راقم السطور اُن کی مزاج

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پڑوسی کو گیا۔ پنڈت جی اُس وقت دیوانِ حافظ کے مطالعے میں مصروف تھے۔ اُن کے بستر کے ایک طرف بھگوت گیتا اور بائیبل تھی اور دوسری طرف دیوانِ غالب۔ طویل علالت کے باوجود پنڈت جی نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور کافی وقت تک دیوانِ حافظ کی خوبیاں بیان کرتے رہے۔

۲۷ فروری ۱۹۷۲ء کو گنگا ناتھ جی مشرا اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے مگر اُن کی یادوں کے پھول ہر عِلم دوست جموں نواسیوں کو اپنی مہک سے تا ابد تر و تازہ کرتے رہیں گے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پی۔این۔کاچرو

سوم ناتھ بٹ

مشہور مصوّر سوم ناتھ بٹ کا نام لیتے ہی کشمیر کی جدید فنّی تحریک کا سنہری دور ذہن پر چھا جاتا ہے کیوں کہ فنِ مصوّری کا دورِ جدید بٹ صاحب کی شخصیت سے علیحدہ کرنا بالکل ناممکن ہے۔ بٹ صاحب کشمیری کلچرل تحریک کے ایک اہم بانی کار کی حیثیت سے ہر وقت زندہ اور پائندہ رہیں گے۔

سوم ناتھ بٹ کی فنی زندگی دوسری جنگ عظیم کے آخری ایام (۱۹۴۲ء) سے شروع ہونے لگی جبکہ پہلے ہی اس کے سر سے ماں باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا اور انہیں میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی روزگار کی تلاش میں مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خوش قسمتی سے انہیں ایک فرنگی خاتون کے ہوٹل میں، جو وہ فرنگی سپاہیوں کے لئے چلا رہی تھی، بحیثیت منیجر کے ایک معمولی تنخواہ کی نوکری مل گئی۔ اس دوران انہوں نے کئی فرنگی سیاحوں کو دیکھا جو کہ یہاں کے مناظر سے متاثر ہو کر ان کے نقوش اتارنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی سے متاثر ہو کر بٹ صاحب نے یہ سوچ کر کافی پہل کی کہ وہ اپنی تصویریں فرنگیوں کو بیچ کر اپنی معمولی سی تنخواہ میں اضافہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کریں گے۔ بٹ صاحب کی زندگی کے چار سال کٹھن آزمائشوں سے گذرے وہ حالات سے نبرد آزما ہی تھے کہ ہندوستان سے فرنگیوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ اُن کی نوکری بھی چلی گئی اور انہیں پھر سے ذریعہ معاش کے لئے در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ خوش قسمتی سے ان کی چار سال کی منظر کشی کی مشق اور محنت اس مشکل دور میں کام آئی اور انہیں ایک مقامی پرائیویٹ سکول میں بحیثیت ایک ڈرائینگ ماسٹر ملازمت مل گئی۔

زندگی کی لاچاری اور بے بسی نے بٹ صاحب کو یہ نوکری قبول کرنے پر تو مجبور کر دیا لیکن اُن کا ذہن اب فن کارانہ طرزِ زندگی کی طرف مائل ہو رہا تھا اور اس رجحان کی وجہ سے اس ملازمت کے ساتھ ایک بے دلی کا سا احساس تقویت پا رہا تھا حالانکہ وہ برابر ڈیوٹی پہ جاتے، کام بھی کرتے، لیکن اندر ہی اندر وہ اس سے بیزار سے تھے۔ ان ہی دنوں بمبئی سے آئے ہوئے ایک فن کار G.M. Sole-gaonkar سے اچانک ان کی ملاقات ہوئی اور اسے اپنے گھر لے آئے۔ اس کی صحبت میں روز گھر سے نکل کر قدرت کے مناظر منقش کرتے رہتے۔ وہ اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں منہمک رہے اور بالآخر نوکری کو خیر باد کہہ کر ہی چین کا سانس لیا۔

۱۹۴۷ء کے اکتوبر نومبر کے مہینے بٹ صاحب کی زندگی کے مشکل ترین ایام تھے جبکہ ان کے ذہن میں ایک طوفان، ایک کشمکش تھی۔ اوڑی، بارہ مولہ، سوپور اور ہندوارہ کے علاقوں سے شرنارتھی بوڑھے، معصوم بچے، بوڑھی اور جوان سال عورتیں اپنے گھر اور صدیوں کے مسکن، جو خاکستر ہو چکے تھے، چھوڑ کر در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے سرینگر کے گلی کوچوں میں بے سروسامانی کی حالت میں آوارہ اور پریشان نظر آتے تھے۔ شہر سرینگر کے قوم پرست اور حساس شہریوں نے

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

کئی کیمپ قائم کئے تھے جن میں ایک گنپت یار کے علاقے میں بھی تھا جہاں پر بٹ صاحب کا گھر تھا۔ بٹ صاحب دن بھر منظر کشی کرتے اور صبح و شام شرنارتھیوں کی سیوا کرتے اور ان کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ بعدازاں وہ اس شرنارتھی کیمپ کے اہم رکن اور سیکرٹری بھی بن گئے اور اس طرح سے وہ ان بے سہارا اور بے سروسامان لوگوں کی سیوا کرتے رہے۔

بٹ صاحب سے میری پہلی ملاقات فروری ۱۹۴۸ء میں ہوئی جبکہ وہ ترلوک کول کے ساتھ نیشنل کلچرل فرنٹ میں آئے جہاں پر میں بحیثیت ایک بانی کار کے اور بحیثیت انچارج آرٹ سیکشن کے کلچرل تحریک چلا رہا تھا۔ اس ملاقات کے بعد میں ان دونوں مصوروں سے ملتا رہا اور عموماً ہم تینوں تبادلۂ خیالات میں مشغول رہتے تھے۔ آبی گذر سے لے کر رام منشی باغ تک وتستا کے بنڈ پر چلتے ہوئے ہر روز ہمارا وقت اسی بحث و مباحثہ میں گزر جاتا تھا کہ یہاں کی فنی روایات اور تحریکات جو کہ زمانے کے گرداب اور اندھیاروں میں کھو گئی ہیں، کو کیسے پھر سے بحال کیا جائے اور کیسے اس تحریک کو پختہ بنیاد فراہم کی جائے اور ثقافتی تحریک میں ڈھالا جائے۔ دوران بحث بٹ صاحب اور ترلوک کول نے یہ سجھاؤ بھی دیا کہ کیوں نہ وہ بھی کلچرل فرنٹ کے مصوری سیکشن میں شامل ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ جب بٹ صاحب نے اس بارے میں مجھ سے رائے مانگی تو میں نے اس سجھاؤ کی مخالفت کی کیونکہ کلچرل فرنٹ کا مصوری سیکشن اس وقت ایک محدود رول ادا کر رہا تھا جس میں زیادہ تر پروپیگنڈا پوسٹر ہی بنائے جاتے تھے اور ڈراموں کے لئے سٹیج سیٹ تیار کئے جاتے تھے۔ ظاہر تھا کہ اس حالت میں ایک سنجیدہ فنی تحریک کے لئے ماحول پیدا کرنا ایک کارے دارد والا معاملہ تھا۔ ان ہی آوارہ گردی کے ایام میں ہماری چلتی پھرتی میٹنگیں شروع ہو گئیں اور

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

یہ آوارہ گردی عموماً وِتستا ندی کے بنڈ پہ ہوتی رہی اور اسی شاہراہ پر ایک نئی فنی تحریک نے جنم لیا۔ اس تحریک کی اُستواری اور پیوندکاری ایک عظیم نقاد و مُصنف اور فن کار Professor Percy Brown نے کی جو کہ ہندوستانی تہذیب و فن کے ان پرستاروں میں ایک ہیں جنہوں نے بدنام فرنگی پالیسی Macan-leys Minute کا منہ توڑ جواب دیا اور ہندوستانی فنی روایات کی طرف داری کی۔ یہ عظیم شخص ہمیں عموماً وِتستا کے بنڈ پر کہیں نہ کہیں دیکھ ہی لیتا تھا اور ہمارے پُرزور بحث ومباحثہ کو بڑے غور سے دیکھتا رہتا تھا۔ ایک اور عظیم فنکار S.H. Raza جو کہ ہندوستانی ترقی پسند مُصنفوں، نقادوں، شاعروں اور اخبار نویسوں کے گروہ کے ساتھ وارد کشمیر ہوا تھا، نے بھی ہمارے خیالات اور ہمارے فنی نقطۂ نظر پر اثر ڈالا اور اس کی پائیداری عمل میں لائی۔ Raza کی مو قلم کی چابک دستی اور توانائی اور اس کے رنگوں کی جادوگری نے ہماری اس تحریک پر کافی اثر ڈالا اور اس تحریک کو توانائی بخش دی۔

۱۹۴۸ء کے ستمبر کے مہینے میں وہ خواب پورا ہوا جو کہ "ایک بدنام آوارہ گروپ" جس کو Trio کے نام سے پکارا جاتا تھا، دیکھا کرتا تھا۔ اسی دن Progressive Artists Association کی بنیاد پڑی اور اس کا Manifesto اور آئین منظرِ عام پر آگیا۔

سومناتھ بٹ اس عظیم اور جدید تحریک کے ایک بنیادی علمبردار تھے۔ اس تحریک کے بارے میں Prof. Percy Brown نے لکھا کہ یہ تحریک صدیوں کے اندھیرے کو پھاند کر اپنے کو پرانی مشہور فنی روایتوں کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ یہ تحریک سچے معنوں میں Progressive نام کی حق دار بن جاتی ہے۔

اس تحریک کی نمائندگی کے سلسلے میں جب کچھ تصویریں بمبئی کی نمائشوں میں چلی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

گیئں تو بٹ صاحب کے بارے میں مارچ ۱۹۴۹ء میں بمبئی کے مشہور اخبار "Bombay Sentinal" میں ایک سرخی آئی اور اس سرخی کے تحت ایک کالم چھپا جس میں بٹ صاحب کو A new comet on Indian horizon کہہ کر پکارا گیا۔ Progressive Artists' Association کی پہلی نمائش قومی پیمانے پر پہلی اکتوبر ۱۹۴۹ء کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ کشمیر کی تاریخ میں یہ پہلی نمائش تھی جس میں فنِ مصوری کے جدید تجربے ایک منظم تحریک کی صورت میں قومی منظر پر چھا گئے۔ اس نمائش نے نیشنل پریس کے فنی کالموں میں ہلچل پیدا کر دی اور ان کالموں میں سومناتھ بٹ کے فنی رجحانات کو کافی سراہا گیا اور اس طرح بٹ صاحب قومی شہرت کے مالک بن گئے۔ یہ فنی تحریک تیز رفتاری سے نیشنل تحریک کا ایک حصہ بن گئی اور بٹ صاحب بحیثیت ایک اہم رُکن کے اس تحریک کی علمبرداری کرتے رہے۔ دو اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ہندوستانی اخبارات کے کالموں میں ایک نئی رنگینی چھا گئی ہماری تصاویر رنگوں کی جادوگری اور مُوقلم کی توانائی سے پُر پائی گئیں۔ ان کالموں میں ہمیشہ بٹ صاحب کا نام بحیثیت ایک بانی کار کے پیش پیش رہا۔ ان کے بارے میں چند مشہور اخباروں کے تاثرات یہاں پر قلمبند کرنا نامناسب نہیں ہوگا:

"S.N. Bhat is the most advanced. He is able to suggest a mood in a landscape, to create an evocative atmosphere, to suggest the beauty of kashmiri houses and boats."
STATESMAN, Oct 2, 1949.

"......in Butt's landscapes there are contra lights giving a soft halution round green foliage with the reduced simplicity of which Butt recovers the child's vision of the world without striking a false note."
SHANKER'S WEEKLY, Oct 9, 1949.

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اسی نمائش میں بٹ صاحب کی ایک تصویر "The Chair" بہت ہی مقبول ہوگئی خاص کر نقادوں اور مفکروں نے اس پر کافی تبصرہ کیا اور اس تصویر کی فنی عظمت کو کافی سراہا۔ یہ تصویر کئی نکتہ نظر سے بہت ہی عظیم اور اہم ثابت ہو چکی تھی۔ بٹ صاحب کی یہ تصویر اس دور کی عکاسی کرتی تھی جس میں کشمیری تحریک impressionism سے Post impressionism کی اور جا رہی تھی اور "The Chair" اسی دور کی عکاسی کا ایک اہم شاہکار تھا۔ اسی دور میں کشمیری تحریک خلائی روشنی سے پیدا ہوئی رنگینیوں کی جادوگری اور رومانیت (impressionism) پر فاتح ہو کر اب ان رنگینیوں میں ہیئتوں اور ان کی عمقوں کو اجاگر کرنے کی کوشش میں مصروف تھی اور بٹ صاحب اس تحریک کے ایک اہم علمبردار تھے۔ اس تحریک کو آگے بڑھاتے بڑھاتے ان کی تصویروں میں وہ تمام صفات ظاہر ہو گئیں جو یورپ کے مشہور فن کار اور جدیدیت کے علمبردار George Braque کی تصاویر میں پائی جاتی تھیں۔

بٹ صاحب کی تصاویر میں ہمالیائی رنگت کی نازک مزاجی بہت ہی گہرائی سے جھلکتی تھی۔ ایسی ہی بدلتی ہوئی رنگینیوں کی جھلک ان کے اپنے احساسات کے ساتھ وابستگی پیدا کرتی تھی اور کینواس پر اتر جاتی تھی اور اس طرح سے بٹ صاحب کے شاہکار تخلیق ہوتے رہے۔ اپنے موقلم کی چابکدستی سے وہ رنگوں کو کھود کر مانو رنگوں کی زمین میں ہل چلا کر سطح ہوتے ہوئے بھی ایک ڈائمنشن پیدا کر دیتے تھے۔ منظر کشی کے ہر جز میں ایک کیریکٹر رنگوں کی اس کھدائی کے ذریعہ پیدا کرتے۔ وہ اپنی تصاویر کے لئے پلاٹ اپنے ماحول اور آس پاس سے متاثر ہو کر ہی لیتے اور کینواس پر انہیں اتارتے۔ اسی مشق سے ان کی Abstract تصاویر نے جنم لیا اور اس فنی تحریک کی بندش ان کے آخری دور کی عکاسی کرتی ہے۔

بٹ صاحب تقریباً پندرہ سال تک SCHOOL OF DESIGNS سے بحیثیت ایک آرٹسٹ کے وابستہ رہے لیکن اُن کی صحت خراب ہوتی گئی اور ضعیفی اور جسمانی کمزوری نے انہیں مغلوب کر لیا۔ چنانچہ وہ عملاً مذکورہ بالا تحریک سے کٹ کر رہ گئے۔

بٹ صاحب اس دارِ فانی سے ۹ دسمبر ۱۹۷۳ء کو کوچ کر گئے[ٹ]۔

ٹ ان کے دوستوں کا یہ کہنا درست ہے کہ بٹ صاحب کی خرابیٔ صحت میں انکی مے نوشی (مے پرستی کہنا زیادہ مناسب ہوگا) کو بڑا دخل تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بلدیو پرشاد شرما

مولوی حشمت اللہ خان

الحاج مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی مصنف "مختصر تاریخ جموں" سنہ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی۔ آپ نے سنہ ۱۸۹۴ء میں سرکار انگلشیہ ہند کے محکمہ خارجہ میں ملازمت اختیار کی اور ان کی تقرری برٹش ایجنٹ مقیم گلگت کے دفتر میں ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب روس کی پیش قدمی کی وجہ سے گلگت کی سیاسی اہمیت بہت بڑھ چکی تھی جس کے پیش نظر سرکار انگلشیہ ہند نے برٹش پولیٹیکل ایجنسی گلگت کا دوبارہ قیام عمل میں لایا تھا اور سنہ ۱۸۸۹ء میں کرنل ڈیورنڈ کو بحیثیت ایجنٹ مامور کیا تھا۔ اس طرح مولوی حشمت اللہ خان کی تقرری ایک ایسے علاقہ میں ہوئی جو سیاسی طور ہند کا ایک نہایت اہم علاقہ تھا۔ سرکار انگلشیہ ہند اس شمالی سرحد کو مضبوط بنانے کے لئے ہر ممکن ذریعہ عمل میں لا رہی تھی چونکہ ملحقہ ملک چترال کی جغرافیائی پوزیشن ایسی تھی کہ بقول کرنل ڈیورنڈ "روسی فوجی دستے اس علاقہ سے بآسانی حملہ آور ہو سکتے تھے" اس لئے چترال کو بھی دوبارہ زیر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اقتدار لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ڈوگرہ فوج اور ہند سرکار کی فوج نے مشترکہ طور چترال پر حملہ کر دیا۔ ۱۸۹۵ء میں جنگ چترال کے خاتمہ پر جب وہاں بھی ایک برطانوی افسر مامور کیا گیا تو مولوی حشمت اللہ کا تبادلہ چترال کر دیا گیا۔ گلگت اور چترال میں رہائش کے دوران جہاں انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ گہرے تعلقات پیدا کیے وہاں اُن کی زبان شینا (گلگتی) اور کھوار (چترالی) بھی سیکھ لی۔

۱۸۹۸ء میں حشمت اللہ صاحب ریاست جموں و کشمیر کی ملازمت میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۲ء تک مختلف عہدوں پر گلگت میں مامور رہے۔ اس عرصہ میں گلگت، چترال، ہونزہ، نگر وغیرہ کے علاقہ جات میں دورہ کرنے اور وہاں کے عینی حالات اور روایات جمع کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔ اس کے بعد آپ کا تبادلہ مظفر آباد اور اس کے بعد دیگرے راجوری، کرگل، اودھم پور اور لداخ میں ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں تیس سال کی ریاستی سروس کے بعد آپ ریٹائر ہو کر اپنے وطن مالوف لکھنؤ چلے گئے۔

۱۹۳۰ء میں ماہر علم طبقات الارض پروفیسر جیو۔ ٹو۔ ڈائی نیلی اپنی مہم لے کر سیچن گلیشر پر گئے۔ مولوی حشمت اللہ کو علاقہ لداخ میں شہرت اور جغرافیائی واقفیت کے پیش نظر اپنی مہم کا منتظم مقرر کیا۔ اس طرح حشمت صاحب کو علاقہ تراقرم کے مفصل دورہ کا موقعہ ملا۔

سرکاری محافظ خانہ جموں میں حشمت اللہ صاحب کے دورہ لداخ کی ڈائریاں موجود ہیں جو انہوں نے بحیثیت وزیر وزارت لداخ وزیر اعظم صاحب کے نام بھیجی ہوئی ہیں۔ ان سے نہ صرف لداخ کے حالات کا پتہ ملتا ہے بلکہ نواحی ممالک لہاسہ اور چین کے سیاسی حالات کا علم بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہفتہ اوّل ماہ اسوج سنہ ۱۹۶۷ بکرمی (سنہ ۱۹۱۰ء) کی ڈائری میں لکھتے ہیں :-

"ملک لہاسہ سے جو اشخاص حال میں علاقہ ٹانچی میں آئے ہیں اُن کی زبانی اس علاقہ کے معززین کو معلوم ہوا ہے کہ رعایائے لہاسہ کے درمیان یہ چرچا ہے کہ دلائی لامہ آج کل بمقام دارجیلنگ سرکار انگلشیہ ہند کے مہمان کے طور پر مقیم ہے ۔ سرکار موصوف نے شہنشاہ چین کی خدمت میں سفارش کی ہے کہ لامہ مذکور کو حسب دستور اس کے اعلیٰ منصب پر بحال کر کے لہاسہ میں واپس لایا جائے ۔ تاحال اس سفارش کا جواب موصول نہیں ہوا ہے مگر لوگوں کا خیال ہے اگر شاہنشاہ چین نے یہ سفارش منظور بھی کی اور دلائی لامہ کو لہاسہ واپس آنے کی اجازت بھی عطا کی تو ملکی اقتدار اور اختیارات اس کے کبھی بحال نہ رہیں گے بلکہ صرف مذہبی پیشوا کے طور پر وہ لہاسہ میں واپس آسکے گا ۔ ملکی کاروبار بدستور افسران سلطنت چین کے ہاتھ میں رہے گا اور ان سے دلائی لامہ کو کوئی تعلق نہ ہوگا ۔"

اسی ڈائری میں حشمت اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ حکومت لہاسہ نے اس معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے جس کی رُو سے ریاست جموں و کشمیر نے لہاسہ سے درآمد ہونے والے مال پر محصول معاف کیا تھا اور حکومت لہاسہ نے بھی لداخ سے درآمد ہونے والے مال نمک وغیرہ کو محصول سے مستثنےٰ رکھا تھا ۔ اس رپورٹ پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا ارشاد موجود ہے ۔

(فائل نمبر ۲۳۸ - ۱۱/ ۱۱۹۹

بابت ۱۹۷۲ بکرمی)

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

• حشمت اللہ بحیثیت تاریخ داں :

فاضل مُصنّف نے اپنی ضخیم ۹۴۴ صفحات پر مشتمل تاریخ جس کو "مختصر تواریخ جموں و ریاستہائے مفتوحہ مہاراجہ گلاب سنگھ والئی جموں و کشمیر و اقصائے تبت ہا وغیرہ" کا نام دیا گیا ہے، سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں مطبع محمد شفیع بہادر لکھنؤ میں چھپی تھی۔

تاریخ کا پہلا حصّہ ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے جس کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب قدیم ڈوگرہ راجگان جموں کے متعلق ہے۔ دوسرا باب سوانح عمری و فتوحات مہاراجہ گلاب سنگھ کے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں مہاراجہ گلاب سنگھ کی ملک گیری کے بعد اس کے جانشینوں نے ملک داری کا جو انتظام کیا اس پر مختصر بحث کی گئی ہے اور چوتھے باب میں عہد نامہ جات درج ہیں۔

یہ حصّہ مصنّف نے ابتداءً لداخ میں لکھا تھا جہاں بقول اس کے "ذاتی تحقیقات کا کوئی ذریعہ موجود نہ تھا لہٰذا زمانہ سلف کے تمام تر حالات میں نے دیوان کرپارام کی قابل قدر تصنیف "گلاب نامہ" سے اخذ کیے ہیں"۔

• تاریخ کشتواڑ :

تاریخ کا دوسرا حصّہ کشتواڑ سے تعلق رکھتا ہے اور ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنّف ۱۵-۱۹۱۴ء میں کشتواڑ میں مقیم رہا۔ یہاں اس نے ان مقامات کو دیکھا "جہاں وزیر زورآور سنگھ کہلوریہ نے اپنی فوج تیار کی اور ان راستوں کو دیکھا جدھر سے وہ اس بڑی جمعیت کو سلامتی کے ساتھ گذار کر لے گیا اور سورُو اور کرگل تک کی نسبت معلوم ہوا کہ ان کے تعلقات زمانہ سلف سے کشتواڑ کے ساتھ چلے آتے ہیں تو میری رائے ہوئی کہ بغرض تکمیل تاریخ لداخ و

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

بعد ریگ تاریخ کشتواڑ کا لکھا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ میں نے اس کی تحقیق شروع کر دی"۔

اس سلسلہ میں مصنف نے پنڈت دینا ناتھ کی قلمی منظری تاریخ کشتواڑ پر اس کی بنیاد رکھی اور ذاتی تحقیقات کی بنا پر اس پر اضافہ کرنا شروع کیا۔ "اس کے لئے مجھے اطراف کشتواڑ میں سفر کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں میں نے آثار قدیمہ کا بااحتیاط معائنہ کیا"۔

اس حصہ کو مصنف نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے میں ابتدائی حالات قدیم راجگان، دوسرے میں اُن راجگان کی تاریخ ہے جن کے ساتھ اسلامی حکومتوں کے تعلقات پیدا ہوئے اور تیسرے میں مسلمان راجگان کشتواڑ کی تاریخ ہے۔

● - تاریخ تبت اصلی اور تبت بزرگ

تاریخ کا تیسرا حصہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تاریخ لہاسہ جسے فاضل مصنف نے "تبت اصلی" کے نام سے منسوب کیا ہے، اور لداخ جسے "تبت بزرگ" کے نام سے منسوب کیا ہے، کی تواریخ درج ہے۔

بقول مصنف "تاریخ لہاسہ قریب قریب ایک تبتی تاریخ کا ترجمہ ہے جس میں کئی سال کی ذاتی تحقیقات سے بہت سے حالات کا اضافہ کیا گیا ہے"۔

یہی حال لداخ کی تاریخ کا ہے۔ مہمات و فتوحات ڈوگرہ کے تاریخی واقعات گلاب نامہ سے اخذ کئے گئے ہیں جن کی تفصیل کے متعلق مقامی تحقیقات سے مصنف نے بہت اضافہ کیا ہے۔ اس حصہ کے دوسرے باب میں تاریخ لداخ ہے۔ یہ باب ابتدائی راجگان کے حالات پر محدود ہے جن کا لقب "لہاچین" تھا۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تیسرے باب میں سلطان سعید خان کے حملہ لداخ بابت ۳ تا ۵ کشمیر کے مفصل حالات مرزا حیدر کی تصنیف "تاریخ رشیدی" سے لئے گئے ہیں۔ چوتھے اور پانچویں باب میں اُن راجگان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جنہوں نے خاندان لشے کی حکومت کا خاتمہ کر کے شاخ جدید کی واحد حکومت لداخ کی بنیاد رکھی اور نمگیل کا لقب اختیار کیا۔

چھٹے، ساتویں اور آٹھویں باب میں وزیر زورآور سنگھ کی مہمات کا ذکر ہے جس میں وزیر زورآور سنگھ کا تبت کے ملک کو پورانگ تک فتح کرنے اور آخر کار تبتی فوج کے ہاتھوں مارے جانے کا ذکر ہے۔

نواں باب دیوان ہری چند اور وزیر رتنوں کی چوتھی مہم لداخ کے متعلق ہے۔ دسواں باب وزیر لکھپت کی پانچویں مہم بلتستان کے متعلق ہے۔

فاضل مصنف نے لداخ کی تاریخ کو صرف راجگان کے حالات یا ڈوگرہ فوج کی مہمات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ لداخ کے عوام کے سماجی و اقتصادی حالات بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں جو کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتے۔ گیارھواں باب لداخ کی تجارت، صنعت و حرفت یا زرعی پیداوار اور معدنیات کے متعلق مفید واقفیت بہم پہنچاتا ہے۔

بارھویں باب میں اُن ممتاز ناظمان لداخ کے حالات درج ہیں جنہوں نے اس ملک کے انتظام میں نمایاں ترقی کی ہے۔ چودھواں باب نہایت دلچسپ اور اہم ہے۔ اس میں بودھوں کے رسم و رواج کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ پندرھویں باب میں بودھوں کے تہوار، گونپہ جات کے میلوں، گونپوں کے انتظام، بودھی جنتری کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی گئی ہے۔

● لداخ میں چھاپہ خانہ: اس باب کے صفحہ ۳۱۶ پر مصنف نے لداخ میں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پہلی بار چھاپہ خانہ قائم کئے جانے کا انکشاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"راجہ نیما نگیل ۱۷۵۱ - ۱۶۹۵ء کے عہد میں پہلی دفعہ اس ملک میں چھاپہ خانہ قائم ہوا - اس راجہ نے مورتیوں کے اندر جو منتر رکھے جاتے ہیں، ان کو چھاپنے کے لئے لکڑیوں کی تختیاں کندہ کرائیں اور اس کا تمام سامان لہاسہ سے منگوایا - یہ چھاپہ خانہ اس وقت تک گونپہ سوما واقعہ قصبہ لیہہ میں موجود ہے۔"

● - تاریخ "تبت خورد":

کتاب کا چوتھا حصہ ۱۹۳ صفحات پر مشتمل ہے جس میں بلتستان، جسے فاضل مصنف نے "تبت خورد" کا نام دیا ہے، کی تاریخ درج ہے۔ بلتستان میں اشاعت اسلام کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

● - تاریخ کرگل:

پانچواں حصہ ۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تاریخ پوریگ و زانسکار (کرگل) درج ہے۔

● - تاریخ گلگت

چھٹا حصہ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تاریخ گلگت (دردستان) درج ہے۔ فاضل مصنف نے دس سال کا طویل عرصہ گلگت میں گذارا۔ اس کے مطابق "گلگت وہ سرحد ہے جہاں ڈوگروں نے اپنی سپاہ گری کا پورا اظہار دو ایک مہموں میں نہیں بلکہ متعدد مہموں میں مسلسل نصف صدی تک کھلایا ہے اور اپنی سرحد کو ایک طرف کاشغر کے ساتھ اور دوسری طرف افغانستان سے ملا دیا ہے ...... اور چونکہ میں ملک دردستان کے طول و عرض میں استور سے لے کر چترال تک ہونزہ سے لے کر چیلاس تک قریب قریب ہر جگہ رہ آیا

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

ہوں اور ہر ایک علاقہ کی کم وبیش واقفیت رکھتا ہوں..... اس مختصر بیان سے سرحد گلگت پر تلوار کا پورا پورا زور نیتے شاہ کی سرکردگی میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے ۱۸۴۷ء میں گلگت کا قبضہ حاصل کرنے سے لے کر مہاراجہ پرتاپ سنگھ، جرنیل بلاج سنگھ کے زمانہ کے دور کشمیر امپیریل سروس ٹروپس ۱۸۹۵ء میں فتح چترال تک بخوبی ظاہر ہوگا جس کے بعد سرحد گلگت پر کوئی فتنہ و فساد نہیں ہوا۔"

● تاریخ مظفر آباد

تاریخ کا ساتواں حصہ پچاس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں "تاریخ سلاطین بمبہ و راجگان کھکھا و بمبال (وزارت مظفر آباد) درج ہے۔ یہ سلاطین و راجگان بھی سرحدی رؤسا میں سے ہیں اور اپنے زمانہ حکومت میں ایک زبردست جنگی قوم اور محافظ سرحد ہزارہ و پونچھ رہے ہیں۔

مقدمہ

مولانا اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب پرو وائس چانسلر، پروفیسر و چیرمین شعبہ تاریخ و سیاست مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے کتاب کے مقدمہ کے دوران لکھا ہے:۔

"اس قسم کی تصنیف کے لئے میرے دوست الحاج عشمت اللہ خان جس قابلیت کے ساتھ موزون ہیں، بہت ہی کم اشخاص کو وہ رتبہ حاصل ہے۔ وہ ایک تجربہ کار مدبر ہیں، نکتہ رس محقق ہیں اور قابل صفت زبان ہیں۔ انہوں نے ایسا دماغ پایا ہے کہ ملازمت سرکاری سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان میں جوانی کی قوت اور لوچ باقی ہے۔"

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

آگے چل کر آپ لکھتے ہیں:

"اپنے تمام زمانہ قیام مملکت جموں و کشمیر میں مولوی حشمت اللہ خاں نے ان علاقہ جات کے باشندگان کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رکھے جہاں وہ بطور حاکم کے تعینات رہے اور حکومت کے فرائض سے جس قدر زائد وقت انہیں ملتا رہا اسے انہوں نے اہل ملک کی تاریخ، زبان و رسم و رواج کی تحقیقات میں صرف کیا۔"

ریویو:

مولانا محمد حبیب صاحب پروفیسر تاریخ و سیاسیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے اس تصنیف پر ریویو کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"تاریخ جموں" اُردو زبان کی چند واقعی علمی تصانیف میں سے ایک تصنیف ہے۔ اشاعت اُردو کے تمام حامیوں کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے کیونکہ مصنف گو کہ لکھنؤ کے باشندے ہیں مگر وہ اُن متجسسین اور محققین میں سے ہیں جو ہندوستان میں بہت کمتر پائے جاتے ہیں اور چونکہ وہ ان ممالک میں پہنچے ہیں جہاں قبل ازیں بہت کم ہندوستانی گئے انہیں ان معاملات پر لکھنے کا استحقاق حاصل ہے جن کے متعلق اُردو زبان میں کوئی سابقہ تصنیف موجود نہیں۔"

آپ نے مزید لکھا ہے کہ "اس کتاب کا اصلی موضوع یہ ہے کہ مہاراجہ گلاب سنگھ کے عالی شان خاندان کے حالات بیان کیے جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ریاست جموں و کشمیر کے تمام تاریخی، سیاسی، جغرافیائی اور معدنی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

حالات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معلومات کے اس خزانہ کیلئے توجہ کے ساتھ پڑھنے والوں کو مصنف کا شکر گذار ہونا چاہیئے"۔

کلچرل اکیڈمی کی مطبوعات

کے علاوہ

ملک کے دوسرے علمی و ادبی اداروں

کی مطبوعات خریدنے کیلئے

کتاب گھر

(مولانا آزاد روڈ، سرینگر)

تشریف لائیے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

سعید احمد ڈار

غلطیہائے مضامین

شمیم احمد شمیمؔ کی شخصیت پر رشید تاثیر کے مضمون سے جہاں کئی واقعات کو قطعاً غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے وہاں شمیمؔ کی شخصیت پر گرد و غبار کی ایک تہہ بھی جمتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے جو مجموعی تاثر اُبھرتا ہے، وہ واقعاتی اعتبار سے صحیح نہیں لگتا۔

شمیم صاحب میرے ہم عمر، ہم جماعت اور رشتے میں بھائی تھے۔ ہم ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے جہاں سے شمیمؔ کو بادلِ ناخواستہ ہجرت کرنا پڑی۔ لیکن بعد میں شوپیاں کے نیشنل ہائی سکول سے ہم نے اکٹھے سنہ ۱۹۵۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ زندہ شمیم کے ساتھ نوک جھونک میں بہت لطف آتا تھا لیکن جوانمرگ شمیمؔ کے لئے ایک بات یاد رہ گئی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شمیم صاحب کے والد بزرگوار مولوی محمد یعقوب مولوی عبداللہ صاحب کے دوسرے فرزند تھے نہ کہ تیسرے۔ مولوی محمد ایوب صاحب صابرؔ پہلے فرزند

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

تھے جو میرے سگے خالو تھے۔ مولوی عبدالرحیم صاحب مولوی عبداللہ صاحب
کے تیسرے بیٹے تھے۔ جب انہوں نے سنہ ۱۹۳۱ء میں سب سے پہلے جیل جاکر
تحریک آزادی میں نام کمایا تو اُن کے بڑے اور بزرگ بھائی کو کیا آسنور سے
ہجرت کے ایام میں نیشنل کانفرنس کی سیاست یاد آجاتی۔ آسنور سے انکی ہجرت
کا غیر پسندیدہ واقعہ سنہ ۱۹۴۲ء-۴۳ کے آس پاس کا ہے۔ تحریک آزادی کشمیر سنہ ۱۹۳۱ء
میں مولوی عبداللہ صاحب کے گھرانے کا "پہلی محبت" کا واقعہ ہے۔ حال یہ بات
ضرور ہے کہ مولوی محمد عبداللہ صاحب کے ان دوسرے صاحبزادے کی صحت ابتدار
سے ہی بہت خراب تھی۔ وہ دمہ کے مریض تھے اس لئے سیاسی اُچھل کود میں
کھل کر حصہ نہ لے سکتے تھے۔ جب وہ شوپیان تشریف لے گئے تو اس زمانے
میں یہ جان لیوا مرض انتہائی شدت کے ساتھ اُن پر حملہ آور ہوا تھا۔ اُن کی
سانس ہر وقت پھولتی رہتی تھی اور بات کرنا بھی اُن کے لئے بہت مشکل ہوجاتا
تھا۔ شوپیان میں مولوی محمد یعقوب صاحب نے قادیانی مرزائیوں کے خلاف
بین المسلمین اتحاد قائم کیا۔ اس کے بعد صحت کی شدید خرابی کے باوجود انہوں
نے تمام مسلمانوں کو بلا لحاظ فرقہ و مسلک کے ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ موجودہ
ذرائع ابلاغ کی سہولیات اُس زمانے میں میسر نہ تھیں۔ نہ ریڈیو تھا نہ دوردرشن
نہ اخبارات کی ریل پیل اور نہ ہی لاوڈ سپیکر۔ شوپیان سے مسلمانوں کے بڑے
بڑے جلوس اسلامی نعروں کے ساتھ ساتھ درود خوانی کرتے ہوئے آسنور کے
سامنے سے گذرتے ہوئے منزگام میں ڈیرا ڈالتے تھے۔ جلسے ہوتے تھے تقریریں
ہوتی تھیں۔ دونوں طرف سے ریاست سے باہر کے لوگ ان جلسوں میں تقریریں
کرتے تھے اور جج صاحبان اور پولیس ہر وقت امن و امان قائم رکھنے کے لئے
چوکس رہتے تھے۔ شمیم کی چنچل اور سیمابی طبیعت ان کو اس زمانے میں بھی کسی

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

پہلو قرار لینے نہیں دیتی تھی۔ اُن کی والدہ صاحبہ کٹر قادیانی مرزائی تھیں کبھی وہ اُن کی طرفداری میں والد صاحب کے خلاف تقریریں کرتے اور کبھی شوپیان میں اپنے والد صاحب کی غریب الوطنی پر خون کے آنسو روتے ۔

ثبات اِک تغیر کو ہے زمانے میں

طبیعت میں یہ رنگ بچپن سے تھا اور آخری دم تک برقرار رہا۔ سکول میں جتنے مباحثے ہوتے تھے اس میں وہ مخالف کیمپ کی ہر ممکن امداد کرتے تھے۔ حالانکہ ہر لحاظ سے وہ اس زمانے میں کٹر مسلم کانفرنسی تھے لیکن اُسی زمانے میں نیشنل ہائی سکول میں راجوری کے ایک طالب علم قبائلی حملے کے مارے ہوئے آگئے۔ وہ ہر بات میں قائد اعظم محمد علی جناح کی حمایت کرتے تھے۔ شمیم کو فوراً اس معاملے میں راجوری کے اس لڑکے کے ساتھ ٹکر لینے کے لئے پکا ہندوستانی بننا پڑا اور بیچارے اس لڑکے کو جس کا نام سلیم تھا شوپیان سے واپس راجوری بھاگنے میں عافیت نظر آئی حالانکہ ہم جانتے تھے شمیم یہ سب ڈرامہ دوسروں کو ہرانے کے لئے کرتا ہے۔ شمیم دل کا بہت صاف تھا۔ البتہ مدِ مقابل کو شکست سے ہمکنار کرنے میں اُس کو ذہنی سکون ملتا تھا۔ اور مدِ مقابل کے چہرے پر شکست کھانے کے بعد بھی ۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب   گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

والی کیفیت ہوتی۔ سلیم کے واپس راجوری جانے پر شمیم کو بعد میں ہمیشہ افسوس رہا۔ شمیم کی طبیعت میں شرارت کی حس کچھ زیادہ ہی تھی اور وہ اس کو اپنا پیدائشی حق جان کر برتتے تھے۔ ایک دفعہ صرف یہ دکھانے کے لئے کہ وہ ایل-ایل-بی۔ کر کے آگئے ہیں، انہوں نے مجھ پر سرینگر کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا جب میں نے اعتراف کر لیا کہ حضور آپ تو بہت قابل وکیل ہیں، تب جا کر میری جان

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

چھوڑتی۔ اس معاملے میں انہوں نے کسی کو بھی نہیں بخشا۔ نہ اپنوں کو نہ غیروں کو۔ جب وہ فوت ہوئے تو بے شمار لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک دفعہ جب وہ الیکشن ہار گئے تو میں نے لنگوٹیا ہونے کے ناطے لکھا "کم از کم چند دنوں کے لئے اطمینان کی سانس تو لیں گے ہم"۔ جواب میں لکھا "تم ہی نہیں بے شمار لوگ گھوڑے بیچ کر سو جائیں گے"۔ شمیم تو ایک ایسے معشوق تھے جو اپنوں اور غیروں سب کی نیند حرام کر دیتے تھے۔ اُن پر ہر وقت دوسروں کو نیچا دکھانے کا جنون سوار رہتا تھا لیکن موت کے سامنے وہ ایکدم مات کھا گئے۔

مولوی محمد یعقوب صاحب نے آسنور سے شوپیاں جو ہجرت کی اس میں تاثیر صاحب نے میرے قبلہ بزرگوار، دادا جان خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار کو بھی یونہی گھسیٹ لیا ہے۔ اس اجمال کی مختصر سی روئیداد یوں ہے:۔

ایک بار آسنور کے ایک بزرگ صاحب فراش تھے۔ انکی مزاج پرسی کیلئے لوگ آتے جاتے رہتے۔ خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالعزیز صاحب ڈار اور مولوی محمد یعقوب بھی مزاج پرسی کے سلسلے میں وہاں تشریف رکھتے تھے۔ جیسی طبیعت شمیم صاحب کی بحث مباحثے میں تھی ویسی ہی اُن کے والد صاحب کی بھی تھی۔ وہ در مقابل کو ایسی کراری چوٹ لگاتے تھے کہ وہ خاموش ہو جاتا۔ لیکن خواجہ عبدالعزیز ڈار کی طبیعت بہت جوشیلی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر مولوی محمد یعقوب صاحب کی بے تحاشا مار پیٹ کر دی۔ میں اور شمیم چوتھی جماعت کے طالب تھے اور شمیم کے گھر میں ہی سرمائی تعطیلات میں بیٹھے سکول کا کام کرتے تھے۔ اچانک مولوی محمد یعقوب صاحب خون میں لت پت گھر تشریف لائے۔ گھوڑے پر سوار وہ اُسی وقت شوپیاں چلے گئے۔ تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

(قادیانی) مرزائیوں کیخلاف ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ قادیان سے بھی مقدمہ کی
کاٹ کرنے کے لئے ہر ممکن امداد بہم پہنچائی گئی۔ خواجہ عبدالرحمان ڈار صاحب
نے کبھی مولوی محمد یعقوب صاحب کو قادیانی دائرہ میں آنے کے لئے نہیں کہا۔
وہ اس قسم کے آدمی نہیں تھے۔ اس سے پہلے اپنی سب سے بڑی بھتیجی، جو اُن
کے خاندان میں سب سے لاڈلی لڑکی تھی، مولوی محمد یعقوب کے بڑے بھائی محمد
ایوب صابر المعروف ایم۔ اے صابر کے عقد میں دے چکے تھے۔ اُس وقت تقریباً
۳۰، ۴۰ سال کا زمانہ اس شادی کو گذرا تھا۔ جب اس وقت اپنے داماد صابر
صاحب کو قادیانی دائرے میں آنے کے لئے نہیں کہا تو پھر مولوی محمد یعقوب کو کیوں
کہتے۔ تاثیر صاحب کے اس بیان کو بلا خوف و تردد پورے وثوق کے ساتھ
مسترد کرتا ہوں بلکہ اس واقعہ سے کوئی ۲۵ سال پہلے محمد یعقوب کی شادی
بھی ایک قادیانی مرزائی لڑکی کے ساتھ کرنے میں خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار
کی ذاتی کوششوں کا ہی دخل تھا۔ اگرچہ قادیانی مرزائی رشتے ناطوں کے معاملوں میں
کوئی رعایت دینے کے لئے تیار نہیں رہتے اور سخت قسم کا Puriton رویہ اپناتے تھے۔
لیکن خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار کا رویہ ان معاملات میں انتہائی فراخدلانہ تھا۔
انہوں نے منزگام کے اہل حدیثوں، گلوان پورہ کے حنفیوں، میمندر شوپیان کے اہل
سنت والجماعت اور خود مولوی عبداللہ کے خاندان کے ساتھ رشتوں اور ناطوں کے
بارے میں پہل کی تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ انتہائی وسیع القلب تھے۔ وہ امبری
سیب کے رئیس التجار تھے۔ انکی موت کے ساتھ ہی امبری سیب بھی اس علاقے
سے غائب ہوگیا۔ وہ اولین مجاہدین آزادی میں سے تھے۔ اُن کے داماد (۱۹۴۷ء میں)
خواجہ محمد عبداللہ صاحب (عربک ٹیچر نمبر ہائی سکول جموں) کو توی کے پُل پر انتہائی
بیدردی کے ساتھ دوران ڈیوٹی قتل کر دیا گیا، لیکن انہوں نے اُف تک نہیں کی۔ البتہ

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

خواجہ عبدالرحمان صاحب ڈار نے اس مقدمے کے تصفیے میں ضرور ہاتھ بٹایا ہوگا۔ مولوی محمد یعقوب کے ساتھ انتہائی باعزت سمجھوتہ ہو گیا تھا جس پر خلیفہ قادیان سخت سیخ پا ہو گیا تھا۔ تصفیہ کی تفصیلات شوپیان تھانے اور عدالت کے ریکارڈ میں (غالباً ۱۹۴۳ء کے آس پاس) موجود ہوں گی۔

دوسری بات جو شمیم صاحب کی وفات کے بعد قطعاً صاف ہونی چاہیئے، وہ ہے تاثیر صاحب کا یہ غلط تاثر کہ شمیم "پکے مرزائی گوالیٹی کے مسلمان تھے" ۱۹۶۲ء میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ شمیم کے متعلق یہ بات صاف ہو گئی تھی کہ شمیم صاحب اہل سنت والجماعت سے وابستہ مسلمان تھے۔ جب ایک مسلمان خاتون محترمہ ریدی آسنور میں ۱۹۷۳ء میں فوت ہوئیں اور قادیانی مرزائیوں نے اس کا جنازہ نہ پڑھا تو شمیم نے اپنے مؤقر "آئینہ" میں مسلسل اس پر قادیانی مرزائیوں کی خبر لی۔ یہ زوردار آرٹیکل بھی اُن کے مسلمہ اعتقاد کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ تاثیر صاحب کو "آئینہ" کے یہ فائل اٹھا کر اپنے اس Reflective بیان پر نظرثانی کرنا چاہیئے۔

شمیم کی دوسری ہمشیرہ کا رشتہ جب عبدالسلام یارہو صاحب کے ساتھ طے ہوا تو قادیانی مرزائیوں کی باسی کڑائی میں سخت اُبال آیا تھا اور شمیم سے باضابطہ جواب دہی طلب کی گئی تھی۔ شمیم تو ان ہی بانوں کی تاک میں رہتے تھے۔ اگر تاثیر صاحب اس جواب دہی کو دیکھیں تو وہ خود اُن دبیز پردوں کو ہٹانے کا کام کریں گے جو انہوں نے دانستہ یا نادانستہ شمیم کی شخصیت پر ڈال رکھے ہیں۔ یہ زمانہ شمیم کی طبیعت کی جولانیوں کا زمانہ تھا۔ انہوں نے قادیانی مرزائیت کے پوسٹ مارٹم کے لئے زورِ قلم اور زورِ بیان کا پورا پورا استعمال کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا — شمیم صاحب کو مرزائیت سے خارج کر دیا گیا جس کے وہ کبھی ممبر نہیں رہے تھے۔

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

میں شمیم کو بہت نزدیک سے جانتا تھا ، وہ مرزائی ماحول میں ضرور پیدا ہوئے اور وہیں
پلے بڑھے بھی ، لیکن وہ بچپن سے مچل رہے تھے ۔ انکی طبیعت بے قرار تھی کہ وہ کچھ
دکھائیں ، اور انہوں نے اپنی زوردار اردو نثر کا مظاہرہ اسی اخراج کے موقع پر کیا ۔

ایک غلطی اور تاثیر صاحب نے کی ہے اس مضمون میں ۔ شمیم صاحب کی پانچ
بہنیں بقید حیات ہیں ، ایک شوپیاں میں اور چار سری نگر میں قیام کرتی ہیں ۔ پانچوں
کی پانچ بہنیں اہل سنّت والجماعت مسلمانوں میں بیاہی گئیں اور خود شمیم صاحب کا
رشتہ اہل سنّت والجماعت لوگوں کے ساتھ ہوا اور انکی صاحبزادیوں کے رشتے
بھی وہیں ہو رہے ہیں ۔ تاثیر صاحب نے صرف چار بہنیں لکھی ہیں ۔

البتہ شمیم صاحب نے اپنے مرزائی رشتے داروں کو کبھی مایوس نہیں کیا اور
مرزائی رشتے داروں سے بھی حق نمک ادا کرتے ہوئے انتخابات کے دوران ان کی
بھرپور مدد کی ۔ میں البتہ تینوں الیکشنوں کے مواقع پر دونوں اطراف سے دور دور ہی
رہا ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب انہوں نے مجھ پر سری نگر کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ
دائر کر رکھا تھا ۔ مشہور وکیل جان بھان صاحب ان کو اس مقدمے کے طعنے دے کر
چڑاتے تھے ۔ بھان صاحب دادا جان کے وکیل رہ چکے تھے ۔ شوپیاں میں ان کے
ہمارے خاندان اور شمیم کے خاندان کے ساتھ نہایت دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے ۔ اور
حق تو یہ ہے کہ جسٹس جانکی ناتھ بھٹ اور بھان صاحب کی مشترکہ کوششوں سے
ہی میری جان چھوٹی تھی ، ورنہ شمیم نہ معلوم کب تک دے رگڑا کے مصداق رگڑتے
رہتے ۔ امید ہے یہ مضمون بطور جملہ معترضہ کے شامل اشاعت ہوگا ۔

○

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

اکادمی کی مطبوعات

کے علاوہ

دوسرے ادبی و علمی اداروں کی مطبوعات

خریدنے کے لئے تشریف لائیے

کتاب گھر

o — مولانا آزاد روڈ، سرینگر
o — کنال روڈ۔ جموں

Digitized By e Gangotri and Kashmir Treasure

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر